سسپنس ڈائجسٹ

CPNE — MEMBER APNS

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر
اطہر حسین

نائب مدیرہ
شازیہ حمیر

مارکیٹنگ و
سرکولیشن منیجر
ثمر عباس
0301-2454188

07
انشائیہ
جون ایلیا

انسان کے اندر کی گھٹن پر ایک
صاحبِ نظر کا نوحہ

08
آپ کے خط
مدیر اعلیٰ

سسپنس کی مجلسِ مشاورت و قارئین کی تلخ و
شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

12
کالا طوفان
اے آر راجپوت

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

39
ادھوری توبہ
طیبہ ... ابانوی

اپنے جرائم پر شرمندہ
ایک مجرم کی توبہ

46
جانباز
اسما نادری

ظلم کے خلاف سینہ
سپر نوجوان کی داستان

71
مزدور
عیرق بخاری

مزدور ڈے کے موقع
پر ایک پُر اثر تحریر

جلد 55 • شمارہ 05 مئی 2026 • زرِ سالانہ 3500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 250 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

urdunovels.com

78
برمحل
ملک صفدر حیات
بیوی کی بے وفائی سے نالاں ایک شخص کے جرم کی کہانی

95
برائے فروخت
صائمہ دانش
ایک ہی دن میں تین افراد کی حادثاتی موت کا معما

104
محفلِ شعر و سخن
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

107
بلیدان
محمد عثمان ذوالفقار
ایک دنیا کی کہانی جہاں ہر نئی زندگی ایک زندگی مانگتی تھی

112
جانگلی
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایک ایسے نوجوان کی کہانی جو اپنی صلاحیتوں کو آزمانا جانتا تھا

135
بغاوت
مظہر سلیم ہاشمی
بغاوت کے دوران دوسرے ملک میں پھنس جانے والے دو بزنس مینوں کا احوال

149
پھندا
جاوید بسام
جادوئی پھندے میں پھنسے ایک طالب علم کی کہانی

159
حارث کذاب
ضیا تسنیم بلگرامی
ایک جھوٹے مدعیِ نبوت کے حالات و سوانح

168
تریاق
فرح بخاری
اُلجھے معمے سلجھانے والے ایک پُرعزم نوجوان کی داستان

**
کرنیں
ادارہ
دنیا بھر سے ادھر اُدھر سے لطیفے چٹکلے اقتباسات مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پرنٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

کسی طرح بھی

جون ایلیا

کیوں یہ میری پیٹھ سے لگا کیا سوچ رہا ہے؟ سامنے آ کے بیٹھ...... کہ جی ہی بہلے۔ جانے کیا ہو گیا ہے کہ جی نہیں لگ رہا۔ ہاں بھائی بڑی وحشت ہے، بڑی بیزاری ہے۔ ہم اپنے آپ میں بری طرح آن پھنسے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں گھرے ہونے اور اپنے آپ سے تنگ آ جانے کا آزار بڑا ہی جان لیوا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ اپنی دونوں پسلیاں ایک کر دوں، اپنا ٹینٹوا دبا جاؤں۔ اپنی ذات کے حبس میں سانس لینا تو ایسا ہے جیسے جانکنی میں زندہ رہنا۔ اور آزاری آخر تو کس سوچ میں ہے۔ تو بھی تو کچھ بول ابھی کہ اس طرح آخر کیسے گزرے گی؟ کبھی تو میں بھی سوچتا ہوں، چاہے ہمارے اندر جنت کی ہوائیں ہی کیوں نہ چل رہی ہوں اور ہمارے وجود میں جنت کے چشمے ہی کیوں نہ بہہ رہے ہوتے پھر بھی اپنی ذات کی قید دوزخ سے کم نہ ہوتی جب کہ ہمارا اندرون تو خود سب سے بڑا دوزخ ہے۔ آخر وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے باہر سے بھلا کیا سروکار...... اور یہ بڑے جانے ہوئے اور مانے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ یہ بات جاننے والے کم ہی ہوں گے کہ نفس کی سب سے اچھی حالت کون سی ہے اور سب سے بری حالت کون سی ہے؟ یہ تو کیا بڑبڑانے لگا اور یہ تو نے کن بھڑاسیوں کی بات شروع کر دی جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھلا ہمیں اپنے باہر سے کیا سروکار۔ یہ ذات۔ یہ اپنے اندر ہوتے ہی کب ہیں جو باہر نکلیں۔ کھوکھلے۔ تو ان بے حسوں اور بے حیاؤں کی باتیں کر کے میرا جی نہ جلایا کر۔ خبردار جو اب ان بدروحوں کا نام لیا۔ یہ زندگی کے گورستانوں میں منڈلاتے پھرتے ہیں کہ بدی کی کوئی لاش کھود کے نکالیں اور اسے اپنے اوپر منڈھ کر بستیوں میں آئیں اور روگ پھیلائیں۔ یہ تو نے اچھی کہی کہ یہ لوگ اپنی ذات میں رہتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ بدذاتی...... بے ذات ہوتی ہے۔ ہاں یہ ہے کہ یہ باہر سے بھاگتے ہیں اور لاشوں میں اپنے لیے ٹھکانے ڈھونڈتے ہیں۔ ذات میں رہنا بھی کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ کیا یہ کوئی آزمائش ہے؟ اس سے کڑی آزمائش اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنی پسلیوں میں پھنسا سسک رہا ہو۔ اگر انسانوں میں سے کچھ انسان اس آزمائش میں پڑ گئے ہوں تو کیا انہیں اس پر خوش ہونا چاہیے؟ جب تو یہ کہتا ہے کہ میں اپنی پسلیوں میں پھنسا ہوا ہوں یا اپنی ادھڑی میں گٹھری بنا پڑا ہوں تو کیا اپنے آپ کو یا کسی اور کو کوئی خوش خبری سناتا ہے؟ کیا بہت دم گھٹ رہا ہے؟ بس یہی میرا بھی حال ہے۔ یہ کیسا ہوتا ہے، یہ تو بہت ہی عذاب ناک ہوتا ہے۔ نہ ہونے کا آرام شاید بہت بڑا آرام ہوتا ہوگا۔ ہاں شاید...... اتنا نشہ کہ ہوش ہی نہ رہے۔ خون کے گھونٹ پی اور جی۔ نہیں بھائی نہیں۔ اب زبان اور محاورے کی چاشنی کچھ مزہ نہیں دیتی۔ بس چپکا ہی رہ۔ ہاں تو نے ٹھیک کہا۔ اب تو اپنی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی۔ جب اپنا آپ ہی برا لگنے لگے تو پھر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ بھلا تو اپنے آپ کو کیسا لگتا ہے؟ میں اپنی صورت تک سے بیزار ہوں۔ میں اپنے اس گمان تک سے اکتا چکا ہوں کہ میں ہوں۔ جو نہ ہونے کی طرح ہے وہ آخر ہے بھی کیوں۔ تو نے میرا جی خوش کر دیا۔ اگر جاں کنی، جاں کنی کا جی خوش کر سکتی ہو۔ دمسازی اور غمگساری اسے کہتے ہیں۔ بس یہی کچھ میرا بھی عالم ہے۔ برے مارے گئے۔

باہر کی ہوا اب کیسی ہو گی؟ ویسی ہی ہو گی جیسی تھی۔ جیسی چھوڑ کر ہم اپنے اندر بھاگ آئے تھے۔ بھاگ آئے تھے یا کھدیڑے گئے تھے۔ ہاں یوں کہہ لے، ہوا ایسی ہی تھا۔ پر ایک بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ باہر کی ہوا کا کیا کہنا۔ باہر کی فضا کا بھلا کیا کہنا۔ اندر تو رائیگانی ہی رائیگانی ہے۔ ندامت ہی ندامت ہے۔ ہم جو تھے، ہم میں سے بھلا کون کون رائیگاں گیا ہوگا۔ جنہیں رائیگاں نہ جانا چاہیے تھا، وہی بری طرح رائیگاں گئے ہوں گے اور انہی کو اپنے رائیگاں جانے کا دکھ بھی ہوگا۔ رائیگانی کے ان شہروں میں کیسی کیسی امنگیں پچھتاووں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایک بات ہے۔ کیا بات؟ باہر کی ہوا کی بھی کچھ ایسی کہ ایسا نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ باہر کی گھٹن بھی اندر کی گھٹن سے کچھ کم تو نہ تھی اور یہ کہ فضا میں تعفن تھا اور ہوا میں زہر۔ ہوا کا وہ زہر اور فضا کا وہ تعفن ضمیر کی ہلاکت اور ذہن کی ہزیمت تھا۔ ہم نے حکمت کو ہوس ناکی کے نیچے دیکھا اور دلیل کو دلال۔ قیادت نے قزاقی کا پیشہ اختیار کیا اور قانون نے نقب زنی شعار کی۔ پھر ہو کیا؟ کیا ہم اپنے اندر اسی طرح کراہتے رہیں؟ میں تو کہتا ہوں کہ اندر کی ہلاکت سے باہر کی ہلاکت ہزار گنا بہتر ہے۔ اندر کی زندگی بھی موت ہے اور باہر کی موت بھی زندگی۔ کسی بھی طرح اپنے آپ سے باہر نکلنا چاہیے، کسی بھی طرح۔

قارئین کرام
السلام علیکم!

مئی 2026ء کا شمارہ حاضر خدمت ہے۔ مہنگائی اور قیمتوں کے طوفان نے ان دنوں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر جو گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اس کی زد سے کوئی شعبہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ اشیا خورد و نوش سے لے کر لکھنے پڑھنے اور اوڑھنے بچھونے تک کا سامان اپنی قیمتوں کی نئی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ اسی طوفان کا مقابلہ کرنے کی حتی المقدور کوشش کی جا رہی ہے کہ کسی طرح بھی آپ کے محبوب سسپنس ڈائجسٹ کی اشاعت میں رکاوٹ نہ آنے دی جائے مگر کاغذ اور دیگر سامانِ طباعت کی قیمتوں میں اضافے بلکہ ہوشربا اضافے کی وجہ سے ہمیں انتہائی سوچ بچار کے بعد پچاس روپے قیمت میں اضافے کا کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑا ہے۔ آپ لوگ دعا کریں کہ کاغذ کی قیمتوں میں استحکام آ جائے تو صفحات کی کمی کو بھی پورا کیا جائے اور سسپنس کے دیوانوں کو پڑھنے کے لیے پورا مواد دیا جائے۔ یقین ہے کہ ہماری کوشش اور آپ کی دعائیں رنگ لائیں گی۔

اس مختصری بات کے بعد چلتے ہیں اپنی محفل کی طرف۔

● دانیال حسن چغتائی کا کہروڑ پکا ضلع لودھراں سے تفصیلی تبصرہ۔ ”اپریل کا شمارہ بروقت مل گیا۔ امید ہے کہ تمام پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے۔ رمضان المبارک کی مصروفیات کی وجہ سے چاہتے ہوئے بھی مارچ کے شمارے پر تبصرہ نہیں بھیج سکا۔ سرورق پر موجود خاتون خیالات میں گم نظر آئی لیکن اس طرح کا سرورق سسپنس میں پہلے کبھی دیکھا نہیں گیا۔ یہ شاید نئی روایت قائم کی گئی ہے۔ خطوط کی دنیا میں بھی خطوط بہت عمدہ رہے اور فروری کے شمارے پر میرے تبصرے کو جن دوستوں نے پسند کیا ان تمام کا بہت شکریہ۔ اس بار کے خطوط میں عون احمد، سیما شاہ، محی الدین اشفاق، بشرا امیر، روبینہ شاہین اور ملک وحید کے خطوط بہت عمدہ رہے۔ جون ایلیا کے انشایے میں انسان کی فطرت اور اس کے رویوں پر طنز کیا گیا ہے۔ اپریل کے شمارے میں شامل پہلی کہانی اے آر راجپوت کی کالا طوفان دلچسپ تاریخی ناول ہے جس میں پہلی جنگ عظیم کے پس منظر میں قیدیوں کی نفسیاتی حالت، بھوک، تکلیف، فرار کے منصوبوں، ناکامیوں اور کامیابیوں کو بڑی حقیقت پسندی سے بیان کیا گیا ہے۔ قسط وار کا پڑھ کر بہت برا سنسنی خیز، عبرت انگیز اور جذباتی کہانی جو جنگ کی بیہودگی اور انسانی حوصلے دونوں پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ قسط وار کا پڑھ کر بہت برا لگا لیکن انتظار رہے گا۔ صدوق بخاری کی تحریر ترتیب انسانی نفسیات، حسد اور مشاہدے کی قوت پر مبنی دلچسپ اور سبق آموز کہانی ہے۔ مصنف نے بہت مہارت سے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح برسوں کا اعتماد پل بھر میں حسد کی بھینٹ چڑھ سکتا ہے اور کس طرح چھوٹی سی لغزش کسی کی زندگی بچانے یا اجاڑنے کا سبب بنتی ہے۔ کہانی اسٹیفن کے گمشدہ خاندانی بریسلیٹ کے گرد گھومتی ہے۔ اسٹیفن کا کردار روایتی اصول پسند مالک کا ہے، جبکہ ہنری کی معصومیت اور روشن کی چھپی ہوئی منافقت کہانی میں تضاد کی علامت ہے۔ روشن، جو پرانا اور با اعتماد ملازم تھا، نئے آنے والے ہنری کی قابلیت اور بڑھتی ہوئی مقبولیت سے جلس ہو کر اسے چوری کے الزام میں پھنسانے کی سازش کرتا ہے۔ سچائی تک پہنچنے کے لیے جذبات نہیں بلکہ ٹھوس منطق کی ضرورت ہوتی ہے۔ حسد انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور وہ دوسروں کا گھر برباد کرنے کی کوشش میں اپنا وقار اور روزگار دونوں کھو دیتا ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں توازن اور ترتیب ہی سچائی کو واضح کرتی ہے۔ نازیہ کامران کاشف کا ناول رہ رشاس 14 مہینوں تک چلنے کے بعد آخر کار اختتام کو پہنچا اور ساتھ ہی کتابی شکل میں بھی سامنے آیا جس پر مصنفہ کو بہت بہت مبارک باد۔ تاریخ، تصوف اور مافوق الفطرت قوتوں کے درمیان چھپی ازلی جنگ جو ہندوستان سے مصر تک پھیلی ہوئی تھی قارئین کو اپنے سحر کا شکار کرتی رہی۔ مصنفہ نے جس مہارت سے محکس العارف کے نادر نسخے اور عبرت ناک انجام کو قلمبند کیا، وہ سحر زدہ کر دیتا ہے۔ عیار کے ذریعے حق کی فتح کا پیغام اور نیکی کے پہرے داروں کی ذمے داری کا احساس اس تحریر کو یادگار بنا تا ہے۔ بظاہر یہ ناول خوفناک لگ رہا تھا لیکن اختتام پر ایمان کی پختگی کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔ عمران قریشی کی تحریر دہ پردہ انسانی ضرورت، لالچ، ذہانت اور قسمت کے پیچیدہ کھیلوں پر مبنی ہے۔ عام انسان کے حالات سے مجبور ہو کر شطرنج کی بساط بچھانے کی داستان جس میں ہیرو اپنے بدتر حالات کو بدلنے کے لیے جرائم پیشہ افراد کو مہرے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ مرکزی کردار کا اپنے ہی گھر میں ڈاکا ڈلوانے کے منصوبے کو بنانا اور پھر اسے پولیس کے ساتھ مل کر اپنے حق میں موڑنا غیر متوقع موڑ لاتا ہے۔ کس طرح مجبور شخص اخلاقی حدود کے قریب جا کر بھی اپنی ذہانت سے خود کو بچاتا ہے اور اپنا مقصد جو کہ شادی اور منیجر کی پوسٹ کو حاصل کر لیتا ہے۔ اختتام ہیپی اینڈنگ ہے جو اطمینان بخش ہے کہ آخر کار حقدار کو اس کا حق مل گیا۔ مرزا امجد بیگ کی کہانی خوا تلواد زبردست قانونی تھرلر ہے جس میں معصوم شخص کو جھوٹے الزام میں پھنسانے کی سازش، انسانی ہمدردی، اور انصاف کی فتح کو خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ برابری کا بوجھ عثمان ذوالفقار کا ترجمہ کرٹ وونیگٹ کی شہرہ آفاق کہانی ہیریسن برجرون کے مساوات کے ہولناک اور مصنوعی تصور پر قائم کی گئی۔ جب ریاست انفرادیت، ذہانت اور حسن کو جبری طور پر کچل کر سب کو ایک ہی سطح پر لانے کی کوشش کرتی ہے تو معاشرہ کس طرح بے حس کباڑ خانہ بن جاتا ہے۔ ہیریسن کی بغاوت

جاتی نہیں بلکہ انسانی فطرت کے اس جمالیاتی اظہار کی بحالی ہے جسے محتسبِ اعلیٰ نے زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ برابری جو کمال کو چھین کر حاصل کی جائے وہ ایسی معذوری ہے جو معاشرے کو ذہنی اور روحانی طور پر مفلوج کر دیتی ہے۔ محفلِ شعر و سخن میں تمام ہی اشعار کا انتخاب بہت عمدہ رہا اور بہت زبردست محفل نظر آئی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا ناول جنگ باز طویل عرصے تک چلنے کے بعد آخر کار مکمل ہوا۔ اس کا اختتامیہ اس حقیقت پر مہر ثبت کرتا ہے کہ جب سادہ لوح انسان حالات کے جبر اور اپنوں کی بے وفائی سے ٹکراتا ہے تو ایسا باغی کر جنم لیتا ہے جو شاطر کھلاڑیوں کو ان کی اپنی چالوں میں الجھا دیتا ہے۔ معصومیت کے زوال اور خود اعتمادی کے عروج کی یہ پُراثر داستان اختتام کو پہنچی۔ ماہ وش طالب کی تحریر کھیل کھیل میں مکافاتِ عمل اور ماورائی احساس کی لرزہ خیز داستان ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار آسکر جو حسن پرستی اور لڑکیوں کے جذبات سے کھیلنے کا عادی ہے، نخلستان کے سحر میں گرفتار ہوتا ہے جو سراب ثابت ہوتی ہے۔ مصنفہ نے ریگستان کے قدیم قلعے اور سرد موسم کے پس منظر میں تجسس کو بہترین طریقے سے برقرار رکھا ہے۔ انجام کار، قبر کے کتبے پر نخلستان کی تصویر اور تاریخ پیدائش دیکھ کر آسکر کا غرور خاک میں مل جاتا ہے۔ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنے والوں کو قدرت بھی ایسے غیبی جھٹکے دیتی ہے کہ ان کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ عیاش طبعی کے زوال اور عبرت کی پُراثر عکاسی ہے۔ جاوید بسام کی تحریر منصوبہ ساز نفسیاتی تجسس اور خوف سے بھرپور ہے۔ کہانی کا آغاز عام سے مسافر کی ڈائری سے ہوتا ہے جو برلن کے سستے گیسٹ ہاؤس میں پناہ گزین ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ لرزہ خیز انکشاف ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی انسان نہیں بلکہ تاریخ کا بدنام زمانہ ہیریل گلر جیک دی ریپر ہے۔ مرکزی کردار کی صفائی پسندی، اوزاروں سے لگاؤ، خواتین کے بارے میں مخصوص اور خوفناک نظریات، اور معاشرے میں ان دیکھا رہنے کی خواہش اسے ایک نہایت پیچیدہ ولن بناتی ہے۔ یہ کہانی مجرم کے دماغ کے اندر جھانکنے کی کوشش ہے جہاں وہ اپنے گھناؤنے عمل کو مقدس مشن یا اعلیٰ فن سمجھتا ہے۔ انجام پر تاریخ کی مہر رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے، کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں سے وائٹ چیپل کے خونی باب کا آغاز ہوتا ہے۔ صائمہ دانش کا افسانہ سفید چھتری انسانی نفسیات، ماضی کے خوف اور غلط فہمی کے المناک انجام کی لرزہ خیز داستان ہے۔ حسین تاریک ماضی سے بھاگ کر باعزت زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مسلسل انجانے خوف کا شکار ہے۔ نفسیاتی دباؤ اور اپنے خاندان کے تحفظ کی فکر میں وہ پیچھا کرنے والے شخص کو دشمن سمجھ کر گولی مار دیتی ہے مگر انجام انتہائی دردناک ہے۔ خوف انسان سے ہوش و حواس چھین لیتا ہے اور بعض اوقات ماضی سے فرار کی کوشش میں انسان وہ گناہ کر بیٹھتا ہے جس کا مداوا ناممکن ہوتا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی تاریخی مضمون نویسی کے حوالے سے بہت اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کا مضمون میرزا یحییٰ صبح ازل بابی اور بہائی تحریک کے آغاز، اندرونی خلفشار اور اقتدار کی کشمکش کی تاریخی دستاویز رہی۔ علی محمد باب کے بعد اس کے پندرہ سالہ جانشین صبح ازل اور اس کے بڑے بھائی میرزا حسین علی کے درمیان پیدا ہونے والے حسد، سازشوں اور دشمنی کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ کس طرح مذہب کے نام پر شروع ہونے والی تحریک ذاتی مفادات اور خاندانی جنگ کی نذر ہو گئی۔ فرقہ واریت اور مذہبی پیشوائیت کے سیاسی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے بہترین تحریر رہی۔ تریاق فرح بخاری کی دلچسپ اور پُراسرار افسانوی کہانی جس میں رومانوی، معاشرتی اور جرم کی دنیا کو آپس میں گوندھ کر پیش کیا گیا۔ کہانی کا مرکزی کردار اسجد علی پرائیویٹ سراغ رساں جو اپنے والد کے قتل کے معمے کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ منشیات فروش ریکٹ کی تحقیقات بھی کر رہا ہے۔ اسجد کسی لڑکی کی طرف ملتفت ہے اور حقیقت سامنے آنے پر اسے دھچکا لگتا ہے۔ کہانی کا دوسرا سرا پشاور کے کالج میں منشیات کی فروخت کے دھندے کو بے نقاب کرتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ قسط میں منشیات ریکٹ کا مکمل خاتمہ، اسجد کی ذاتی زندگی کا فیصلہ، سرمئی آنکھوں والی لڑکی کی کہانی سامنے آئے گی۔ اپریل کے شمارے پر تبصرہ مکمل ہوا۔ زندگی باقی ملاقات باقی۔ ان شاء اللہ مئی کے شمارے کے ساتھ پھر اسی بزم میں ملاقات ہوگی۔“

✻ سید محی الدین اشفاق، فتح پور لیہ سے لکھتے ہیں۔ ”مسلسل بارشوں کے بعد ٹھنڈک بڑھ گئی ہے اور ہمارے علاقے میں تیزی سے آنے والی گرمی کو گویا بریک لگ گئی ہے۔ خط لکھ رہا ہوں تو اس وقت بھی آسمان پر گہرے سرمئی پانی سے بھرے بادل چھائے ہیں یہ موسم اچھا تو لگ رہا ہے لیکن ان بارشوں اور اس موسم کا فصلوں پر برا اثر نہ پڑے یہ دعا ہے کیونکہ ہمارا رزق اور کسان کی سال بھر کی محنت کی کمائی کھیتوں میں پڑی ہے۔ خطوط کی محفل میں ملیر کراچی والے عون احمد کرسیِ صدارت پر براجمان نظر آئے۔ بھئی مبارک ہو۔ شاندار تبصرہ لکھا ہے۔ سیتا شاہ نے مصروفیت میں حاضری دی گڈ۔ روبینہ شعر نے خوبصورت اور پُرمنفرد تبصرہ بھجوایا۔ قیدی بشرا امیر کی والدہ صاحبہ کے انتقال کا پڑھ کر دلی دکھ ہوا۔ ماں ایک عظیم ہستی اور گھنی چھاؤں ہے۔ اس چھاؤں سے محروم ہونا اور اکیلے زمانے کی کڑی دھوپ میں آ جانا بہت کربناک ہے۔ جانتا ہوں اس وقت بشرا امیر کی دلی کیفیت کیا ہوگی۔ میں خود اس رشتے سے محروم ہو چکا ہوں اس لیے ماں سے ابدی جدائی کا غم خوب سمجھ رہا ہوں۔ خدا ان کی والدہ صاحبہ کو جنت میں جگہ اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے، آمین۔ سیدہ روبینہ شاہین روبی اور ملک وحید کی حاضری بھی خوب رہی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے عمران قریشی کی ”در پردہ“ پڑھی۔ مزیدار تحریر تھی۔ کیشیئر کو گھر کرائے پر دینا کافی فائدہ دے گیا۔ محبوق بخاری کی ”تربیت“ ایک شخص کی ذہانت بتاتی تحریر تھی۔ شیلے نے بڑی سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف ہنری کی جان بخشی کروائی، ساتھ ہی اصل مجرم کو بھی پکڑوا دیا۔ ماہ وش طالب کی ”کھیل کھیل میں“ بھی عمدہ کہانی تھی۔ فرح بخاری نے ”تریاق“ کا آغاز بڑا زوردار اور فلمی سا کیا ہے، امید ہے آگے بھی ایسا انداز رہے گا۔ اشعار بھی اچھے ہیں۔ حسبِ روایت رسالے کا مطالعہ زبردست رہا۔ اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کو خوشیاں عطا کرے دعا اور امید

ہے کہ ایران میں ہونے والی خون ریزی رک جائے گی۔ امتِ مسلمہ کے لیے دعا گو۔"

❀ سیدہ روبینہ شاہین روبی کی دعا تحصیل ساڈھ، پنجاب سے۔ "ایران پر اسرائیل و امریکا کی بربریت اور او آئی سی، اقوام متحدہ کی بے حسی و بے بسی پر کڑھتے ہوئے ٹی وی اسکرین دیکھنا بڑا اذیت ناک لگ رہا ہے۔ دعا ہے خدا جلد اس قتل و غارت کے سلسلے کو ختم کروائے۔ آمین۔ جنگیں مہنگائی و بدحالی لے کر آتی ہیں۔ خدا ہمیں ان سے محفوظ رکھے۔ عون احمد کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ بڑے اچھے الفاظ لکھ کر انہوں نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ بینا شاہ نے خط لکھنے کے لیے مصروفیت میں سے وقت نکالا گڈ...... یہی تو مطالعے کا تقاضا ہے۔ سید محی الدین اشفاق کی موسم بہار جیسی خوب صورت دعا پر صدقِ دل سے آمین۔ ہماری ہم نام روشنیوں کے شہر والی روبینہ شعر اپنے خوب صورت انداز میں موجود تھیں۔ قیدی مبشر امیر کے غم پر دل دکھی ہو گیا۔ ماں کا چلے جانا عظیم سانحہ ہے اس ہستی کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ اللہ پاک ان کی امی جان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور گھر والوں کو صبر دے آمین۔ ملک وحید صاحب کی حاضری "روایتی" انداز میں تھی۔ فرح بخاری "تریاق" لے کر "دیس پردیس" کی جگہ پر آئی ہیں۔ امید ہے ویسی ہی دلچسپی اور روانی پڑھنے کو ملے گی۔ ماہ وش طالب کی "تکمیل کھیل میں" اچھی تحریر تھی۔ عمران قریشی کی "در پردہ" مجرم پکڑے گئے اور ہیرو کی شادی بھی طے ہو گئی، بہت خوب۔ صائمہ دانش کی "سفید چھڑی" بھی پسند آئی۔ جاذبہ غزل نے گھوگی سے اچھا شعر بھجوایا۔ تبسم ناز روہڑی والی کا شعر بھی بہت خوب تھا۔ یاد رکھیں رزق اور خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں تو پھر یہ دونوں چیزیں خوب بانٹیں اور جواب میں کئی گنا زیادہ وصول کریں۔ سب کی خوشیوں کے لیے دعا گو۔"

❀ قیدی مبشر امیر پشاور سینٹرل جیل سے لکھتے ہیں۔ "ہمارے ہاں سردیاں جاتے جاتے پھر سے واپس آرہی ہیں شاید سردیوں کا جانے کا دل بھی نہیں کر رہا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارا بھی دل نہیں کرتا کہ سردیاں جائیں اور پسینے اور حبس والی گرمیاں واپس آئیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اللہ کے قانون میں یہ فطری چیزیں لکھی جا چکی ہیں کیونکہ سردی اور گرمی دونوں ہی ہمارے لیے اپنے اپنے فائدے لے کر آتی ہیں۔ سب سے پہلے تو اپریل کے شمارے کے بارے میں بتادوں کہ ہمیں بہت دیر سے ملا ہے لیکن ٹائٹل فوٹو کو دیکھ کر وہ تمام دیری بھول گئے۔ ماشاءاللہ بھورے رنگ کی آنکھوں والی حسینہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ خوب صورت فوٹو بنایا گیا ہے۔ 2026ء کے موجودہ حالات ایک بار پھر مشرق وسطیٰ میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ ایران، اسرائیل اور امریکا کے درمیان تناؤ نے پورے خطے کو غیر یقینی صورت حال سے دوچار کر دیا ہے۔ حالیہ بیانات، فوجی نقل و حرکت اور سفارتی کشمکش اس بات کا اشارہ دے رہے ہیں کہ صورت حال کسی بھی وقت مزید سنگین رخ اختیار کر سکتی ہے۔ ایران اپنی خودمختاری اور دفاع کے حق پر قائم نظر آتا ہے، جبکہ امریکا اور اس کے اتحادی خطے میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے سرگرم ہیں۔ دوسری جانب اسرائیل کی پالیسی بھی جارحانہ حکمت عملی کی عکاسی کرتی ہے، جس کے باعث کشیدگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان حالات میں چھوٹے اور درمیانے درجے کے ممالک کے لیے اپنی پوزیشن کو متوازن رکھنا ایک بڑا چیلنج بن چکا ہے۔ پھر اس جنگ کے تناظر میں پوری دنیا میں انرجی کا ایک بہت بڑا بحران آیا ہے اور ظاہری بات ہے پاکستان بھی خلیجی ممالک سے اپنی توانائی کی زیادہ تر ضرورتیں پوری کرتا ہے تو پاکستان بھی اس سے متاثر ضرور ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں بے انتہا قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے لیکن کسی حد تک ہمیں یہ بھی شکر ادا کرنا چاہیے کہ کم سے کم ہمیں پیٹرولیم مصنوعات میسر تو ہیں۔ کئی ممالک میں تو پیٹرول پمپس پر پولیس تعینات ہے اور پچھلے دنوں تو اخبار میں ایک خبر آئی تھی کہ سری لنکا میں ایک شخص کو چار لیٹر پیٹرول ذخیرہ کرنے پر 21 دن سزا اور 15 ہزار سری لنکن کرنسی جرمانہ بھی ہوا ہے۔ خیر اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تمام مسلم امت پہ اپنی کرم نوازی فرمائے اور تمام مسلمانوں کو کافروں کے مقابلے میں فتح نصیب عطا فرمائے آمین۔ اب شمارے کی طرف آتا ہوں تو سب سے پہلے جون ایلیا صاحب کی تحریر پہ تھوڑا سا تبصرہ کر دوں کہ اس تحریر میں موجودہ معاشرے کی ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جہاں انسان مادی فائدوں کی دوڑ میں رشتوں، احساسات اور اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر رہا ہے۔ خود غرضی اور بے حسی کی وجہ سے لوگوں کے درمیان فاصلے بڑھ رہے ہیں اور اعتماد کمزور ہوا ہے، جس سے بے سکونی اور مسائل جنم لے رہے ہیں۔ انسانی زندگی کی اصل خوبصورتی اچھے کردار، دیانت داری، ہمدردی اور دوسروں کے ساتھ بہتر رویے میں بیان کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر ایک ایسی فضا دکھائی گئی ہے جہاں فرد کی اصلاح اور مثبت رویوں کے ذریعے ہی معاشرے میں بہتری ممکن ہے۔ اس کے بعد خطوط کی محفل میں سب سے پہلے عون احمد ملیر کراچی سے محفل میں شامل ہوئے۔ سب سے پہلے تو انہیں بے حد مبارک باد کہ انہیں صدارت نصیب ہوئی اور صدارت نصیب ہونی بھی چاہیے تھی کیونکہ ان کا تبصرہ شاندار ہے۔ اس کے بعد بینا شاہ ڈیرہ غازی خان سے شاملِ محفل ہوئیں ان کا تبصرہ بھی بے حد اچھا تھا۔ اس کے بعد سید محی الدین اشفاق فتح پور لیہ سے محفل میں شامل ہوئے۔ میرے بارے میں تبصرہ کرنے پر آپ کا بے حد شکریہ۔ یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ میرے جیسے قیدی کے لیے بھی نیک خواہشات رکھتے ہیں۔ روبینہ شعر صاحبہ کراچی سے محفل میں شامل ہوئیں، ان کا تبصرہ بھی اچھا تھا پھر اپنا تبصرہ بھی پڑھا تھوڑی سی ایڈیٹنگ تو کی گئی ہے لیکن پھر بھی شکریہ اور میری والدہ کے لیے ایڈیٹر صاحب کی دعا پر آمین۔ اس کے بعد سیدہ روبینہ شاہین روبی صاحبہ جنوبی پنجاب سے محفل میں شامل ہوئیں میرے بارے میں بھی تبصرہ کرنے پر آپ کا بے حد شکریہ۔ ملک وحید صاحب کا شکر نامہ بھی پڑھا اس کے بعد ان قارئین کے نام بھی پڑھے جن کے محبت نامے سسپنس کی محفل میں شامل نہ ہو سکے۔ اے آر راجپوت صاحب کی کالا طوفان تاریخ کے تناظر میں اچھی تحریر تھی۔ اس کے بعد نازیہ کامران

کاشف صاحب کی رمز شناس پڑھی۔ مزیدار تحریر کا اختتام بھی مزیدار تھا اور کیا ہی خوب اختتام کیا ہے۔ پھر اس کے بعد دریچہ عمران قریشی صاحب کی پڑھی۔ یہ بھی خوب کہانی تھی۔ جنگ باز پڑھی اچھی کہانی تھی لیکن اس کا اختتام بہت ہی مختصر کر دیا گیا۔ اس کے بعد تریاق نئی کہانی پڑھی۔ شروعات تو اچھی ہیں، امید کرتا ہوں آگے بھی اسی طرح اچھی تحریر پڑھنے کو ملے گی۔ مرزا ایمنی کے حوالے سے تحریر بھی ضیا تسنیم بلگرامی کی اچھی تھی۔ سفید چھتری صائمہ دانش کے قلم سے لکھی گئی تحریر بھی اچھی تھی۔ امید کرتا ہوں اچھی اچھی کہانیوں کا سلسلہ اسی طرح جاری اور ساری رہے گا۔ آپ سب پڑھنے والوں کے لیے بھی دعا ہے کہ اللہ آپ سب کے لیے آسانیاں پیدا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور تمام امتِ مسلمہ کی اور خصوصاً بالخصوص پاکستان کی حفاظت فرمائے اور کافروں کے مقابلے میں فتح یابی عطا فرمائے آمین اور ہم سب قیدیوں کے لیے بھی دعائے خیر ضرور کیا کیجیے گا۔"

☸ عون احمد طیر کراچی سے خط لکھ رہے ہیں۔ "ماہ اپریل کا سسپنس کا شمارہ وقت پر ہمارے ہاتھوں میں آیا۔ گویا عید سے پہلے عید کا لطف آ گیا۔ سرورق پر بھی چاند کے ساتھ عید مبارک کے الفاظ جگمگا رہے تھے لیکن سرورق پر موجود حسینہ عید کی مناسبت سے نہ تھی۔ اپنی بھاری بھرکم جسامت اور لہریے دار زلفوں کے ساتھ پشتو فلموں کی ہیروئن سے زیادہ مل رہی تھی۔ خیر ہم بھی اب عید کے بعد سسپنس کے منتظمین اور قارئین دونوں کو عید مبارک کہتے ہیں۔ فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھے۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب ہمیشہ سچ کی بات کہتے نظر آتے ہیں۔ اس مرتبہ بھی راکھ یادداشت، کے نام سے سجا انشائیہ خاصے کی چیز تھا جو کہ غور طلب سوال چھوڑ گیا کہ 'آخر انسانیت کس طرح بچائی جائے؟' آگے بڑھے، خطوط کی محفل میں پہنچے تو یہ دیکھ کر خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا کہ ہمیں مدیر صاحب نے کرسیٔ صدارت کا اعزاز عطا فرمایا ہوا ہے۔ خوشی پر قابو پاتے ہوئے اداریہ پڑھا جو کہ ملکی و غیر ملکی حالات کے حوالے سے پُرتشویش تھا۔ واقعی جنگ بہت بری چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو اور پوری دنیا کو جنگ کے خطرناک سائے سے محفوظ رکھے۔ خطوط کی طرف بڑھے تو گویا ہر نگینہ اپنی مثال آپ تھا۔ سیتا شاہ کا تبصرہ خوب تھا۔ محی الدین اشفاق، روبینہ اشعر، روبینہ شاہین روبی، سب کی حاضری پابندی کے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن قیدی مبشر امیر سینٹرل جیل سے جو خط لکھتے ہیں، اس حوالے سے ان کی کوشش ناقابلِ بیان ہے اور اس مرتبہ تو انہوں نے واقعی افسردہ کر دیا، اپنی والدہ کی رحلت کی خبر سنا کر۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے، آمین اور مبشر صاحب اور ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ کہانیوں کی طرف آئے تو جنگ باز کی آخری قسط دیکھ کر جھٹکا لگا۔ اب سہراب کے کارنامے کہاں پڑھنے کو ملیں گے؟ اتنے عرصے تک کہانی کے کرداروں سے جو وابستگی ہوتی ہے وہ اختتام پر آ کر افسردہ کر دیتی ہے لیکن خیر یہی زندگی ہے۔ آخری قسط انڈیا کی حدود میں سمٹ گئی۔ سلیم چھالیہ کے دنیا سے جانے پر افسوس ہوا، لیکن سہراب نے اپنا مشن پورا کر کے دم لیا اور یو میورگا کے مجسمے کو حکومت کے حوالے کر دیا۔ اے آر راجپوت ابتدائی صفحات کے لیے کالا طوفان نامی کہانی لے کر آئے ہیں۔ جو حالیہ جنگ کے تناظر میں بروقت ہے، دیکھیے کیا رنگ جماتی ہے۔ آخری صفحات پر فرح بخاری موجود ہیں۔ تریاق کے ساتھ پہلی قسط تو بہتر رہی۔ امجد اور خرم مل کر نفسیات کا ریکٹ ختم کر پاتے ہیں، یہ تو آگے چل کر ہی پتا چلے گا۔ ابھی تو کہانی سمجھنے سمجھانے کے مراحل میں ہے۔ آگے بڑھے تو مزید تم رمز شناس کی آخری قسط کی صورت میں ہم پڑھ کر بس دیکھتے رہ گئے۔ ایک بہترین کہانی کا اختتام ہوا۔ بدی کو بھرپور شکست ہوئی۔ ہر طرف نیکی کا رنگ چھا گیا۔ نازیہ نے آخر میں بہت اچھا پیغام چھوڑا۔ واقعی ہمارے پاس قرآن کی ایسی طاقت ہے جس سے ہر برائی کو شکست دی جا سکتی ہے۔ بس استقامت شرط ہے۔ خواہ مخواہ، میں بیگ صاحب نے ناکردہ جرم میں پھنسائے گئے موکل کو اپنی زیرک نگاہی اور دلائل کی مدد سے صاف بچا لیا اور ایک مرتبہ پھر اپنی مہارت ثابت کر دی۔ بیگ صاحب جیسے وکیل کاش اس دور میں بھی موجود ہوں تا کہ بے گناہوں کی دادرسی ہو جائے۔ چھوٹی کہانیوں میں منصوبہ ساز، جاوید بسام نے خوب لکھی۔ خواتین کے قتل کے لیے منصوبہ بناتے سیریل کلر کی کہانی۔ کاش وہ اپنی ذہانت کو کسی مثبت کام میں استعمال کرتا۔ لیکن انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو کون جان سکتا ہے۔ اس طرح کے لوگ ذہنی طور پر اتنے منتشر ہوتے ہیں کہ انہیں اچھائی، برائی، جرم و سزا کے حوالے سے کوئی خوف نہیں ہوتا۔ عروج بخاری کی کہانی ترتیب بھی اچھی تھی۔ روسٹن نے ہنری کو نکلوانے کی کوشش کی لیکن شیلے نے اپنی ذہانت سے چور کا پتا لگا لیا اور پھر روسٹن کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ عثمان ذوالفقار کی لکھی گئی کہانی برابری کا بوجھ، مستقبل کی منظر نگاری کر رہی تھی۔ شاید 2081 تک انسانی جذبات و احساسات اسی طرح ہو جائیں جیسا کہ مصنف نے بیان کیا۔ ایم یعقوب ازل، بھی اختتام پذیر ہوئی۔ اشعار کا بہترین انتخاب آپ کے رسالے سے وابستگی کا ثبوت ہے۔ کترنیں ہمیشہ کی طرح لاجواب تھیں۔ ہر ماہ بروقت رسالے کی اشاعت یہ ظاہر کرتی ہے کہ رسالے سے وابستہ لوگ اپنا کام بڑی محنت اور ایمانداری سے انجام دیتے ہیں۔ باقی آئندہ آنے والے رسالے پر تبصرے کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوں گے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

امتیاز احمد منڈی بہاؤالدین۔ احسان اللہ بھکر۔ جاوید اقبال، لیہ۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ حمیرا اقبال، کوٹری۔ ریاض احمد، جہلم۔ پرویز محمود، گجرات۔ مہتاب احمد، حیدرآباد۔ سید خورشید احمد، راجن پور۔ رضا علی، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد حسین، کراچی۔

کالا طوفان

اے آر راجپوت

دوسرا حصہ

جنگیں جو اپنے ساتھ صرف تباہی لاتی ہیں... اور جسے اپنے اثرات کے اعتبار سے بربریت کا نشان سمجھا جاتا ہے... زیادہ تر تاریخی جنگیں خودغرضی سے شروع ہوکر انسانی جانوں کے زیاں اور بربادی پر منتج ہوئیں... اور افسوس کہ جنگی جنونیوں نے ہر دور میں اس دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا... جنگِ عظیم اول اس کی جیتی جاگتی مثال ہے... جو ایک شہزادے کے قتل سے شروع ہوئی اور پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آخرکار کروڑوں انسانوں کی بھینٹ لے کر اختتام پذیر ہوئی۔ اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور کن طاقتوں نے اس سے فائدہ اٹھایا؟ یہ دنیا کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات؛

اس مشکل وقت پر بحریہ کا وہی افسر جس نے نقد رقم سے ان کی مدد کی تھی اور جس کا نام ایوروف تھا، ایک بار پھر ان کے کام آیا۔ اس نے یانی سے وعدہ کیا کہ وہ جو مزید رقم مانگ رہا ہے، اسے ادا کر دی جائے گی مگر اس وقت جب وہ لوگ مصر پہنچ جائیں گے اور قاہرہ ریڈیو سے ایک کوڈ پیغام اپنے خیریت سے پہنچنے کا نشر کریں گے۔ آخر بڑی مشکل سے یانی اس تجویز پر آمادہ ہوا اور فیرن کے خیال کے مطابق غالباً اس لیے کہ اسے ایوروف جیسے آدمی کی دشمنی مول لینا پسند نہ تھی۔

حالات بھی کیسی غیر متوقع صورت حال اختیار کرتے رہتے تھے۔ صبح کو یہ بات طے ہوئی اور شام کو پینڈوریلی بڑا گھبرایا ہوا سا آیا اور اس نے بتایا کہ لیفٹرس اور ایک دوسرے یونانی کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی جو پہلا خیال ان کے اذہان میں آیا، وہ یہی تھا کہ لیفٹرس موٹر بوٹ کے لیے بلیک مارکیٹ سے ڈیزل آئل خرید خرید کر بوٹ پر پہنچا رہا تھا اس لیے اسے گرفتار کر لیا گیا مگر یہ شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بعد میں مصدقہ اطلاع ملی کہ اسے محض شراب نوشی کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ مگر کچھ دیر کے لیے تو بالکل ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی تمام جدوجہد رائگاں گئی۔

اگلے دن لیفٹرس ایک بوبی (پولیس مین) کے ساتھ ملنے آیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ اسے پولیس نے گرفتار ضرور کیا تھا مگر شراب پینے کے الزام میں پکڑا تھا لیکن جیسے ہی اس نے پولیس والوں کو یہ بتایا کہ وہ چند برطانوی افسروں کو فرار ہونے میں مدد دے رہا ہے، اسے فوراً رہا کر دیا گیا بلکہ وہ اس سے اس بات پر ناراض بھی ہوئے کہ اس نے یہ بات کیوں نہ بتائی۔ جو پولیس افسر بعد میں ان سے ملنے آیا، بڑی گرمجوشی سے ملا۔ اس نے کھانے پینے کی کچھ اشیا تحفے میں دیں۔ اتنا ہی نہیں، اس نے اپنا ریوالور بھی فیرن کو دیا تاکہ اسے پاس رکھے، شاید اس کی بھی ضرورت پیش آ جائے۔ وہ مخلص شخص اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ جب وہ لوگ موٹر بوٹ پر روانہ ہونے لگیں گے تو وہ اور اس کے ساتھی ساحل کی نگرانی کے لیے موجود رہیں گے تاکہ کوئی ان کی روانگی میں حارج نہ ہو سکے۔ فیرن حالات کی اس خوشگوار تبدیلی پر بہت خوش تھا اور اس کے ساتھی بھی۔ خاص طور پر پولیس کے تعاون نے اب یہ بات یقینی بنا دی تھی کہ موٹر بوٹ کا مالک اب ان کے ساتھ اور شرارت نہیں کر سکے گا۔

مقررہ دن کرفیو لگنے کے بعد (وہاں رات کے وقت کرفیو نافذ کر دیا جاتا تھا) گیارہ بجے یہ لوگ ایک ایک، دو دو کر کے ساحل پر پہنچنے لگے۔ انہیں بہت خاموشی سے چلنے

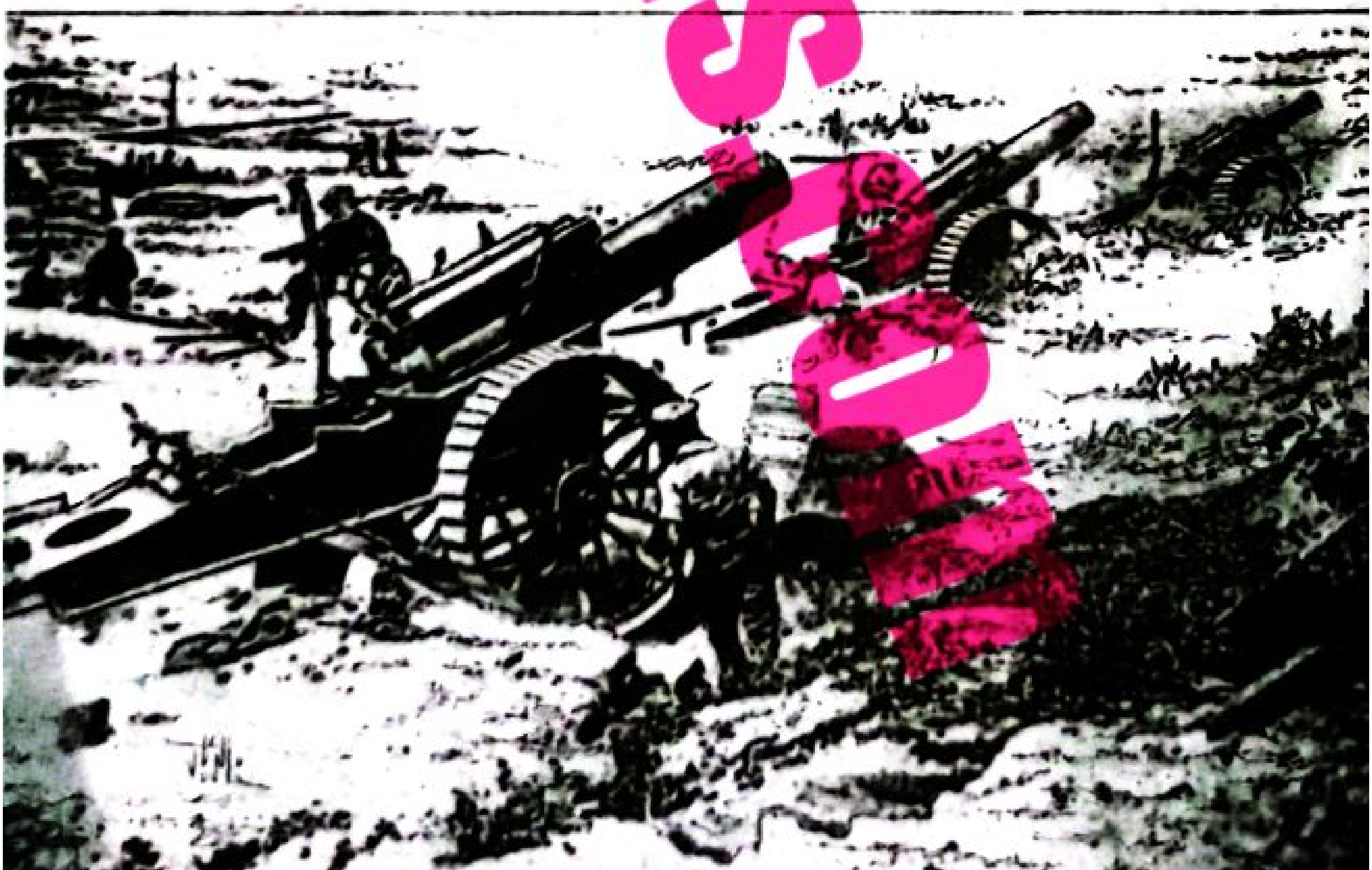

اور کسی بھی قسم کا کوئی شور وغیرہ نہ کرنے کی ہدایت کی گئی تھی کیونکہ جس جگہ ان کی بوٹ لنگر انداز تھی، اس کے قریب ہی ایک جنگی کشتی پر کچھ جرمن سنتری موجود تھے۔ وہ دس یونانی باشندے جنہیں ان کے ساتھ چلنا تھا، ان سے پہلے پہنچ چکے تھے اور موٹر بوٹ کے اندرونی حصے میں چھپے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ انہیں ایک مسئلہ درپیش ہے۔ ہوا یہ کہ پینٹوریلی کا چھوٹا بھائی اسپاتک دن ہی میں آکر موٹر بوٹ میں چھپ گیا تھا اور اب ان کے ساتھ جانے کی ضد کر رہا تھا۔ فیرن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے روتے ہوئے جواب دیا کہ وہ اپنے غریب بھائی اور ماں پر ایک بوجھ ہے۔ یہاں رہ کر وہ ان کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ پھر یہ کہ اس کی خواہش ہے کہ فوج میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو کر ظالم جرمنوں کے خلاف جنگ کرے۔ فیرن نے اسے زبردستی اتارنا چاہا تو اس نے دھمکی دی کہ اگر اسے ساتھ چلنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ چیخ چیخ کر پورے ایتھنز کو جگا دے گا۔ پینٹوریلی نے بھی اس سے بہت کچھ کہا سنا مگر اسپاتک کی ایک ہی ضد تھی کہ وہ ہر صورت میں ان کے ساتھ جائے گا۔ آخر مجبور ہو کر فیرن نے اس کے بھائی سے کہا کہ وہ اسے جانے دے اور اسے اطمینان دلایا کہ مصر پہنچنے تک فیرن اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کرے گا، بالکل چھوٹے بھائی کی طرح۔

"لیکن تم سمجھتے نہیں، وہ بہت بیمار ہے۔" پینٹوریلی بولا۔

"میں جانتا ہوں اور اس کے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھوں گا۔" فیرن نے جواب دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے ہر ہفتے انجیکشن لگنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ ایک خوفناک مرض میں مبتلا ہے۔"

"کوئی بھی مرض ہو، میں مصر پہنچ کر اس کے علاج کا پورا بندوبست کر دوں گا۔"

آخر پینٹوریلی بھی بھائی کی ضد سے مجبور ہو گیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے انہوں نے اپنی موٹر بوٹ سمندر کی لہروں کے حوالے کر دی۔ اس طرح جب یہ کافی دور نکل آئے تو لنگرس نے بوٹ کا انجن اسٹارٹ کیا اور اس طرح فیرن وغیرہ کے سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

موٹر بوٹ کچھ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ تقریباً تیس فٹ لمبی ہوگی۔ اس اعتبار سے اس کا کیبن اور بیٹھنے کی جگہ بھی مختصر سی ہی تھی اور اس چھوٹی سی جگہ میں یہ چودہ مسافر بڑی تنگی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کشتی میں مستول لگنے کی بھی گنجائش تھی مگر جہاں کسی وقت مستول لگا ہوگا، وہاں اب صرف ایک بڑا سا سوراخ جھانک رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ کشتی چلانے میں مستول، بادبان اور ہوا کے رخ سے مدد نہیں لے سکتے تھے۔

کشتی کھینے کے لیے ان کے پاس صرف ایک ہی چیز تھی، یعنی اس کا انجن جو ڈیزل آئل سے چلتا تھا۔ حساب لگایا گیا کہ اگر موسم اور دوسرے حالات موافق رہے تو یہ لوگ چار دن میں اسکندریہ پہنچ جائیں گے اور یہ کہ ان کے پاس صرف اتنا ہی ڈیزل ہے جو چار دن بوٹ کو سمندر میں رواں دواں رکھ سکے۔ اپنا راستہ پہچاننے کے لیے یہ ایک "اسکول اٹلس" سے مدد لے رہے تھے جس میں صرف جزیرہ کریٹ تک واقع جزیرے دکھائے گئے تھے۔ اس کے آگے صرف سمندر ہی نظر آ رہا تھا۔

ان کا رخ جنوب کی طرف تھا۔ ان کے پاس خشک روٹیوں کی ایک بوری اور تھوڑی سی پیاز تھی۔ کچھ اور متفرق چیزیں بھی تھیں مگر سب ملا کر بھی کچھ زیادہ قابلِ اطمینان حالت نہ تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے اثرات یونان کی غذائی صورت حال پر بھی پڑے تھے۔ ایتھنز میں قحط جیسے حالات پیدا ہونا شروع ہو چکے تھے اور اتنا کچھ غذائی سامان بھی یہ لوگ کوشش کے بعد ہی حاصل کر سکے تھے۔ انہوں نے اپنی موٹر بوٹ کا نام "ایلپس" رکھا تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ یہ انہیں ان کے یونانی دوستوں کی یاد دلاتا رہے بلکہ اس لیے بھی کہ یونان میں بحری سفر کی دیوی کو (یا غالباً روح کو) ایلپس کہا جاتا ہے۔ ابتدائی دو گھنٹوں میں یہ سب بہت سی سمندری بیماری sea sickness یعنی جی متلانا، قے کرنا وغیرہ میں مبتلا ہوئے لیکن جلد ہی یہ اپنی چھوٹی سی موٹر بوٹ کے اتار چڑھاؤ اور ہچکولوں کے عادی ہو گئے۔

راہ میں ملنے والے پہلے جزیرے سے کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ انہیں ایک گشتی بوٹ دکھائی دی اور یہ سب جلدی سے کشتی کے زیریں حصے میں جا چھپے۔ الباس نے جلدی سے بہت سے جال نکال کر عرشے پر پھیلا دیے تاکہ ظاہر ہو کہ یہ لوگ مچھیرے ہیں اور سمندر میں مچھلیاں پکڑنے نکلے ہیں۔ شکر تھا کہ گشتی بوٹ نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا اور یہ جلد ہی خطرے سے باہر نکل گئے۔

سفر کے دوسرے دن ایک جرمن طیارہ اڑتے اڑتے ایک دم ان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا پائلٹ طیارے کو بہت نیچے اتار لایا اور غور سے انہیں دیکھنے لگا مگر پھر غالباً

مطمئن ہو گیا اور اس کے بعد پھر بلند ہو کر اپنی راہ پر چلا گیا۔

یہ سب بہت پُرامید دلوں اور بشاش چہروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جزیروں کے درمیان سمندر پر بہتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر عرشے پر لیٹے رہتے تھے۔ الیاس بڑی خوبی سے بوٹ کا اسٹیئرنگ وہیل سنبھالے اسے اپنی منزل کی طرف لے جا رہا تھا۔

دوسری رات الیاس کو آرام کا موقع دینے کے لیے ایک اور یونانی جار جیو نامی شخص نے وہیل تھاما اور وہاں سے ان کی آزمائشوں کا آغاز ہو گیا۔ ایک جزیرے کی شکل سے اسے کچھ غلط فہمی ہو گئی اور بوٹ کو موڑ کر ان کے مقررہ راستے سے بہت دور لے گیا۔ دلتا فی فیرن کو احساس ہو گیا کہ راہ میں آنے والے جزیروں کی ہیئت ان جزیروں سے نہیں ملتی جو ذہن میں رہے ہوئے تھے۔ فیرن نے فوراً الیاس کو اٹھایا۔ پہلے اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا اور بوٹ اسی راستے پر چلتی رہی مگر جلد ہی اس نے بھی دیکھ لیا کہ وہ راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ رات کا وقت تھا۔ طے ہوا کہ صبح تک ایک بڑی چٹان کے کنارے لنگر انداز ہو جائیں پھر صبح کو دیکھ بھال کر آگے بڑھیں گے۔

ابھی یہ چٹان کے پاس پہنچے ہی تھے کہ ان کے ایک ساتھی نے دور ایک سایہ سا دیکھا جس پر اسے دوسری کشتی کا گمان گزرا۔ لیفٹرس نے جلدی سے بوٹ کا انجن بند کر دیا۔ خاموشی چھا گئی اور یہ سب اس خاموشی میں دیر تک سانسیں روکے بیٹھے رہے لیکن اس سائے میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ سورج نکلا تو پتا چلا کہ وہ ایک چٹان تھی۔

راستے سے بھٹک جانا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ خاص طور سے اس لیے کہ ان کے پاس ڈیزل آئل کی بہت محدود مقدار تھی۔ اس میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ یہ غلط سمت میں چل کر آئل ضائع کریں اور پھر واپس صحیح راستے پر آئیں، تب بھی وہ ان کی منزل تک پہنچنے کے لیے کافی ہو۔ یہ نظریہ احتیاط انہوں نے آئل کے ڈبوں کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے کہ کسی نے (ان کا شبہ فوراً دو افراد پر گیا تھا۔ ایک بوٹ کا مالک یانی اور دوسرے پینٹو ریلی) ان میں سے تین ڈبے چرا لیے ہیں۔

☆☆☆

موجودہ حالات میں خطرات مول لینے کا تصور ان کے لیے بے حد دہشت ناک تھا۔ فرانس اور برطانیہ یقیناً خاموش نہیں رہیں گے۔ چیکوسلواکیہ کی اپنی فوج بھی نرم چارا نہ تھی۔ مزید برآں روس کا خطرہ بھی تھا جس کے چیکوسلواکیہ کی ریاست اور اس کے صدر کے ساتھ نہایت گہرے

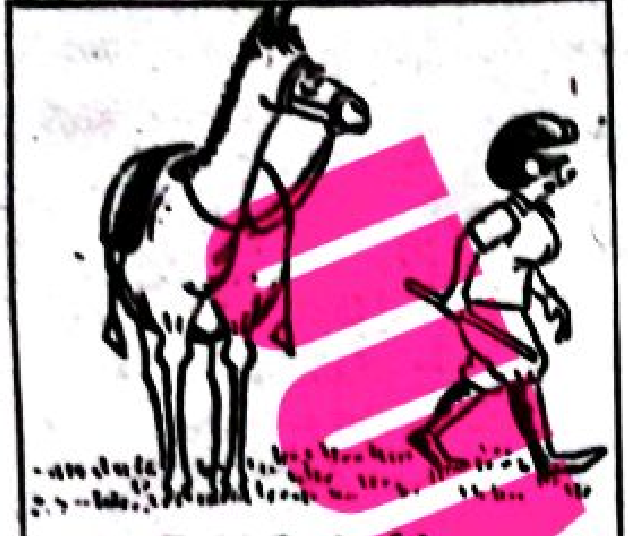

مجھے تم سے محبت ہے مگر میں کہہ نہیں سکتا

تعلقات تھے۔ صدر بینز نے 1937ء میں اسٹالن کو اس سازش کی خبر دی تھی جو روسی فوج کے افسر اور پرانے کمیونسٹ اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے پراگ کے سوویت سفارت خانے کی وساطت سے جرمنوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ چنانچہ اس انکشاف پر اسٹالن نے کیپٹن سے اوپر کے رینک والے پانچ ہزار فوجی افسر موت کے گھاٹ اتار دیے تھے۔ تاہم جرمن جرنیلوں کی ایک نہ چلی۔

جون کے مہینے میں ڈپلومیٹک سرگرمیاں پورے زوروں پر تھیں۔ 18 جون کو ہٹلر نے چیکوسلواکیہ پر حملے کرنے کے لیے آخری ہدایات جاری کر دیں۔ جولائی میں ہٹلر کا ذاتی معاون کیپٹن وائڈ مین، برطانوی وزیر خارجہ لارڈ ہیلی فیکس سے ملا۔ وائڈمین نے کہا۔

”ہٹلر نے مصالحت کی جو پیشکش کی تھی، برطانیہ کی طرف سے جواب نہ ملنے پر اس کی عزتِ نفس کو سخت ٹھیس پہنچی ہے۔ اب گورنگ مذاکرات کے لیے لندن آنا چاہتا تھا۔ جرمنی، چیکوسلواکیہ کے خلاف کارروائی سال بھر کے لیے ملتوی کر دے گا۔“

چیمبرلین تو خود مصالحت چاہتا تھا۔ اس نے مذاکرات کے لیے فضا سازگار بنانے کی تگ و دو شروع کر دی۔ لارڈ رن کی مین کو پراگ بھیجا تا کہ چیکوسلوواکی کی حکومت اور نازی لیڈر ہنلن میں مصالحت کرائے۔ پندرہ روز تک مذاکرات ہوتے رہے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ واقعات کا دھارا بڑی تیزی کے ساتھ بہنے لگا۔ ڈپلومیٹک سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مختلف ملکوں کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے۔ جرمن وزیر خارجہ ربن ٹراپ اٹلی سے بات چیت کر رہا تھا۔

ماسکو میں فرانسیسی سفارت خانے کا ناظم الامور روسی

وزیر خارجہ سے مصروف گفتگو تھا۔

10 ستمبر 1938ء کو وزیر خارجہ فرانس نے برطانوی سفیر متعینہ پیرس سے کہا۔

''ہٹلر چیکوسلواکیہ پر حملہ کر دیتا ہے، فرانسیسی فوجیں فوراً حرکت میں آجاتی ہیں۔'' فرانس کہتا ہے۔ ''ہم تو مارچ کر رہے ہیں۔ کیا تم بھی ہمارا ساتھ دیتے ہو؟ برطانیہ کا جواب کیا ہوگا؟''

12 ستمبر کو لارڈ ہیلی فیکس نے برطانوی کابینہ کا جواب اپنے سفیر کی وساطت سے فرانس کو بھیج دیا۔

''ہز میجسٹی کی حکومت فرانس کی سلامتی اور اس کے وجود کو کبھی خطرے میں نہ پڑنے دے گی۔ تاہم وہ کس قسم کے اقدامات کرے گی اور کب کرے گی؟ سردست ٹھیک ٹھیک کچھ کہا نہیں جاسکتا۔''

فرانسیسی حکومت نے پھر دریافت کیا۔ ''فرانس کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا تو برطانیہ کیا مدد کرے گا؟'' جواب آیا۔ ''جنگ کے پہلے چھ مہینوں میں دو ڈویژن غیر مشینی فوج اور ایک سو پچاس طیارے۔''

فرانس، چیکوسلواکیہ کو اس کی قسمت کے سپرد کر دینے کے لیے اگر کوئی بہانہ تلاش رہا تھا تو برطانیہ نے مہیا کر دیا۔

12 ستمبر کو ہٹلر نے نورمبرگ کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے چیکوسلواکیہ پر شدید حملے کیے۔ جواب میں چیکوسلووی حکومت نے اگلے روز ہی ملک کے بعض حصوں میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ 15 ستمبر کو نازی لیڈر ہنلن بھاگ کر جرمنی چلا گیا۔ بحران نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔

13، 14 ستمبر کی درمیانی رات فرانسیسی وزیر اعظم نے چیمبرلین سے رابطہ قائم کیا اور ہٹلر سے کسی سطح پر مشترکہ ملاقات کرنے کی تجویز پیش کی۔

چیمبرلین پہلے ہی جرمنی کے ساتھ سلسلہ جنبانی شروع کر چکا تھا۔ اسی شام ہٹلر نے اسے میونخ آنے کی دعوت دے دی۔ 15 ستمبر کو سہ پہر کے وقت برطانوی وزیر اعظم میونخ پہنچ گیا۔ وقت کا انتخاب بے حد غلط تھا۔ چیکوسلووی کے لیڈر تو دم بخود رہ گئے۔ انہوں نے فوری اقدامات کرکے سوڈین لینڈ کے حالات پر قابو پالیا تھا۔ نازی لیڈر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے اور سوڈین نازی پارٹی میں راست اقدام کے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ چیکوسلووی کی حکومت سوڈین لینڈ کو علاقائی خودمختاری دینے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ ان حالات میں چیمبرلین کا دورہ ظاہر کرتا تھا کہ برطانیہ تصادم سے بہر صورت گریز کرنا چاہتا ہے۔ اس کی کمزوری سے سوڈین لینڈ نے پورا فائدہ اٹھایا اور برلن کے اشارے پر جرمنی کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ یہ پہلی خبر تھی جو میونخ پہنچنے کے بعد چیمبرلین کو ملی۔

ہٹلر سے ملاقات کے بعد 7 ستمبر کو چیمبرلین واپس لندن آگیا اور کابینہ میں چیکوسلواکیہ کے متعلق نئی پالیسی پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جرمن اکثریت والے چیکوسلووی کے علاقے جرمنی کے حوالے کر دیے جائیں۔ وہ صرف اسی صورت میں ہٹلر کی دستبرد سے بچ سکتا ہے۔

18 ستمبر کو فرانسیسی وزیر اعظم لندن پہنچا۔ برطانیہ اور فرانس نے مل کر تجاویز مرتب کیں جنہیں دونوں ملکوں کے سفیروں نے 20، 21 ستمبر کی رات پراگ میں صدر بینز کے سامنے رکھ دیا۔

برطانیہ تو بری الذمہ تھا۔ اس نے چیکوسلواکیہ سے باضابطہ کوئی وعدہ نہیں کیا تھا لیکن فرانس نے معاہدے کی رو سے زبان دی تھی کہ وہ چیکوسلواکیہ کو جارح سے محفوظ رکھنے کے لیے بے چون و چرا امداد کرے گا مگر اب اس نے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

صدر بینز فرانس اور برطانیہ کے دباؤ کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گیا۔ انگلستان اور فرانس کے اس شرمناک طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ چیکوسلووی حکومت مستعفی ہو گئی اور جنرل سائیروون کی سربراہی میں غیر جماعتی حکومت نے زمام اقتدار سنبھال لی۔

22 ستمبر کو صدر بینز نے قوم سے خطاب کیا اور پرسکون رہنے کی درخواست کی۔ ٹھیک اس وقت چیمبرلین، ہٹلر سے دوسری بار ملنے کے لیے دوش ہوا پر میونخ جارہا تھا۔ اب کے گاڈسبرگ میں ملاقات ہوئی۔ برطانوی وزیر اعظم وہ اینگلو فرانسیسی تجاویز لے کر آیا تھا جو چیکوسلواکیہ نے منظور کر لی تھیں اور پہلی ملاقات میں ہٹلر کی طرف سے پیش کردہ اصولوں کے عین مطابق تھیں۔ چیمبرلین ناقابل تصور صورت حال سے دوچار تھا۔ ہٹلر اپنے موقف سے دستبردار ہونے کو آمادہ نہ تھا۔ آخری اجلاس میں اس نے چیمبرلین کو ایک میمورنڈم دیا۔ میمورنڈم کیا تھا، الٹی میٹم تھا۔

''چیکوسلووی حکومت 28 ستمبر دن کے دو بجے تک ان مطالبات کو تسلیم کرلے بصورت دیگر یکم اکتوبر کو جرمن افواج چیکوسلواکیہ میں داخل ہو جائیں گی۔''

چیمبرلین 24 ستمبر کی سہ پہر بے نیل و مرام واپس لندن پہنچ گیا۔

اگلے روز کابینہ کے تین اجلاس ہوئے۔ ہٹلر کے نئے

urdunovels.com

مطالبات پر لندن اور پیرس دونوں کا رویہ نہایت سخت تھا۔ انہیں مسترد کر کے جرمنی کو اطلاع دے دی گئی۔ تصادم کا لمحہ آچکا تھا۔ چیکوسلواکیہ، فرانس اور برطانیہ نے اپنی فوجوں کو تیار رہنے کے احکام جاری کردیے۔

اب ایک نظر جرمنی پر بھی ڈالتے چلیے۔ جرمن فوج کے اعلیٰ افسر ہٹلر کے منصوبوں سے سخت بیزار تھے۔ آسٹریا پر حملے کے بعد انہوں نے ایک یادداشت میں اسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ فتوحات کے اس پروگرام پر عمل ہوتا رہا تو اس کا نتیجہ عالمی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ پہلی جنگ کے کھنڈروں سے جرمنی کی ابھرتی ہوئی قوم تباہ ہوجائے گی۔ ہٹلر نے چیکوسلواکیہ کو الٹی میٹم دیا تو چیف آف جنرل اسٹاف جنرل بیک نے استعفا دے دیا اور کشمکش تیز تر ہوگئی۔ آخر جرمن ہائی کمان نے (جنرل ہیلڈر کے بیان کے مطابق جو اس نے نور مبرگ کے مقدمے میں دیا) اس پاگل شخص سے ملک و قوم کو نجات دلانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سازش میں تمام اہم جرمن افسر شامل تھے۔ منصوبہ بالکل مکمل ہوچکا تھا کہ خبر ملی چیمبرلین میونخ آرہا ہے۔ اعلیٰ فوجی افسر فوراً جمع ہوئے اور طے پایا کہ اگر ہٹلر، چیمبرلین کو مرعوب کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو انقلاب لانے کا فیصلہ منسوخ کردیا جائے گا۔ ساتھ ہی بری اور بحری افواج کے کمانڈروں نے الگ الگ یادداشتیں ہٹلر کو پیش کیں جن میں جرمن عوام، فوجوں کی پوزیشن اور یورپ کے حالات پر تبصرہ کرنے کے بعد کہا گیا تھا کہ جنگ کا خطرہ مول لینے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ بچار کرلینی چاہیے۔

27 ستمبر کی شام چیمبرلین نے ریڈیو پر اپنی قوم سے خطاب کیا اور کہا۔

''میں دل و جان سے امن پسند آدمی ہوں لیکن اگر مجھے یقین ہوگیا کہ کوئی قوم اپنی طاقت سے دہشت زدہ کر کے دنیا پر غالب آنا چاہتی ہے تو اس کی مزاحمت کروں گا۔''

تقریر کے بعد اسے ہٹلر کا خط ملا اور امید کی ہلکی سی کرن پھر جگمگا اٹھی۔ ہٹلر نے چیکوسلواکیہ کی نئی سرحدوں کے تحفظ کی ضمانت دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ چیمبرلین فوراً تیسری بار بات چیت کے لیے تیار ہوگیا۔

29 ستمبر کو میونخ کانفرنس شروع ہوئی جس میں ''چار بڑے'' شامل تھے۔ چیمبرلین، فرانسیسی وزیراعظم، ہٹلر اور مسولینی۔ سمجھوتا بڑی تیز رفتاری سے طے پاگیا۔ اس کی رو سے چیکوسلواکیہ سے کہا گیا کہ وہ سوڈین لینڈ خالی کردے۔ نئی سرحدیں متعین کرنے کا کام ایک بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کردیا گیا۔ سمجھوتے کی دستاویز چیکوسلواکی کے نمائندے کے حوالے کردی گئی۔

30 ستمبر کو چیمبرلین نے مشترکہ اعلامیہ کا پہلے سے تیار کردہ مسودہ ہٹلر کے آگے رکھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہم یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ دونوں ملک متعلقہ مسائل کو اس طرح بات چیت اور صلاح مشورے سے حل کریں گے جس طرح گزشتہ رات کا معاہدہ طے پایا ہے۔ ہم باہمی اختلافات ختم کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے اور یورپ کو امن سے ہمکنار کرنے میں پوری طرح حصہ لیں گے۔ ہٹلر نے پڑھے بغیر دستخط کردیے۔ چیمبرلین برطانیہ پہنچا تو اس نے کاغذ ہوا میں لہراتے ہوئے میونخ کے اعلان کو تاریخ ساز اعلان اور پورے دور کے لیے مژدۂ جاں فزا قرار دیا۔ ہٹلر کی بصیرت و فراست نے ایک بار پھر مغربی طاقتوں کو پچھاڑ دیا تھا۔ جرمن جرنیلوں کو پھر نادم ہونا پڑا اور انہوں نے اس کا تختہ الٹنے کا منصوبہ ترک کردیا۔ تاہم کسی فوجی افسر نے اس سازش کا انکشاف کر کے اپنے ساتھیوں سے دغا نہ کی۔

چیکوسلواکیہ نے میونخ کے آگے سر جھکا دیا۔ صدر بینز مستعفی ہوگیا۔ چیکوسلواکیہ معاہدے کے مطابق تقسیم کردیا گیا لیکن اس کی لاش کے حصے دار اکیلے جرمن گدھ ہی نہ تھے۔ معاہدہ میونخ کے فوراً بعد پولینڈ نے چیکوسلواکیہ کو چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا کہ ٹیشن کا سرحدی علاقہ اس کے حوالے کردیا جائے۔ چیکوسلواکیہ کے پاس وسائل ہی نہ تھے کہ اس ظالمانہ مطالبے کی مزاحمت کرسکتا۔ یہی نہیں 14 مارچ 1939ء کو سلاوکوں نے جرمنی کی شہ پر آزادی کا اعلان کردیا۔ اسی روز ہنگری نے بھی اس لاش میں اپنا حصہ بٹاتے ہوئے مشرقی صوبے پر قبضہ کرلیا۔ 15 مارچ کو رہے سہے علاقے پر جرمن افواج قابض ہوگئیں اور چیکوسلواکیہ کا وجود مٹ گیا۔

پانچ مہینے پہلے معاہدہ میونخ کے بعد وزیر نو آبادیات نے کہا تھا۔

''ہز میجسٹی کی حکومت چیکوسلواکیہ کی حفاظت اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہے۔ وہ اس کی سالمیت اور وجود برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن اقدام اٹھائے گی۔''

15 مارچ 39ء کو جب چیمبرلین نے ہنگری اور جرمنی کی اس برہنہ جارحیت کی خبر پارلیمنٹ کو سنائی تو پوچھا گیا۔

''اس ضمانت کا کیا بنا جو برطانیہ نے چیکوسلواکیہ کو دی تھی؟''

''کل تک تو اس ضمانت کا جواز تھا مگر آج صورت حال بدل گئی ہے کیونکہ سلاوک پارلیمنٹ نے سلاوکیہ کی

آزادی کا اعلان کر دیا ہے۔'' چیمبرلین کا جواب تھا۔

معاہدہ میونخ جس سے چیمبرلین نے عظیم اور خوش آئند توقعات وابستہ کر لی تھیں، انجام سے دوچار ہو چکا تھا۔ چیمبرلین جو اس معاہدے کی شان میں قصیدے پڑھتا رہتا تھا، اب ہٹلر کی مذمت کر رہا تھا۔ ہٹلر کا اگلا شکار پولینڈ تھا۔ 31 مارچ کو چیمبرلین نے دارالعلوم میں اعلان کیا کہ پولینڈ کی آزادی کو خطرہ درپیش ہوا تو برطانیہ پوری قوت سے اس کی مدد کرے گا۔

اس زمانے میں ایک نیا بحران پیدا ہو گیا۔ 7 اپریل 1939ء کو فجر کے وقت اطالوی فوجوں نے البانیہ پر حملہ کر دیا۔ البانیہ کی بساط ہی کیا تھی۔ مختصری جھڑپ کے بعد پورا ملک سرنگوں ہو گیا۔ جس طرح جرمنی، چیکوسلواکیہ کے خلاف بیس کیمپ بنانا چاہتا تھا اسی طرح اٹلی، البانیہ کو یونان کے خلاف فوجی کیمپ بنانے کا خواہشمند تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شمال مشرقی یورپ کی طرح جنوب مشرقی یورپ میں بھی متحدہ محاذ قائم کرنے اور یونان اور ترکی کو تحفظ کی ضمانت دینے کی ضرورت ہے۔ وزیراعظم چیمبرلین کو ایک مکتوب میں اس کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی گئی اور لکھا۔

''پورا جزیرہ نما بلقان خطرے میں ہے۔ اگر برطانیہ اور فرانس نے بروقت اقدام نہ کیا تو بلقانی ریاستیں جرمنی اور اٹلی کے دباؤ میں آ کر ان سے معاہدہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔''

برطانیہ نے ہٹلر کے آگے بچھ جانے کی پالیسی اپنا کر امن وامان کی جو امیدیں وابستہ کی تھیں، وہ ایک ایک کر کے دم توڑ چکی تھیں۔ ہٹلر جنگ چاہتا تھا۔ برطانیہ، پولینڈ کے علاوہ یونان اور رومانیہ کو بھی تحفظ کی ضمانت دے چکا تھا۔ 28 اپریل کو ہٹلر نے جرمن پولینڈ معاہدے کی دھجیاں بھی اڑا دیں۔ برطانیہ نے پولینڈ کو ضمانت تحفظ تو دے دی تھی مگر روس کے ساتھ کسی سمجھوتے کے بغیر اس ضمانت کی کوئی قدروقیمت نہ تھی۔

☆☆☆

واپس جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ اس لیے اب یہ صرف دعا ہی کر سکتے تھے کہ کریٹ سے دوسری جانب پہنچنے کے بعد برطانوی بحری جہاز یا کشتی ان کی مدد کے لیے راستے میں مل جائے۔

اگلے دو دن ٹھیک گزرے اور انہوں نے خاصا راستہ طے کر لیا۔ کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی حصہ اتنا خوبصورت اور نظر فریب نہیں جتنے یونانی جزائر ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ شہرت اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ یہ اس حسن و دل فریبی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر رہے تھے۔ سمندر بدستور پرسکون تھا اس لیے یہ اطمینان سے عرشے پر لیٹے آس پاس کے جزائر کی خوبصورتی اور سرسبز و شادابی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

فیرن کو بحری سفر کا بہرحال کوئی تجربہ نہ تھا اس لیے یہ دیکھ کر خاصی حیرت ہوتی تھی کہ بظاہر جو جزیرہ اس قدر قریب نظر آ رہا ہے، حقیقت میں اتنی دور تھا کہ اس تک پہنچنے یا اس کے پاس سے گزرنے میں اندازے سے کہیں زیادہ وقت لگ جاتا تھا۔ غروب آفتاب کا منظر بھی بڑا مسحور کن ہوتا تھا۔ سائے دراز ہو جاتے تھے، جزیروں کے نشیب و فراز سنہری دھوپ میں چمکنے لگتے تھے اور ان کی کشتی جیسے سونے کا روپ دھار لیتی تھی۔ چاروں طرف نظر آتی ہوئی سرسبزی و شادابی کے درمیان کچھ یوں لگتا تھا جیسے ان کی کشتی ابھی دوسرے ہی لمحے کسی خوبصورت رنگ برنگے پھول کی شکل میں ڈھل جائے گی۔

جب یہ لوگ اس سفر کی منصوبہ بندی کر رہے تھے تو انہوں نے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ ان کے لیے خطرے کا سب سے زیادہ پریشان کن وقت وہ ہوگا جب یہ کریٹ اور روڈز آئی لینڈ کے درمیان ہوں گے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس جگہ جرمن ''ای'' بوٹس گشت کرتی رہتی ہیں اور ان میں سے کسی کی بھی نظر ان پر پڑنا گویا موت کے مترادف تھا۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ یہ فاصلہ رات کی تاریکی میں طے کریں گے۔ راستے سے بھٹک جانے کی غلطی پورے ایک دن کی حد تک انہیں اور ان کے اثاثوں کو متاثر کر چکی تھی۔ سفر کا جو مرحلہ وار پروگرام بنایا تھا، وہ بے ترتیب ہو چکا تھا اور فیرن کو افسوس تھا کہ جب ان کے درمیان یہ مسئلہ درپیش ہوا تھا کہ وہ مصر چلیں یا ترکی کا رخ کریں تو فیرن نے اس بنیاد پر ترکی جانے کی مخالفت کی تھی کہ ترکی کی غیر جانبداری کے باوجود وہاں کسی وقت بھی جرمن پہنچ سکتے تھے لیکن اب افسوس کرنے سے کیا فائدہ؟ اب یہی چارۂ کار باقی تھا کہ جس طرح بھی ہو، بس آگے بڑھتے جائیں۔ چونکہ ان کے پاس پانی اور خوراک کی بہت قلیل مقدار تھی اور انہیں دونوں چیزوں کی شدید ضرورت تھی۔ اس لیے فیرن نے الیاس کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ وہ جزیرہ سانتورین سے ہوتے ہوئے چلیں۔

اپنے سفر کی چوتھی صبح کو یہ اس جزیرے پر پہنچے جسے ان کے خیال میں سانتورین ہونا چاہیے تھا مگر یہ اس کی جس سمت میں تھے، وہاں انہیں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔

انہوں نے بوٹ ساحل سے لگا دی۔ اٹلس کے مطابق

اس جزیرے کی بندرگاہ مشرقی سمت میں تھی اس لیے انہوں نے اس طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس بات کا پورا خطرہ تھا کہ وہاں ان کا سامنا جرمن سپاہیوں سے ہو جائے۔ البتہ ایک یونانی ملاح نے جس کا نام کرسٹو تھا، اپنا چاقو منہ میں دبایا اور سمندر میں کود پڑا کہ پانی میں تیرتے ہوئے دوسری طرف کی خبر لائے۔ کافی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو بڑی خراب خبر لے کر آیا۔

معلوم ہوا کہ یہ جزیرہ دوسرے سارنتورین ہے ہی نہیں بلکہ ایک دوسرا اور قطعی غیر آباد جزیرہ ہے جس کا شرقی ساحل لنگر انداز ہونے کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ الیاس بوٹ کو آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے دوسری طرف لے گیا۔ یہاں ایک محفوظ خلیج میں بوٹ کا لنگر ڈال دیا اور یہ سب کنارے پر چڑھ گئے کہ اپنے مطلب کی جو شے بھی پائیں، اٹھا لائیں۔ معلوم ہوا کہ جزیرہ ہمیشہ سے غیر آباد نہیں تھا۔ آبادی کے نشانات ہر طرف دکھائی دیے۔ تب یہ گمان ہوا کہ شاید لوگ صرف کھیتی باڑی کے دنوں میں اس جزیرے کا رخ کرتے تھے اور جب فصلیں پک کر کٹ جاتی ہیں تو وہ غلہ لے کر واپس چلے جاتے ہیں۔

اس خیال کی وجہ وہ پھیلے ہوئے کھیت تھے جہاں کٹے ہوئے گندم کے کچھ خوشے اب بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس وقت تک ان کی بھوک بھی چمک اٹھی تھی اس لیے یہ لوگ گندم کے خوشے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جتنے بھی راستے میں ملتے گئے، اٹھا اٹھا کر کھاتے چلے گئے۔

جزیرے کی جنوبی سمت انسانی آبادی کے کچھ نشانات دیکھنے میں آئے۔ جگہ جگہ پہاڑی غاروں کو کاٹ کر کمروں اور کوٹھریوں کی شکل دے دی گئی تھی جس کے سامنے لکڑی کے کواڑ بھی لگائے گئے تھے۔ ایک پہاڑی پر چھوٹا سا گرجا گھر بھی ملا۔ فیرن نے گرجے میں جا کر دعا مانگیں اور فیرن کے یونان کے جو بھی سکے رہ گئے تھے، وہ سب وہیں پر رکھے ہوئے چندہ جمع کرنے والے بکس میں ڈال دیے۔

دفعتاً کرسٹو نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ معلوم ہوا کہ اسے میٹھے پانی کی ایک بھری ہوئی ٹینکی مل گئی ہے۔ انہوں نے پہلے اپنے پانی کا ڈرم بھرا پھر خوب جی بھر کر پانی پیا، منہ ہاتھ دھویا بلکہ نہائے بھی۔ آسٹریلین سارجنٹ کو پھلوں سے بھری ہوئی دو ٹوکریاں بھی مل گئیں جو ایک چٹان کی آڑ میں چھپا کر رکھی گئی تھیں۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا تو دور سمندر میں جزیرہ کریٹ کی جانب مچھلیاں پکڑنے والی دو کشتیاں نظر آئیں۔

پستہ قد

ایک خلیفہ کے دربار میں ایک شخص آیا اور عرض کرنے لگا کہ فلاں آدمی نے مجھے دھوکا دیا ہے اس لیے میرے ساتھ انصاف کیا جائے۔ خلیفہ نے اجنبی کی طرف دیکھا اور غصے سے کہا۔ ”فوراً بھاگ جا۔ ایک عقلمند کا قول ہے کہ پستہ قد آدمی کسی سے فریب نہیں کھا سکتا۔ تو بھی چھوٹے قد کا ہے اس لیے تجھے کوئی دھوکا نہیں دے سکتا۔“

اجنبی نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”اس دانا کا قول سر آنکھوں پر اور آپ کا ارشاد بھی بجا لیکن حضور جس نے مجھے دھوکا دیا ہے وہ قد میں مجھ سے بھی چھوٹا ہے۔“

خلیفہ اس کا جواب سن کر ہنس پڑا اور پھر دونوں آدمیوں کے درمیان مناسب فیصلہ کر دیا۔

(مرسلہ: رفعت خان، کوئٹہ)

شخصی زندگی کا تحفظ

عدی بن ارطاۃ نے جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک عامل تھے، آپ کو لکھا کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنے ذمے واجب الادا خراج اس وقت تک ادا نہیں کرتے جب تک انہیں تھوڑا سا عذاب نہ چکھا دیا جائے اس لیے اس کی اجازت دے دیجیے۔ انہوں نے جواب میں لکھا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ تم نے مجھ سے انسانوں کو عذاب دینے کی اجازت طلب کی ہے، گویا میں تمہیں عذاب الٰہی سے بچا لوں گا یا میری رضامندی تمہیں غضب خداوندی سے بچا لے گی۔ میرا خط پانے کے بعد یہ طریقہ اختیار کرو کہ جو شخص اپنے ذمے واجب الادا رقم آسانی سے ادا کر دے، اس سے لے لو اور جو نہ دے سکے اسے حلف لے کر چھوڑ دو۔ خدا کی قسم! یہ بات کہ لوگ اپنے جرائم کا بار اٹھائے خدا کے سامنے پیش ہوں، مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان کو عذاب دینے کے جرم میں اس کے سامنے حاضر ہوں۔“

(ماخوذ: بنیادی حقوق از صلاح الدین)

(مرسلہ: رفعت خان، کوئٹہ)

یہ پھل یقیناً مچھیروں کے ہی ہوں گے۔ گویا ان کی دعاؤں کا ثمر مل گیا تھا۔ فیرن تو دونوں ٹوکریاں لے جانے کے حق میں تھا مگر الیاس نے اختلاف کیا کہ کہیں ان مچھیروں کو فاقہ کشی کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ بات معقول تھی۔ چنانچہ ایک ٹوکری لی گئی اور اس کی قیمت کے طور پر ان میں سے ہر شخص نے وہ تمام یونانی سکے دوسری ٹوکری میں ڈال دیے جو ان کے پاس تھے۔

وہ واپس اپنی بوٹ میں آگئے اور سفر پھر شروع ہوگیا۔

اسی رات یہ جزیروں کی حدود سے نکل کر اس کھلے سمندر میں آگئے جو اب ان کے اور مصر کے درمیان حائل تھا۔ انہیں ... کریٹ کے مشرقی کنارے پر ایک لائٹ ہاؤس دور ہی سے نظر آرہا تھا اور یہ اپنی بوٹ سے ہیرک لائن نامی ہوائی اڈے پر جرمن طیاروں کو بھی اترتے اور پرواز کرتے دیکھ رہے تھے۔ فاصلے کی یہی تھوڑی سی پٹی ان کے لیے زیادہ اہم تھی اور یہ بڑی خاموشی سے گزرتے چلے جارہے تھے۔ نصف سے زیادہ راستہ طے کرچکے تھے کہ اچانک گہری دھند نے انہیں گھیر لیا۔ پہلے تو یہ بہت خوش ہوئے کہ اس دھند کی وجہ سے یہ کسی کو نظر نہیں آئیں گے مگر جب اس دھند نے طوفان کی اس ابتدائی علامت کی شکل اختیار کرنا شروع کی جو اس موسم میں عموماً بحیرۂ روم میں آتے رہتے تھے تو وہ گھبرائے کہ ان کی چھوٹی سی موٹر بوٹ کسی بڑے طوفان کا مقابلہ کس طرح کرسکے گی؟

ایک گھنٹے کے اندر اندر سمندر کی پرسکون سطح نے سرکش موجوں کی شکل اختیار کرلی۔ الیاس نے بڑی ہوشیاری سے وہیل سنبھالے ہوئے بوٹ کو ایسا رخ دے دیا کہ بپھری ہوئی لہریں انہیں کم سے کم نقصان پہنچا سکیں لیکن ظاہر تھا کہ اب یہ طوفانی ہواؤں کے رحم و کرم پر ہی تھے۔ وہ جدھر چاہتی تھیں، ان کی بوٹ کو اڑائے پھر رہی تھیں۔ اس طرح تقریباً دو دن تک ان کی کشتی سمندری متلاطم لہروں پر پلاسٹک کی کسی چھوٹی گیند کی طرح ادھر ادھر ڈولتی رہی۔ اڑتالیس گھنٹے تک ان کا اور طوفان کا مقابلہ ہوتا رہا اور اس دوران اگر ایک موج بھی کشتی کی مخالف سمت سے اٹھ کر ان کی طرف آجاتی تو وہ یقیناً ڈوب چکے ہوتے لیکن آفرین ہے الیاس کی چابک دستی اور ہوشیاری پر کہ وہ ہوا کے ساتھ ہی کشتی کا رخ بھی بدلتا رہا۔ ان اڑتالیس گھنٹوں میں اس نے ایک لمحہ بھی آرام نہیں کیا۔ بلاشبہ ایسی بے مثال صلاحیت کا مظاہرہ کوئی ہوشیار اور ماہر ملاح ہی کرسکتا تھا۔

آخر کار خدا خدا کرکے طوفان ختم ہوا اور وہ جس طرح یکبارگی ظاہر ہوا تھا، اسی طرح چلا بھی گیا۔ ایک بار پھر انہوں نے اپنے چاروں طرف سمندر کو پرسکون دیکھا مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب یہ سمندری لہروں کے ساتھ اسی رخ پر صرف بہنے پر مجبور تھے کیونکہ ان کی بوٹ پر موجود تمام ڈیزل آئل اس مدت میں ختم ہوچکا تھا۔ اتنا ہی نہیں، فیرن نے جائزہ لیا تو پتا چلا کہ تمام خوراک اور بیشتر پانی بھی صرف ہوچکا ہے۔ فیرن نے اپنے آپ کو اس بے پروائی کے لیے خوب برا بھلا کہا۔ یہ سب لوگ ہی طوفان کا مقابلہ کرتے کرتے آنے والے سمندری پانی کو کشتی سے نکالتے نکالتے تھک کر چور ہوچکے تھے اور نیم مدہوش فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ بہرکیف...... مرتا کیا نہ کرتا۔ فیرن نے باقی رہ جانے والے پانی کو ہی آخری امکانی حد تک احتیاط سے خرچ کرنے کی خاطر انتہائی سختی کے ساتھ سب کا برابر حصہ مقرر کردیا اور یہ حصہ جیلی کے ایک خالی ڈبے کا چوتھائی، فی یوم، فی کس تھا۔ فیرن خود اپنا پستول ہاتھ میں لے کر پانی کے ڈرم کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اگر کسی نے بھی زیادہ پانی لینے یا دوسرے کو محروم کرنے کی کوشش کی تو اسے بے دریغ گولی مارنے کو بھی تیار ہوگیا تھا۔

☆☆☆

"جاؤ، اس کی لاش کھینچ کر باہر لے آؤ۔" ہٹلر نے گیلی کو حکم دیا اور پستول جیب میں ڈال کر ایک اونچی جگہ پر بیٹھ گیا۔

گیلی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ سحر زدہ سی کھڈ کے پاس پہنچ گئی۔ ہٹلر نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اب گیلی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس گہرے کھڈ میں کس طرح اترے۔ ہٹلر سے مدد کی کوئی امید نہ تھی اور اسے حکم کی تعمیل کرنا از بس ضروری تھا۔

گیلی ایک لمبا چکر کاٹ کر کھڈ کے دوسری طرف پہنچی اور ایک ڈھلوان راستے سے نیچے اترنے لگی۔ اس راستے میں جگہ جگہ خاردار جھاڑیاں تھیں۔ گیلی کا لباس تار تار اور ہاتھ زخمی ہوگئے۔ وہ آخر کسی نہ کسی طرح لاش کے پاس پہنچ گئی۔ کھڈ کے اندر بہت کم روشنی تھی۔ شوفر خون میں لت پت پڑا تھا۔ گیلی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ شوفر کے دل کی حرکت بند ہوچکی تھی اور لاش اکڑ گئی تھی۔

نازک اندام گیلی کے لیے شوفر کی بھاری لاش کو اوپر تک کھینچ کر لے جانا ناممکن معلوم ہوتا تھا مگر وہ تعمیل حکم پر مجبور تھی۔ لہٰذا اس نے شوفر کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اسے اوپر کھینچنا شروع کردیا۔

دو گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد جب وہ لاش کو اوپر کھینچ کر لائی تو اس کی اپنی حالت بھی ایک لاش کی طرح ہو گئی تھی۔ اس کا گلنار چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اس وقت ہٹلر نے اس کی مدد کی اور لاش کو کھینچ کر کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ ہٹلر نے گیلی کو لاش کے پاس بیٹھنے کا حکم دیا اور خود گاڑی چلانے لگا۔ گھر پر اس کی بہن فرایو اور نیا ڈرائیور بیٹھے تھے۔ ہارن کی آواز سن کر دونوں بھاگتے ہوئے باہر آ گئے۔ گیلی کی ماں کو بیٹی کی لاش کی امید تھی لیکن جب اس نے گیلی کو کار سے اترتے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر بشاشت آئی مگر دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ کسی نامعلوم خوف کے خیال سے پھیکا پڑ گیا۔

لاش کو گھر کے اندر لایا گیا۔ ہٹلر کے حکم سے گیلی اور اس کی بہن فرایو رابن نے شوفر کے جسم کے ٹکڑے کیے۔ نئے ڈرائیور کو ان کی مدد کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ماں، بیٹی نے یہ ٹکڑے پھر گاڑی میں بھر دیے اور نیا ڈرائیور لاش کے ٹکڑوں اور گیلی اور اس کی ماں کو لے کر سیر گاہ کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں ان میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ کھڈ کے پاس پہنچ کر گیلی اور فرایو نے شوفر کے بدن کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے کھڈ کے اندر پھینک دیا پھر اسی طرح خاموشی سے گھر آ گئے۔

ہٹلر نے اس وقت یا اس کے بعد کبھی اس بات پر روشنی نہ ڈالی کہ وہ شوفر کی لاش کو گھر کیوں لایا اور اس کے ٹکڑے کروا کے پھر کھڈ میں کیوں پھنکوائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر اپنی بہن اور بھانجی کو خوف و دہشت کے ایک مستقل عذاب مسلسل کی گرفت میں رکھنا چاہتا تھا۔ ان کے ہاتھوں سے لاش کے ٹکڑے کرانے کا مقصد شاید یہ تھا کہ ماں، بیٹی ہمیشہ یہ سوچتی رہیں کہ ہٹلر سے بے وفائی اور نمک حرامی کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔

ہٹلر نے بہن کو تنبیہ کی۔ ”فرایو! میں نے گیلی کو اس لیے زندہ چھوڑ دیا کہ وہ جوانی کی آنکھیں بند کرے اور صرف عقل کی آنکھوں سے دیکھے۔ تمہارے لیے بھی یہی حکم ہے کہ تم گیلی کو غلط راستے پر چلنے سے روک دو اور اسے یہ بتا دو کہ ہٹلر کی زندگی میں اس پر کسی غیر مرد کا سایہ نہیں پڑ سکتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ ہٹلر کی عمر تم دونوں کی عمروں سے زیادہ طویل ہے۔“

”ایسا ہی ہوگا ایڈولف!“ فرایو نے کہا۔ ”تم نے گیلی کی جان بخشی کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ گیلی اب برگ ہاف کے مکان سے باہر قدم نہیں نکالے گی۔“

فرایو رابن نے واقعی اپنا عہد نبھایا۔ اس نے گیلی پر اس قدر پابندیاں لگا دیں کہ وہ گھر میں قید ہو کر رہ گئی مگر جرمنی کے مرد آہن ہٹلر کے حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ ایک طرف عوام اور خصوصاً جرمن جوانوں میں اس کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی، دوسری طرف دشمن اس کے راستے میں طرح طرح کے کانٹے بچھا رہے تھے۔ ہٹلر کے ڈرائیور شوفر کے قتل کا واقعہ چھپا نہ رہ سکا مگر اس قتل کے سلسلے میں گیلی رابن کا کوئی ذکر نہ آیا۔ سب کو یہی معلوم ہوا کہ شوفر نے کسی سے بھاری رقم لے کر ہٹلر کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جس کا انکشاف ہو گیا اور شوفر کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ یوں شوفر نے ہٹلر کے قتل کا منصوبہ ضرور بنایا تھا مگر کسی سے رشوت لے کر نہیں بلکہ گیلی رابن کی نشیلی آنکھوں میں ڈوب کر۔

ہٹلر فطری طور پر حسن پرست تھا اور حسن کے انتخاب میں اس کی نظر بہت اونچی تھی۔ گیلی رابن میں صرف شباب کی سرمستی نہیں تھی بلکہ وہ تو مجسم شباب اور مجسم قیامت تھی۔ اس کی آنکھیں ہی اس قدر سحر انگیز تھیں کہ دیکھنے والا اسے دیکھتے ہی مبہوت ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بالکل سیاہ تھیں اور سیاہ آنکھوں والی عورتیں یورپ میں بہت کم ہوتی ہیں۔

یوں مشرقی آنکھوں کی طرح اس کے بال بھی سیاہ اور لانبے تھے۔ اس کا قد درمیانہ اور جسم چھریرا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں ہزاروں فتنے چھپے تھے اور گیلی کی مسکراہٹ ہی نے ہٹلر کا دل جیت لیا تھا۔

☆☆☆

دن تو جیسے تیسے سورج کی حرارت کے سہارے گزر گیا مگر رات کو سردی تھی۔ ان کے پاس صرف دو کمبل تھے اور وہ چودہ آدمی۔ وہ ایک ایک کرشے کے لیے چھینا جھپٹی کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح لیٹ گئے۔

اگلے دن کی صبح طلوع ہوئی تو شدید مایوسی نے انہیں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے اور بدکلامی کرنے پر مجبور کر دیا۔ جارج فلیچر جو پولینڈ کا یہودی تھا، تیرن نے اسے اتنے دنوں میں پہلی مرتبہ ناامیدی اور افسردگی کی حالت میں مبتلا ہوا پایا۔ وہ الیاس کو کوس رہا تھا کہ اس نے روانگی سے پہلے ہی کیوں ڈیزل آئل چیک نہیں کیا تھا۔ یہ کیوں نہیں کیا کہ ہمارے پاس اتنی وافر مقدار میں آئل ہوتا کہ ہم

دو چار دن اِدھر اُدھر بھٹکنے کے باوجود سلامتی سے مصر پہنچ جاتے۔ وہ تو لیفرس کو بھی برا بھلا کہہ رہا تھا کہ آئل کی چوری اس کی مرضی یا اس کے اشارے سے ہوئی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ لیفرس کو اس چوری سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا کیونکہ یہ سب لوگ مجاور تو نہیں بلکہ حقیقتاً ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ وہ تو بس اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا اور نکال رہا تھا پھر پانی اور راشن تقسیم کرنے کے وقت تو فیرن ایک آسٹریلین سے لڑ ہی پڑا۔ وہ کم بخت کہہ رہا تھا کہ اسے اپنے حصے کا پانی نہیں ملا حالانکہ فیرن کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے خود اپنے ہاتھ سے پانی دیا تھا۔

اس نے غصے میں آکر فیرن کی ٹھوڑی پر گھونسا مارا۔ تمام یونانی بپھر گئے کہ اس جھوٹی قسم والے کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں۔ بہرکیف، خدا خدا کرکے ہنگامہ ختم ہوا۔

ویسے جہاں تک یونانی لوگوں کا تعلق تھا، ان میں اکثر اس صورت حال کو اپنی بدقسمتی کا نتیجہ کہتے اور کسمپرسی کے عالم میں ایک طرف ڈھیر ہو گئے تھے لیکن لیفرس بڑے عجیب موڈ کی انداز میں ایک جانب بیٹھا ہوا سمندر کو گھور رہا تھا۔

چونکہ ان کے پاس آئل نہ تھا اور وہ لہروں کے سہارے بہہ رہے تھے اس لیے ان کی کشتی کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے فیرن نے بادبان لگانے کی سوچی۔ لیفرس جو خاموش بیٹھا ہوا تھا، اسے کام کرتے دیکھ کر اس کے ساتھ آن ملا۔

ان دونوں نے مل کر کمبلوں کے بادبان بنائے اور لکڑی کی ایک بڑی سی پیٹی کے تختوں کو توڑ کر اور پھر انہیں لمبائی میں جوڑ کر مستول بنایا اور اسے اس سوراخ میں جما دیا جہاں کبھی مستول ہوا کرتا تھا اور اپنے بنائے ہوئے بادبان اس مستول سے باندھ دیے۔

سہ پہر کو انہوں نے آپس میں دو پارٹیاں بنا لیں اور باری باری لکڑی کے تختوں کی مدد سے کشتی کو کھینے کی کوشش کرنے لگے مگر جلد ہی تھک گئے اور بے دم ہو کر گر پڑے۔ شام کو ایک بار اور کوشش کی گئی مگر ان کے جسموں میں اتنی طاقت ہی نہیں تھی کہ اس محنت کو برداشت کر سکتے۔ ساتویں دن یہ سب کے سب انتہائی کمزوری اور ناتوانی محسوس کرنے لگے۔ جب پانی کی آخری تقسیم کا وقت آیا تو فیرن، اچانک کا طرز عمل اور حوصلہ دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ وہ اپنا حصہ لینے سے انکار کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر تقریباً زبردستی صرف اپنی مرضی سے کشتی میں سوار ہوا تھا۔ اس لیے اسے ان کے حصے کا پانی پینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

دیکھا جاتا تو یہ بڑے حوصلے اور اعلیٰ ظرفی کی بات تھی۔ خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ وہ بیمار اور ان سب سے زیادہ کمزور تھا مگر انہوں نے اسے پانی پینے پر مجبور کر دیا بلکہ اسے اس کے حصے سے بھی زیادہ دے دیا۔

اس پورے گروپ میں اپنی تکالیف اور مایوسی کے باوجود جو شخص سب سے زیادہ مستعد اور سرگرم عمل تھا، وہ سارجنٹ چارلس تھا۔ اس نے سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ سمندر میں پھینکا اور دیکھا کہ وہ کتنی دیر میں کشتی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتا ہے اور اس کی رفتار کا حساب لگا کر اس نے بتایا کہ اس وقت ان کی کشتی سمندری لہروں کے سہارے تقریباً ڈیڑھ ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس نے دو لکڑیوں کی مدد سے ایک زاویہ بنایا اور پتا نہیں کس طرح کیا کچھ کرکے یہ اندازہ لگایا کہ اس وقت وہ افریقا کے ساحل سے تقریباً سو میل شمال میں ہیں۔ وہ لوگ جو کچھ حرکت کر سکتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حرکت کی "زحمت" کر سکتے تھے، وہ اپنے آپ کو سمندری پانی سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے سروں کے گرد اپنی اپنی قمیصیں گیلی کرکے باندھ لی تھیں۔ کچھ یونانی باشندوں نے سمندر کا پانی پینے کی کوشش کی مگر ایک دو گھونٹ سے زیادہ نہ پی سکے۔ اس سے انہیں کچھ فائدے کے بجائے نقصان ہی ہوا۔ ان میں سے ایک تو کسی طرح کے پاگل پن میں مبتلا ہو کر سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی آنکھیں نچانے لگا۔

آٹھویں دن پیاس اور تھکن سے ان کی بری حالت ہو رہی تھی۔ ان کے ہونٹ پھٹنے لگے اور زبانیں متورم ہو گئی تھیں۔ یہ صرف اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے سہارے اِدھر اُدھر حرکت کر سکتے تھے۔ فیرن ہمیشہ سے یہ سنتا چلا آیا تھا کہ جب کسی کو یقینی موت سامنے نظر آ رہی ہو تو وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خواب میں دیکھتا ہے جنہیں وہ اپنے پیچھے گھر چھوڑ آیا ہے یا پھر اپنی زندگی کے خوشگوار دن یاد آتے ہیں یا جنت، دوزخ کا تصور سامنے آ جاتا ہے مگر فیرن کے ساتھ ان میں سے کوئی ایسی بات نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جب بھی کچھ سوچنے کی کوشش کرتا تو اسے اپنے خیالات محض کھانے اور ٹھنڈی شراب کے گرد گھومتے محسوس ہوتے۔ آٹھویں دن جب سورج غروب ہو رہا تھا تو انہوں نے اچانک ایک طیارے کے انجن کی آواز سنی۔

انہوں نے فوراً سفید تولیے لہرانے شروع کر دیے۔

فیرن نے کشتی کے سفید بادبان پر میلے اور سیاہ انگل ڈیزل آئل سے موٹے موٹے حروف میں لکھ دیا کہ ہمارے پاس پانی نہیں ہے۔ دراصل انہوں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس حالت میں جو بھی بحری یا ہوائی جہاز نظر آیا، وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ خواہ دوستوں کا ہو یا دشمنوں کا۔

کیونکہ اب سوال دشمن کی قید یا آزادی کا نہیں تھا بلکہ ان کی جانوں پر بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے آئل میں بھیگے ہوئے کپڑے لکڑی کے تختوں کے سرے پر باندھ کر انہیں مشعل کی شکل دے دی تھی تاکہ اگر رات کے وقت اشارہ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو انہیں جلا کر کام نکالا جائے۔

ایک سمندری طیارہ ان کے سروں کے اوپر سے اتنا نیچے آ گیا کہ وہ اس کے بازوؤں کے نیچے بنے ہوئے نشانات بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ غالباً طیارے نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اور ان کے چاروں طرف چکر کاٹنا شروع کر دیے تھے۔ پائلٹ نے انہیں دیکھ کر ہاتھ بھی لہرائے۔ جوابی طور پر انہوں نے بھی ہاتھ ہلائے۔ اپنے انگوٹھے اوپر اٹھا کر اشارے کیے اور خوشی کے جوش میں ایک دوسرے کو جھنجوڑ ڈالا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طیارہ سمندر میں اترنے والا ہے مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ ایک دم اوپر اٹھا اور رفتہ رفتہ ان کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

یہ لوگ بڑے پر امید تھے کہ طیارہ غالباً مدد لینے گیا ہے اور ایک دو گھنٹے کے اندر جنگی کشتیاں انہیں بچانے کے لیے پہنچ جائیں گی لیکن جب رات ہو گئی اور کسی کشتی کا دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آیا تو انہیں کچھ مایوسی ہوئی مگر زیادہ نہیں کیونکہ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ اگر اندھیرے کی وجہ سے وہ ان کی مدد کو اس وقت نہ آ سکے تو صبح کو ضرور آ جائیں گے مگر جب دوپہر تک بھی کہیں کوئی جنگی کشتی ان تک نہ پہنچی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ مایوس اور دلگرفتہ ہو گئے۔ اب وہ اتنے کمزور اور خستہ حال ہو چکے تھے کہ انتہائی کوشش کے بعد ہی کچھ حرکت کر سکتے تھے۔ ان کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور زبانیں اس قدر سوج گئی تھیں کہ بولنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

سفر کے ابتدائی دنوں میں جب پانی کی قلت محسوس ہونے لگی تو فیرن نے سمندری پانی کو گرم کر کے بھاپ بنانے اور پھر اس بھاپ کو مقطر پانی کی صورت میں ٹھنڈا کرنے کی تجویز پیش کی تھی مگر دوسروں نے اس کا مذاق اڑا دیا تھا اور اگر کسی نے سنجیدگی سے اس کی اس تجویز کو سنا بھی تھا تو یہ اعتراض کر کے مسترد کر دیا تھا کہ انہیں بہت زیادہ مقدار میں حرارت درکار ہوگی جو وہ اس موٹر بوٹ پر مہیا نہیں کر سکتے۔ اس موقع پر فیرن نے دوبارہ تجویز پیش کی کہ کسی خاص مقدار میں پانی حاصل کرنے کی توقع کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس خیال سے کہ ان کا دھیان بٹے اور خواہ کتنی ہی موہوم سہی مگر ایک امید ان کے دلوں میں تو پیدا ہو جائے۔

سارجنٹ چارلس یہ سنتے ہی اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھا اور کسی نہ کسی طرح رینگتے ہوئے انجن تک جا پہنچا۔ فیرن نے دیکھا کہ وہ انجن سے جڑا ہوا ایک تانبے کا پائپ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فیرن بھی آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچ گیا اور اس کی مدد کرنے لگا۔ انہوں نے ایک پیٹرول کے ٹین کو آدھا کاٹا اور اس میں سوراخ کر کے پائپ لگا دیا۔ یہ ٹین گویا مقطر پانی کے لیے تھا۔ ایک دوسرا ڈھکنے والا ٹین لے کر اس میں نصف حصے تک سمندر کا پانی بھرا۔ یہ گویا ان کا بوائلر تھا۔ اب وہ پائپ جو پہلے ٹین میں لگایا تھا، اس کا دوسرا سرا اس بند ٹین میں سوراخ کر کے داخل کر دیا۔ دونوں ٹینوں میں جہاں پائپ جوڑا تھا، اس کے کھلے ہوئے حصوں کو کپڑے کے ٹکڑوں سے اس طرح بھر دیا کہ بھاپ باہر نہ نکل سکے۔ پھر پائپ کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے گیلے کپڑے لپیٹ دیے گئے اور اس پر مسلسل ٹھنڈا پانی گرانے کا انتظام کیا۔

ایک چولہا بنا کر پانی سے بھرا ٹین اس پر رکھ دیا گیا اور بہت سے پھٹے ہوئے کپڑے، ٹاٹ کے ٹکڑے، انجن صاف کرنے کی ڈیزل میں لتھڑی ہوئی صافیاں اور رومال ان سب کو ڈیزل آئل میں ڈبو کر چولہے میں ڈالا اور ماچس جلا کر آگ لگا دی۔

چند منٹ کے بعد بھاپ بننا شروع ہو گئی۔ انہوں نے جوڑوں میں کپڑے ٹھونس دیے تھے پھر بھی باریک سوراخوں سے بھاپ باہر نکل رہی تھی لیکن اس کے باوصف یقیناً بھاپ کا بڑا حصہ پائپ میں جا رہا تھا۔ وہ بڑی مستعدی سے پائپ پر لپٹے ہوئے کپڑوں پر مسلسل سمندر کا ٹھنڈا پانی ڈالے جا رہے تھے۔ مزید ٹھنڈک پہنچانے کے خیال سے انہوں نے پہلے ٹین کو بھی بھیگے کپڑوں سے لپیٹ دیا۔ جب دوسروں نے انہیں یہ سب کچھ کرتے دیکھا تو پہلے تو وہ چپ چاپ بیٹھے رہے مگر جب پائپ سے بھاپ ٹھنڈی ہو کر قطروں کی صورت میں پہلے ٹین میں گرنے لگی تو وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھے اور چولہے کو برابر تیزی سے جلتا رکھنے اور پائپ پر ٹھنڈا پانی ڈالنے میں ان کی مدد کرنے لگے۔

تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش کے بعد ٹمن میں اتنا پانی جمع ہو گیا کہ ان میں سے ہر ایک کے حصے میں تین تین گھونٹ پانی آ گیا۔ پانی کی یہ مقدار قلیل ہی سہی مگر ان کی زندگی کا چراغ جلتا رکھنے کے لیے کافی تھی۔ خدا نے انہیں بچا لیا تھا۔ اب اس میں انہیں شک نہیں رہا تھا کہ آخر کار وہ سب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

وہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر غذا نہ بھی ملے جب بھی وہ اس صورت سے پانی بنا کر کئی دنوں تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس دوران میں ان کا ساحل تک پہنچنا یا کسی بحری جہاز اور جنگی کشتی وغیرہ کا انہیں دیکھ لینا لازمی تھا۔

تین راتیں قبل انہوں نے جرمن بمبار طیاروں کو نہر سویز پر بمباری کرنے کے لیے جاتے دیکھا تھا اور انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر جرمن طیارے پھر بھی رات یا دن کے دوران دکھائی دیے تو وہ ضرور انہیں سگنل دیں گے۔ خواہ اس کے نتیجے میں انہیں دوبارہ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ہی کیوں نہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کے بعد انہوں نے تین چار گروپ بنائے تھے جو رات میں جاگ کر طیاروں کا انتظار کرتے تھے۔ ساتھ ہی مشعلیں بھی تیار تھیں تاکہ فوراً ہی انہیں جلا کر مدد کے لیے اشارہ دیا جا سکے۔

رات کے ایک بجے فیرن کو ایک یونانی باشندے نے سوتے سے اٹھا کر بتایا کہ وہ کسی انجن کی آواز سن رہا ہے۔ فیرن نے کان لگا کر غور سے سنا اور اسے بھی کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کچھ طیارے ان کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے فوراً مشعلیں روشن کیں اور اسے آگے پیچھے لہرانے لگے۔

چند منٹ کے بعد انجن کی آواز پہلے سے زیادہ تیز اور زیادہ قریب سنائی دے رہی تھی۔ ان کے دل یہ دیکھ کر تقریباً دھڑکنا بھول گئے کہ رات کی تاریکی میں دو سیاہ دھبے اوپر فضا میں نہیں بلکہ سطح سمندر پر ان کی جانب بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ کچھ اور قریب آنے پر انہوں نے پہچان لیا، وہ بحری جہاز تھے۔ وہ سب اپنے خشک گلوں اور سوجی زبانوں سے جتنا بھی چیخ سکتے تھے چیخ کر مدد کے لیے پکارنے لگے۔

پھر دو اور مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ باری باری انہیں زور زور سے ہلانے لگے۔ جہاز اور قریب آئے مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ ان کی چیخ و پکار سے بالکل بے پروا اپنے راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھوں سے حسرت کے مارے آنسو بہہ نکلے۔ مایوسی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ شاید اس حد سے بھی گزرنے والے تھے۔ جسم و جان کی پوری قوت سے وہ ایک بار پھر چیخے اور اس مرتبہ سب کے سب ایک ساتھ چیخے۔ مشعلیں لہرا گئیں اور جب آخر کار انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان میں سے ایک جنگی جہاز واپس لوٹا اور اس بار بالکل ان کی سیدھ میں آگے بڑھا پھر وہ ان کی کشتی کے جتنا قریب آ سکتا تھا، آ کر رک گیا۔

”اے... تم لوگ کون ہو؟“ وہاں سے کسی نے بلند آواز میں پوچھا۔

”ہم برطانوی جنگی قیدی ہیں اور یونان سے بھاگ کر آ رہے ہیں۔“

چند لمحوں کے لیے سکوت چھا گیا پھر جہاز سے سرچ لائٹ کی روشنی ان پر ڈالی گئی۔

”کشتی پر تم لوگ کتنے افراد ہو؟“ ان سے پوچھا گیا۔

”چار انگریز، ایک پولش اور دس یونانی۔ تم لوگ کون ہو؟“

”یہ ایک برطانوی جنگی جہاز ہے جس کا نام ”جیکال“ ہے۔“ جواب ملا۔ ”تیار رہو، ہم تمہاری کشتی پر آ رہے ہیں۔“

جہاز کچھ اور قریب آیا، محفوظ زاویہ اختیار کیا اور پھر کچھ لائف بوٹس پانی میں ڈالی گئیں۔ تین تین، چار چار کر کے یہ سب لوگ جنگی جہاز پر پہنچا دیے گئے۔ لنفوس نے کشتی پر ہی رہنے کا فیصلہ کیا جسے جنگی کشتی سے باندھ کر کھینچا جا رہا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے انہیں یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ حقیقت میں یہ لوگ ساحل سے صرف چالیس میل کے فاصلے پر تھے۔

☆☆☆

ہٹلر کی زندگی میں کئی خوبصورت لڑکیاں آئیں مگر شادی بیاہ کے جھنجٹ سے وہ ہمیشہ دور رہا۔ گیلی رابن اس کی بھانجی تھی۔ اس سے شادی کرنا یوں بھی مشکل تھا پھر اسے شادی کی ضرورت کیا تھی۔ اس نے بزور طاقت گیلی کی محبت اور جوانی پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس کے قریبی دوستوں کو معلوم تھا کہ گیلی اس کی محبوبہ ہے پھر کس میں ہمت تھی کہ وہ گیلی کی طرف نظر اٹھا کر اپنی موت کو آواز دیتا۔

ہٹلر کے مخالفین کو جب اس بات کا علم ہوا کہ ہٹلر کا ڈرائیور رشوت لے کر اپنے آقا کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا تو اس سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ انہوں نے شوفر کو کئی بار بھاری معاوضہ پیش کیا تھا مگر شوفر نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ ہٹلر کے مخالفین کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ شوفر کو کسی صورت بھی نہیں بہکایا جا سکتا۔ اس لیے انہوں نے شوفر کا خیال چھوڑ دیا تھا مگر شوفر کی موت اور نئے ڈرائیور کے تقرر نے انہیں ایک بار پھر سرگرم عمل کر دیا۔

گیلی رابن پر اپنی ماں اور ہٹلر کی طرف سے اس قدر دباؤ پڑا کہ اس کی باغیانہ سرشت جلا اٹھی۔ گیلی رابن کے بچپن کا ایک دوست ویانا میں رہتا تھا۔ ہٹلر کی نظرِ کرم سے پہلے گیلی اس سے خط کتابت کرتی تھی۔ اسکول کے دنوں میں انھوں نے مستقبل کے سنہری خواب دیکھے تھے اور عہد وپیماں بھی ہوئے تھے لیکن ہٹلر کے ایک دم بیچ میں آجانے سے گیلی اور اس کے ویانا کے دوست ایلکو بینڈر کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ گیلی نے اسے خط لکھنے سے منع کردیا تھا۔

شوفر کے قتل اور گھر کی قیدِ تنہائی نے گیلی کو ایک بار پھر بغاوت پر آمادہ کردیا۔ اس نے خط بھیج کر ایلکو بینڈر کو برلن بلایا۔ گیلی کا خیال تھا کہ وہ موقع پاکر برلن چلی جائے گی یا پھر ہٹلر سے برلن کی سیر کا بہانہ کرکے ایلکو بینڈر سے ملنے کی کوشش کرے گی مگر یہ محض اتفاق تھا کہ ہٹلر ان دنوں بہت مصروف رہا۔ اس کے تمام کارندے اور ساتھی اس کے گھر پہنچ گئے۔ دن رات کانفرنسیں ہوتیں۔ ہٹلر کو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔

ان حالات میں برگ ہاف چھوڑ کر برلن جانا یا ہٹلر سے برلن جانے کی اجازت مانگنا اسے اپنی طرف سے مشکوک کرنا تھا۔ گیلی کو صبر کرنا پڑا۔ ایلکو بینڈر پورے ایک ماہ برلن میں اس کا انتظار کرکے ویانا واپس چلا گیا۔ گیلی نے خط کے ذریعے اسے اپنی مجبوریوں سے آگاہ کردیا۔

گیلی کے دل میں نفرت کی آگ بھر گئی تھی۔ وہ ہٹلر کو بہرصورت اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی تھی مگر یہ کام اکیلے اس کے بس کا نہ تھا۔ ہر طرف سے مجبور ہوکر گیلی نے ایک بار پھر نئے ڈرائیور کا سہارا لیا۔ اس نے اس پر ڈورے ڈالے۔ گیلی جیسی خوبصورت حسینہ کے ناز وغمزے دیکھ کر ایک جوان دل کیسے بچ سکتا تھا۔ ڈرائیور آہستہ آہستہ رام ہوا پھر اس نے گیلی کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

اب ہٹلر کی عدم موجودگی میں گیلی اور نئے ڈرائیور میں راز ونیاز کی باتیں ہونے لگیں۔ گیلی کی ماں فرائیو رابن یہ سب کچھ دیکھتی اور خاموش رہتی۔ اس کے لیے یہ غنیمت تھا کہ گیلی گھر کے اندر ہی الجھی ہوئی تھی۔ اس نے ماں سے باہر جانے کے لیے بھی ضد نہ کی تھی مگر جب گیلی اور ڈرائیور کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تو فرائیو رابن کو ٹوکنا پڑا۔

”گیلی! ہوش میں آؤ۔ کیا شوفر کا انجام بھول گئیں؟“ ماں نے سخت لہجے میں کہا۔

”مام! کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس قید میں گھٹ گھٹ کر مرجاؤں، کسی سے ہنسوں بولوں بھی نہیں؟“ گیلی نے اتنے درد سے کہا کہ فرائیو رابن کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔

فرائیو نے گیلی کو محبت سے گلے لگالیا۔ ”میری بچی! میں مجبور ہوں۔ یہ ظلم تجھ پر تیرا ماموں کررہا ہے۔ اس سے ٹکرانے کی طاقت نہ تجھ میں ہے اور نہ ہی مجھ میں۔“

”پھر میں کیا کروں مام؟ میں نے ایلکو بینڈر کو ویانا سے بلوایا تھا۔ وہ برلن میں میرا انتظار کرکے واپس چلا گیا ہے۔“ گیلی نے سسکی بھری۔ ”ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ کسی دن میں اپنی زندگی ختم کرلوں گی۔“

گیلی ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔ اسی وقت ہٹلر اندر آگیا اور دونوں نے اپنا غم بھول کر روتے چہروں پر مسکراہٹ سجالی۔

ہٹلر کو دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے سے پہلے ہی دو محاذوں پر سرد جنگ کا مقابلہ تھا۔ باہر اس کی چانسلری کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اندرونی محاذ پر گیلی اس کے سامنے سینہ تانے کھڑی تھی۔ شوفر کے خاتمے کے بعد ہٹلر نے یہ سمجھ لیا تھا کہ گیلی کا دماغ ٹھیک ہوگیا ہے اور گھر کی قیدِ تنہائی اس کا دماغ اور درست کردے گی لیکن شوفر کے مرنے کے بعد اس نے گیلی کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک دیکھی۔ یہ چمک صرف قاتلوں کی آنکھوں میں دکھائی دیتی ہے۔ ہٹلر یہ تو سوچ نہیں سکتا تھا کہ گیلی اس پر قاتلانہ حملے کی کوشش کرے گی لیکن اس کی دہشت زدہ نظروں سے کسی وقت کوئی بھی حرکت ممکن تھی۔

ہٹلر کا نیا ڈرائیور، سابق ڈرائیور شوفر کے انجام سے بخوبی واقف تھا مگر جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ مرد ہو یا عورت، یہ سب پر آتی ہے اور ہر ایک کو دیوانہ بناتی ہے۔ نیا ڈرائیور بھی گیلی رابن کی طرف کھنچنے لگا یا یوں کہنا چاہیے کہ گیلی کے حسن نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

نیا ڈرائیور گیلی کو بچپن سے جانتا تھا۔ جس وقت گیلی اسکول میں پڑھتی تھی، ڈرائیور کی نظر اکثر اس پر پڑتی تھی۔ اگرچہ ان دنوں نہ تو اس کی نظروں میں ہوس تھی اور نہ پیار۔ گیلی اس وقت بالکل معصوم تھی۔ اس نے ڈرائیور پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔

نئے ڈرائیور پر جب گیلی رابن کا التفات بڑھا اور ڈرائیور کو یہ پورا یقین ہوگیا کہ گیلی رابن پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہے تو اس نے بھی ایک دن کھل کر بات کرڈالی۔

”مس گیلی رابن! میں تمھیں بچپن سے جانتا ہوں۔“ ڈرائیور نے بے دھڑک کہہ دیا۔

ڈرائیور کا خیال تھا کہ گیل اس بات کی تصدیق کے لیے اس سے اور اصرار طلب کرے گی یا پھر کوئی ثبوت مانگے گی لیکن گیل نے ایسی کوئی بات نہ کی بلکہ اس نے ڈرائیور کو جو جواب دیا، اس نے اسے حیران کر دیا۔

گیل نے مسکرا کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے بہت پہلے سے پسند کرتے ہو؟''

ڈرائیور نے گیل کو حیرانی سے دیکھا۔ ''لیکن...... مس گیل! میں نے اپنی پسند کا ذکر آپ سے کب کیا ہے؟''

''مجھے مردوں کی نظر پہچاننے کا ملکہ ہے۔'' گیل کی مسکراہٹ میں قیامت کی بجلیاں سی بھر گئیں۔

ڈرائیور کی سمجھ میں نہ آیا کہ گیل کو کیا جواب دے۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہ دے سکے۔

گیل کچھ دیر ڈرائیور کو عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر خود ہی بولی۔ ''تو کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں اور تم مجھ سے نفرت کرتے ہو؟''

''نہیں، نہیں مس گیل!'' ڈرائیور ایک دم سے بوکھلا گیا۔ ''وہ دنیا کا سب سے زیادہ بدبخت انسان ہوگا جو آپ سے نفرت کا خیال بھی اپنے دل میں لا سکے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میں تم پر پوری طرح اعتماد کر سکتی ہوں؟'' گیل بلا تامل بولی۔ اسے شاید ڈرائیور کو اپنے اعتماد میں لینے کی بہت جلدی تھی۔

''مس گیل! تمہارا اعتماد میرے لیے فخر کا باعث ہو گا۔'' ڈرائیور نے بھرپور جذبات سے جواب دیا۔

یوں گیل اور ڈرائیور کی اس گفتگو نے انہیں ایک دوسرے کے بالکل قریب کر دیا اور تعلقات بڑھانے کا طویل سفر بہت مختصر ہو گیا۔ گیل نے ڈرائیور کو بہت جلد اتنا قوی دل کر دیا کہ وہ اس سے بڑے سے بڑا کام لے سکتی تھی۔

ایک دن ہٹلر کے گھر میں ایک اہم میٹنگ ہو رہی تھی۔ اس میٹنگ میں جرمنی کے تمام اہم لوگ جو ہٹلر کے حلیف تھے، شریک تھے۔ گیل کا اندازہ تھا کہ میٹنگ تین چار گھنٹے تو چلے گی اور وہ ڈرائیور سے ایک دو گھنٹے باتیں کر سکے گی۔ گیل، دونوں کے مرنے کے بعد بہت محتاط ہو گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس ڈرائیور کو خواہ مخواہ اپنی کسی بد احتیاطی کی وجہ سے ضائع کر دے۔ اس نے ڈرائیور کو ایسی جگہ بٹھایا جہاں سے میٹنگ کا کمرا اور وہاں سے باہر آنے کا دروازہ نظر آتا تھا۔

میٹنگ شروع ہوئی اور گیل ڈرائیور کے پاس آ گئی۔ ڈرائیور اس احتیاطی تدبیر سے کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ گیل نے معمول کے مطابق مسکراہٹ کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا۔

''جانتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بٹھایا ہے؟''

''نہیں مس گیل......!'' ڈرائیور نے اپنی گھبراہٹ چھپائی۔ ''میں نے تو آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔''

''ادھر اس کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھو۔'' گیل دھیمی سی آواز میں بولی۔ ''جس کمرے میں میٹنگ ہو رہی ہے... تمہیں صاف نظر آ جائے گا۔ اس بات کا قطعی امکان نہیں کہ ایڈولف (ہٹلر) میٹنگ ختم ہونے سے پہلے کمرے سے باہر آئے پھر بھی اگر ایڈولف کو میری یا تمہاری ضرورت پڑی تو ہم تک پہنچنے کا دروازہ صرف ایک ہے اور وہ دروازہ بھی صاف نظر آ رہا ہے... تم دیکھ سکتے ہو۔''

ڈرائیور نے گیل کے کہنے پر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ جس کھڑکی کے پاس وہ بیٹھا تھا، اس میں شیشے لگے ہوئے تھے جن سے باہر دور دور تک نظر آ رہا تھا پھر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی نشست ایسی جگہ تھی کہ اگر کوئی باہر سے دوربین لگا کر بھی دیکھتا تو اسے ڈرائیور نظر نہ آ سکتا تھا۔ گیل نے اپنی نشست اس سے بھی پیچھے رکھی تھی۔ ڈرائیور، گیل کی اس احتیاط یا چالاکی پر اش اش کر اٹھا۔

''میں تم سے آج بہت اہم گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔'' گیل نے بات شروع کی۔

''مس گیل! میں کسی اہم گفتگو کا بہت دن سے انتظار کر رہا ہوں۔'' ڈرائیور نے بڑی سرشاری سے جواب دیا۔

''دیکھو، پہلی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے ''مس'' نہ کہا کرو۔'' گیل بڑے کرب سے بولی۔ ''مجھے اس لفظ سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ تم میرے تمام حالات سے واقف ہو۔ جب تم مجھے القاب و آداب کے ساتھ اس لفظ سے مخاطب کرتے ہو تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم بھی ایک عام آدمی ہو۔''

''نہیں، مس......'' پھر ڈرائیور فوراً سنبھلا۔ ''گیل......! میں آقا اور ملازم کے فرق سے واقف ہوں۔ میں تمہاری بے تکلفی اور اپنائیت کو بھی سمجھتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ میری زبان سے کوئی ایسا لفظ نکلے جس سے تمہارا وقار مجروح ہو۔''

''میرا وقار......!'' گیل نے برا سا منہ بنایا۔ ''یہ وقار تو اسی دن ختم ہو گیا تھا جب ایڈولف نے مجھے محبت کے فریب میں زبردستی قید کیا تھا۔ خیر، یہ تو بھولی بسری باتیں ہیں۔ اب وہ بات سنو جو میں کہنا چاہتی ہوں۔''

''میں سن رہا ہوں گیل!'' ڈرائیور پر مدہوشی سی

urdunovels.com

...گو...

"مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ شوفر میری وجہ سے مارا گیا۔" گیلی نے بلاجھجک کہنا شروع کیا اور آگے بولی۔ "لیکن اپنی موت کا وہ مجھ سے بھی زیادہ ذمے دار ہے۔ میں اسے مسلسل روکتی رہی اور وہ مسلسل بداحتیاطی برتتا رہا۔ اس نے تو یہاں تک حد کردی کہ ایڈولف کے ساتھ جانے سے انکار کردیا اور بیماری کا بہانہ کرکے برگ ہاف میں ٹھہر گیا۔ بےوقوف! وہ ایڈولف کی سرشت اور عقل و فراست سے واقف نہ تھا اور اسی لاعلمی میں اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔"

"گیلی! میں یہ باتیں جانتا ہوں۔ ان کے دہرانے سے کیا فائدہ؟" ڈرائیور نے الجھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو وہ اہم بات بتاؤ جس کے لیے تم نے اتنا اہتمام کیا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو۔" گیلی نے ترشی سے کہا۔ "میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں کہ ایڈولف اس وقت دنیا کا سب سے عظیم انسان ہے۔ عقل اور سمجھ میں بھی اور چالاکی اور مکاری میں بھی۔ کیا تم خود میں اس قدر طاقت محسوس کرتے ہو کہ مجھے اس کے مضبوط پنجوں سے آزاد کروالو؟"

"گیلی!" اس کے سوال پر ڈرائیور نے کہا۔ "یہ حقیقت ہے کہ ایڈولف کے مقابلے میں میری کوئی حیثیت نہیں۔" اس کے لہجے میں اعتراف تھا۔ "اس کا مقابلہ تو صرف تم کرسکتی ہو۔ مجھ سے جو مدد ہوسکے گی وہ میں ضرور کروں گا لیکن میں اس بات کی وضاحت بھی کردوں کہ میں ایڈولف کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کرسکتا۔ اگر وہ غافل سو بھی رہا ہو تو میں خنجر یا پستول سے اس پر وار نہیں کرسکتا۔ گیلی! تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن تمہارا التفات دیکھ کر ایک بار میں نے ایڈولف کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک دن ایڈولف بہت پریشان تھا۔ وہ نصف شب تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ جب اسے کسی طرح سکون نہ ملا تو اس نے کوئی دوا کھائی اور بےخبر سوگیا۔ اس کے خراٹوں کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ میں پستول نکال کر دروازے کے پاس گیا۔ ایڈولف کی پشت میری طرف تھی اور میں بڑی آسانی سے پستول اس پر خالی کرسکتا تھا لیکن میرا پستول والا ہاتھ اوپر نہ اٹھ سکا اور میرے پورے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ مجھے اپنی بزدلی کا اعتراف ہے گیلی......! اور یوں میں چپ چاپ واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔"

"مجھے تمہاری بات کا پورا یقین ہے۔" گیلی نے فوراً کہا۔ "مجھے بھی ایسے کئی مواقع ملے ہیں مگر میں بھی تمہاری ہی طرح بزدل ثابت ہوئی۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ اس دیو سے کیسے نمٹا جاسکتا ہے؟" ڈرائیور نے لرزتی آواز میں کہا۔ "گیلی! اس وقت ایڈولف سامنے کے کمرے میں موجود ہے۔ وہ میٹنگ کے دوران اٹھ بھی نہیں سکتا پھر بھی مجھے معلوم ہورہا ہے کہ وہ ہمارے قریب ہی کہیں کھڑا ہوا ہماری باتیں سن رہا ہے۔ میں جب ایڈولف کو سوتے دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے کہ ایڈولف کو ایک دو آدمی نہیں مار سکتے۔" گیلی نے کہا۔ "میں نے اسی خیال سے اپنے ایک دوست کو ویانا سے بلایا تھا مگر شاید ایڈولف کو مجھ پر شبہ ہوگیا۔ اس نے مجھ پر سخت پہرا لگادیا اور خود بھی میری نگرانی کرنے لگا مگر ایڈولف کی زندگی میں تم یا میں ایک لمحے کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ میں نے بڑے غور و فکر کے بعد ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ اگر میں اس میں کامیاب ہوگئی تو میں اس کی قید سے آزاد ہوکر سکھ کا سانس لے سکوں گی۔"

"گیلی......! میں بزدل ہوں لیکن تمہیں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ تم کوئی خطرہ مول مت لو۔" ڈرائیور نے گھبرا کر کہا۔ "تم جیسی نازک لڑکی ایڈولف پر قابو نہیں پاسکتی۔"

"اگر تم میری مدد کرو تو یہ کام ضرور ہوسکتا ہے۔" گیلی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"مگر گیلی......! میں ایڈولف کو قتل نہیں کرسکتا۔" ڈرائیور نے صاف جواب دے دیا۔

"مجھے تمہاری صاف گوئی سے خوشی ہوئی۔" گیلی راہن نے برا منائے بغیر مسکرا کر کہا پھر خلاؤں میں گھورتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ "ایڈولف کو تو میں بھی قتل نہیں کرسکتی، حالانکہ اسے ختم کرنے کے لیے مجھے بہت سے مواقع حاصل ہوئے مگر میں بھی تمہاری ہی طرح بزدل ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ ایڈولف صرف کسی ایسے شخص کے ہاتھوں مارا جاسکتا ہے جس نے کبھی ایڈولف کی آنکھوں کی چمک نہ دیکھی ہو اور اس کی چالاک سرشت سے واقف نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے گیلی! اس کام کے علاوہ تمہارے لیے اور ہر کام میں کرسکتا ہوں۔" ڈرائیور کے ذہن سے خوف کے مرغولے چھٹ گئے۔ "میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں مگر کسی باعزت طریقے سے۔"

"سنو......؟" گیلی نے سرگوشی کی۔ "مجھے حاصل کرنا

چاہتے ہو نا؟ اور یہ ایڈولف کی زندگی میں کسی طرح ممکن نہیں۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم ایڈولف کے قتل میں ملوث ہو۔ تم اپنی ڈرائیوری کے فن میں مہارت کی وجہ سے ایڈولف کو موت کے قریب ضرور کر سکتے ہو۔"

"کس طرح؟" ڈرائیور پر پھر وحشت اور خوف طاری ہونے لگا۔

"ایڈولف کو تم پر اب تک پورا اعتماد ہے۔" گیلی نے راہ سجھانے کے انداز میں کہا۔ "وہ تمہیں دور دراز کے سفر میں ساتھ لے جاتا ہے۔ ایسے ہی کسی سفر کے دوران تم ایڈولف کی کار کو کسی جگہ صرف چند لمحوں کے لیے روک سکتے ہو۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا؟" ڈرائیور نے وحشت زدہ نظروں سے گیلی رابن کو دیکھا۔

"اس بات پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں۔" گیلی نے ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں پہلے سے بتا دوں گی کہ تمہیں ایڈولف کی کار کب، کس وقت اور کس جگہ روکنا ہے۔ تمہارے ذمے صرف یہ کام ہوگا، باقی کام دوسرے لوگ کریں گے۔"

ڈرائیور نے گیلی کو مخمور آنکھوں سے دیکھا۔ "میں تمہارے حکم کی تعمیل کروں گا گیلی......!"

"حکم نہیں، یہ درخواست ہے۔ ایک دوست کی دوسرے دوست سے تعاون کی درخواست۔" کہتے ہوئے گیلی نے کچھ اس طور مسکراہٹیں بکھیریں کہ ڈرائیور اپنے باقی حواس بھی کھو بیٹھا۔

ایڈولف ہٹلر ابھی برگ ہاف ہی میں تھا کہ اسے ایک بار پھر ایک طویل سفر پیش آیا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اس نے اپنے اس سفر کا ذکر سب سے پہلے گیلی سے کیا۔

"گیلی......! میں چند دنوں کے لیے باہر جا رہا ہوں۔" ایڈولف نے بڑی بے تکلفی سے گیلی کو بتایا۔

"پھر میں کیا کروں؟" گیلی نے بے دلی سے کہا لیکن دوسرے ہی لمحے فوراً خیال آیا کہ وہ ہٹلر سے مخاطب ہے جس کے ہاتھ میں بظاہر اس کی زندگی اور موت ہے۔

"میرا ...... میرا مطلب ہے کہ اس سفر کے سلسلے میں، میں کیا خدمات انجام دے سکتی ہوں؟" گیلی نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ بے دلی کو خوشدلی میں بدلنے کی کوشش کی۔

"تم تنہائی میں گھبرا تو نہیں جاؤ گی؟" ہٹلر نے شاید اس پر ایک خوفناک سا طنز کیا تھا یا پھر اسے ٹٹولنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ کو میری تنہائی کا اتنا ہی خیال ہوتا تو اس طرح گھر میں قید نہ رکھتے۔" گیلی کے اندر کا پکتا ہوا لاوا ضبط کے باوجود پھٹ پڑا۔

"گیلی! تم اپنے آپ کو قیدی سمجھتی ہو؟ جس سے چاہو مل سکتی ہو، میں نے تم پر پہرا نہیں بٹھایا۔"

"ماما سے زیادہ سخت پہرا اور کون دے سکتا ہے؟" گیلی نے بڑے درد سے کہا۔ "وہ آپ کی پہرے دار اور جاسوس ہیں۔"

"فراؤ رابن تمہاری ماں ہے۔ میں ماں اور بیٹی کے معاملات میں دخل نہیں دیا کرتا۔" ہٹلر نے جواب دے کر بات ختم کر دی۔

اس دن سے گیلی کے دل میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے ہزار جتن کیے کہ وہ اس سفر کے بارے میں مکمل تفصیل حاصل کر لے مگر وہ ناکام رہی۔ اسے صرف یہ معلوم ہو سکا کہ برگ ہاف سے دو سو میل کے فاصلے پر ہٹلر کے ساتھی ایک اہم کانفرنس کرنے والے ہیں مگر اس کی تاریخ کا سوائے ہٹلر کے کسی اور کو علم نہ تھا اور ہٹلر سے پوچھنے کی کس میں ہمت تھی؟ پھر گیلی نے اپنے شیدائی ڈرائیور سے اس بارے میں پوچھا مگر اس غریب کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایڈولف کسی سفر پر جانے والا ہے۔

☆☆☆

جرمنی کی چانسلری کے لیے ایڈولف ہٹلر کے علاوہ ایک اور گروہ بھی سرگرم عمل تھا۔ اس نے نہ صرف گیلی رابن تک بلکہ گیلی کے دوست اور ویانا کے امیر زادے الیگزینڈر تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

گیلی رابن اور الیگزینڈر میں اگرچہ اب تک ملاقات نہ ہو سکی تھی لیکن دونوں کے درمیان بالواسطہ رابطہ موجود تھا اور انہوں نے یہ منصوبہ بنایا ہوا تھا کہ ایڈولف جب بھی کسی سفر پر روانہ ہو تو اسے راستے میں قتل کر دیا جائے۔ اس سازش میں گیلی رابن نے نمایاں کام کیا تھا۔ اس نے ایڈولف کے نئے ڈرائیور کو محبت کا فریب دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ سفر کے دوران وہ ایڈولف کی کار کو ایک مجوزہ جگہ پر لے جا کر مخالفین کو ہٹلر کے قتل کا موقع دے گا۔

ایڈولف ہٹلر اپنے سفر کا شگوفہ چھوڑ کر اس طرح خاموش ہو گیا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ گیلی اسی ادھیڑ بن میں رہی کہ ہٹلر کبھی سفر کا ذکر کرے اور وہ صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کرے مگر ہٹلر نے تو جیسے اس سلسلے میں اپنے لب ہی سی لیے تھے یا پھر وہ شاید دانستہ یہ "شگوفہ" چھوڑ کر معنی خیز خاموشی اپنائے ہوئے تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اپنے خلاف کسی خفیہ سازش کو "اخذ" کرنا چاہتا ہو مگر کوئی اس

کی یہ چالاکی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ بس اس کے منہ کھولنے کے منتظر تھے۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ دراصل ہٹلر نے اپنے سفر کا اس لیے کہا تھا کہ وہ گیلی رابن کا ردِعمل معلوم کر سکے اور یہ دیکھے کہ وہ اس سلسلے میں کس کس سے رابطہ قائم کرتی ہے مگر گیلی رابن نے اس کی تمام کوششیں ناکام بنا دیں اور ہٹلر کے دل میں گیلی رابن کی طرف سے جو بدگمانی اور خدشہ موجود تھا، وہ تقریباً ختم ہو گیا۔

جرمنی کے نئے چانسلر کے انتخاب کا زمانہ قریب آ رہا تھا اور ہٹلر کی مصروفیات اسی اعتبار سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہٹلر نے بیوی بچوں کا جھگڑا نہ پہلے پالا تھا اور نہ آئندہ اس کا کوئی ارادہ تھا پھر بھی وہ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود گیلی رابن کا خاص خیال رکھتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ یا تو اپنے احباب کی محفل گھر میں لگائے یا پھر رات کو جلد گھر واپس آ جائے۔ ممکن ہے کہ وہ گیلی پر یہ تاثر چھوڑنا چاہتا ہو کہ وہ بغیر شادی کے بھی ایک اچھے شوہر کی طرح اسے معقول وقت دے رہا ہے۔

ایڈولف ہٹلر ایک شب نو بجے کے قریب واپس آیا تو بہت تھکا تھکا معلوم ہو رہا تھا۔ گیلی رابن نے حسبِ معمول بڑی خوشدلی سے اس کا استقبال کیا۔ گیلی رابن کی ماں فراؤ تو ہٹلر سے اس قدر ڈرتی تھی کہ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی فراؤ کے پیر میں جیسے لگ جاتے اور وہ ایک ٹانگ سے پورے گھر میں بھاگتے لگتی۔

گیلی نے ماں کی مدد سے ہٹلر کے لیے کھانا لگایا۔ ہٹلر کا معمول تھا کہ وہ جب بھی گھر پر کھانا کھاتا تو گیلی رابن اور فراؤ رابن کو اپنے دائیں بائیں کھانے پر بٹھاتا اور کسی ایسی ڈش میں ہاتھ نہ ڈالتا جس میں سے ماں، بیٹی نے پہلے کچھ نہ کھایا ہو۔

کھانے کے دوران گیلی رابن نے محض ایڈولف کو خوش کرنے کے لیے کہا۔ ”ایڈولف! آج بہت تھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہو۔ تمہیں اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو گیلی!“ ہٹلر نے اس کی تائید کی۔ ”مگر بغیر سخت محنت کے انسان کوئی اعلیٰ مقام نہیں حاصل کر سکتا۔ بڑا آدمی بننے کے لیے بڑا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔“

”ایڈولف نے درست کہا۔“ گیلی نے بات بڑھائی۔ ”مگر رات تو آرام کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایڈولف کسی شب بھی پوری نیند نہیں سوئے۔ آج انہیں جلد سو جانا چاہیے تاکہ ساری تھکن دور ہو جائے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ جلد سو جاؤں۔“ ہٹلر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مگر تھکن دور کرنے کے لیے نہیں بلکہ صبح کو جلد بیدار ہونے کے لیے۔ مجھے سفر پر جانا ہے۔“

”اگر ایڈولف میری بات مانیں تو میں درخواست کروں گی کہ اپنا سفر چند دن کے لیے ملتوی کر دیں۔“ گیلی رابن نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”آپ کی صحت انہیں کسی طویل سفر کی اجازت نہیں دیتی۔“

”تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتیں گیلی!“ ہٹلر نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

”میں جانتی تھی کہ آپ میرا کہا نہیں مانیں گے۔“ گیلی رابن نے روہانسی شکل بنالی۔ ”میرے لیے کوئی حکم ہوتا ہے۔“

”تم بھی آرام کرو گیلی! میری اس قدر فکر نہ کیا کرو۔“ ہٹلر نے بڑی ملائمت آمیزی سے کہا۔ ”مجھے صبح چار بجے روانہ ہونا ہے۔ میں بیدار نہ ہوں تو تم جگا دینا۔“

”آپ بے فکر ہو کر آرام کریں۔ میں جگا دوں گی۔“

”ڈرائیور کو بھی مطلع کر دو کہ وہ چار بجے گاڑی پر بیٹھا ملے۔“

”بہتر ہے۔“ کہتی ہوئی گیلی باہر نکل گئی۔

ڈرائیور کی رہائش گاہ مکان کے باہر ڈرائنگ روم کے برابر ایک کمرے میں تھی۔ ڈرائیور سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ گیلی نے اسے ایڈولف کا پیغام دیا اور آہستہ آہستہ کچھ اور بھی کہا۔ ڈرائیور سر ہلاتا رہا۔

چلتے وقت گیلی نے سرگوشی کی۔ ”شب بخیر! یہ آخری موقع ہے اسے ضائع مت ہونے دینا۔“

”اطمینان رکھو گیلی!“ ڈرائیور نے بھی سرگوشی میں کہا اور بستر پر لیٹ گیا۔

گیلی گھر میں واپس آئی اور لباس بدلنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ شب خوابی کا لباس پہن کر وہ ایڈولف کے کمرے میں آئی۔ وہ ایک الارم والی گھڑی اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس نے گھڑی میں تین بجے کا الارم لگایا اور گھڑی کو سرہانے کی طرف فرش پر رکھ دیا پھر آہستہ سے بولی۔

”کیا ایڈولف سو گئے؟“

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو گیلی بھی اپنے بستر پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ جاگ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں خیالات کا ایک طوفان تھا۔ اپنے طور پر اس نے وہ سب کچھ کر لیا تھا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس نے لباس تبدیل کرنے کے دوران خفیہ آلے سے ایڈولف کے دشمنوں کو اس کی روانگی

urdunovels.com

کی اطلاع دے دی تھی۔ ڈرائیور کو بھی ایک خاص جگہ گاڑی روکنے کی تاکید کر دی تھی۔ اسے امید تھی کہ اگر کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی تو وہ آج اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی اور اس کی یہ زبردستی کی قید ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔

آزادی کے خیال سے گیلی کے دل میں خوشی کی ایک لہر پیدا ہوئی اور اسی مسرت کے عالم میں وہ جانے کس وقت حسین خوابوں کی آغوش میں پہنچ گئی۔

ایڈولف ہٹلر اس رات معلوم نہیں سویا کہ نہیں۔ رات کے کسی وقت وہ ایک دم اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ ہٹلر نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، ایک پستول جیب میں رکھا اور دوسرے پستول کو موزے میں رکھ کر اس پر ربر کا فیتہ چڑھا دیا پھر اس نے گیلی پر نظر ڈالی۔ گیلی جوانی کی نیند میں مدہوش تھی۔ اگرچہ اس کی جوانی مغموم اور کچلی ہوئی تھی مگر سرشاریاں اور مدہوشیاں تو جوانی کی خصوصیت ہیں۔ ہٹلر کا دل بے چین ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ گیلی پر الوداعی محبت کر دے لیکن احتیاط نے اس کے قدم پکڑ لیے اور وہ خاموشی سے باہر آ گیا۔

ڈرائیور نے کار میں تیل پانی بھر دیا تھا۔ وہ ابھی سیٹ پر بیٹھا اسٹیئرنگ پر سر رکھے سو رہا تھا۔ ہٹلر نے اسے آہستہ سے جگایا۔ ڈرائیور نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے فوراً گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف سوا دو بجے تھے۔

"آقا......! ابھی تو صرف سوا دو بجے ہیں؟" ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے کہہ ہی دیا۔

"ہاں، گاڑی اسٹارٹ کرو مگر شور نہ ہونے پائے۔" ہٹلر یہ حکم دے کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور کا دماغ الجھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہٹلر نے دو گھنٹے پہلے ہی اپنا سفر کیوں شروع کر دیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ کہیں ہٹلر کو سازش کی بھنک تو نہیں پڑ گئی؟ یہ سوچتے ہوئے اس کا بدن کانپ اٹھا۔ گھر سے تھوڑی دور ایک چوراہا تھا۔ ڈرائیور آہستہ آہستہ گاڑی چلاتا ہوا چوراہے پر آ گیا۔

"بس منٹ گاڑی لے چلوں میرے آقا؟"

ڈرائیور نے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"بائیں جانب گاڑی موڑ دو۔"

"رفتار کیا رکھوں میرے آقا؟"

"معمول کی رفتار...... کوئی جلدی نہیں ہے۔"

ڈرائیور نے معمول کی رفتار سے بھی کم رفتار پر گاڑی چلانا شروع کر دی لیکن اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اگر وہ اس رفتار سے چلتا رہا تو گیلی کے بتائے ہوئے مقام پر گاڑی پانچ بجے کے بجائے چار بجے پہنچ جائے گی۔ گیلی کے اندازے کے مطابق اسے وہاں چھ بجے پہنچنا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد ڈرائیور نے اپنے "فن" کا مظاہرہ کیا اور کار تھوڑی دور جا کر ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گئی۔

کار کے بند ہوتے ہی ہٹلر پچھلا دروازہ کھول کر اس تیزی سے کار سے نکلا جیسے اس نے اندر سے چھلانگ لگا دی ہو۔ کار سے نکل کر وہ بھاگتا ہوا ایک تناور درخت کے تنے کے پیچھے ہو گیا۔ ڈرائیور اس کی پھرتی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ڈرائیور نے باہر آ کر کار کا انجن کھولا اور بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔

"آقا میں شرمندہ ہوں۔ آج پہلی مرتبہ گاڑی نے دھوکا دیا ہے۔"

"گاڑی ٹھیک ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟" ہٹلر نے وہیں سے گرج کر پوچھا۔

ڈرائیور نے انجن سے منہ نکال کر ہٹلر کی طرف دیکھا۔ اسے ہٹلر تو نظر نہ آیا لیکن پتوں سے چھنتی ہوئی چاندنی میں اسے ایک پستول کی نال ضرور نظر آئی۔ ڈرائیور پر خوف طاری ہو گیا۔

"صرف پندرہ، بیس منٹ درکار ہوں گے آقا!"

ڈرائیور نے جواب دے کر اپنا سر پھر انجن پر جھکا دیا۔ ٹھیک بیس منٹ کے بعد ڈرائیور کو ایڈولف کی آواز سنائی دی۔ "کار اب تک ٹھیک کیوں نہیں ہوئی؟"

ڈرائیور نے محسوس کیا کہ ہٹلر کی آواز کسی اور جگہ سے آئی ہے۔ اس نے انجن سے سر نکال کر ادھر دیکھا۔ ہٹلر اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے خوفزدہ سی آواز میں کہا۔ "صرف دس منٹ اور لگیں گے آقا!"

"اگر دس منٹ میں کار نہ چل سکی تو میرا پستول تم پر خالی ہو جائے گا۔" ہٹلر کی آواز بالکل قریب سے آئی۔

ٹھیک پانچ منٹ میں کار ٹھیک ہو گئی۔

"آقا تشریف لائیے۔ کار ٹھیک ہو گئی ہے۔"

ہٹلر پستول تانے اس کے قریب آیا۔ اس نے پہلے ڈرائیور کی تلاشی لی۔ جب اسے ڈرائیور کی جیبوں سے کوئی چیز نہ ملی تو وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار پھر فراٹے بھرنے لگی۔

کچھ دیر بعد کار ایک ایسی سڑک سے گزر رہی تھی جس کے کنارے بجلی کے کھمبوں پر تیز بلب جل رہے تھے۔ ہٹلر کے ہاتھ میں اب تک پستول تھا۔ معاً اس کی نظر ڈرائیور کے

سامنے لگے ہوئے شیشے پر پڑی۔ اس شیشے سے اسے ڈرائیور کا پورا چہرہ نظر آیا۔ کہتے ہیں کہ ہٹلر بہت بڑا قیافہ شناس تھا۔ اسے پتا نہیں ڈرائیور کے چہرے میں کیا چیز نظر آئی کہ اس نے فوراً پستول ڈرائیور کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

"گاڑی روک دو۔" ہٹلر نے گرج دار آواز میں حکم دیا۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی رک گئی۔

"نیچے اترو۔" یہ ایڈولف ہٹلر کا دوسرا حکم تھا۔

ڈرائیور لرزتا ہوا نیچے اتر گیا۔ ہٹلر اس کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ ہٹلر نے پستول اس کے سینے کی طرف تان لیا اور بولا۔ "تمہاری زندگی بچ سکتی ہے، بشرطیکہ تم سچ سچ بتا دو۔"

"آقا میں...... میں بے قصور ہوں۔" ڈرائیور سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔

"میں یہ نہیں پوچھتا کہ قصوروار کون ہے۔" ہٹلر نے سختی سے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟"

ڈرائیور جواب نہیں دے سکا۔

"میں تین تک گنتی گن رہا ہوں۔" کہتے ہوئے ہٹلر نے پستول اس کے سینے کے اور قریب کر دیا۔ "اگر اس دوران میں تم نے جواب دے دیا تو ٹھیک ہے ورنہ پھر میں تمہاری زندگی کا ذمے دار نہ ہوں گا۔"

ہٹلر نے ایک پھر دو کہا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیور اس کے پیروں پر گر گیا۔

"آقا! مجھے شوٹ کر دیجیے۔ میں نے آپ سے غداری کی ہے۔" ڈرائیور اس کے قدموں میں گر کر گڑگڑایا۔

"کھڑے ہو جاؤ۔" ہٹلر نے حکم دیا اور پستول بڑی بے پروائی سے جیب میں ڈال لیا۔ ڈرائیور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔

"تمہیں کس نے بہکایا ہے؟ صاف صاف بتا دو۔"

"آپ کے سیاسی مخالفوں نے آقا!" ڈرائیور نے روتے ہوئے کہا۔ "اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے فوراً گولی مار دیجیے۔"

ہٹلر پرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچے سوچتا رہ گیا۔ ساتھ ہی اس کی بھانپتی ہوئی نظریں ڈرائیور کے روتے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

سوویت، جرمن سرحد پر دریائے اورا کے کنارے ایک قصبہ تورا گ تھا۔ کرنل کوزنسوف نے لینن گراڈ کے تحفظ کے لیے جو اسپیشل ملٹری کمان بنائی، اس کے منصوبے میں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسم کی ہر لمحہ بدلتی رنگینی

اپریل سے شمارے کی جھلکیں

آرکائیو

پہاڑی علاقے میں پرسکون و خوش رہنے والے مکینوں کے ساتھ پیش آنے والے سنسنی خیز واقعات کی ہوش رُبا داستان......

احمد نعمان شیخ کے قلم سے

سربکف

ماضی کی دھندلی پرچھائیوں کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے کردار کی پُراسرار داستان......

طاہر جاوید مغل کے قلم سے

دہر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی

حسام بٹ کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

چار دوستوں کا دلفریب راستوں پر سفر جسم و جاں کو جکڑ لینے والا سحر...... **زویا صفوان** کی منفرد تحریر

دوسرا رنگ

ملک دشمن عناصر کے خلاف سینہ سپر ہو جانے والے مجاہدوں کا معرکۂ حق و باطل

مظہر سلیم ہاشمی کی دلچسپ کہانی

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں ... کہانیاں

urdunovels.com

اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی مگر یہاں اکیس جون کی شام تک باضابطہ سرخ فوج کا ایک سپاہی بھی نہ تھا۔ صرف اسپیشل سرحدی پولیس کے دستے متعین تھے۔ دشمن کے سیلِ رواں کے آگے ان کا جو حشر ہونا چاہیے تھا ظاہر ہے کہ سرحدوں سے دور جن اندرونی علاقوں میں قلعہ بندیاں نامکمل تھیں اور جس رفتار سے کام ہو رہا تھا وہ 1942ء اور 1943ء میں بھی مکمل نہ ہو سکتی تھیں۔ جو مکمل تھیں وہاں 22 جون کی شام تک چند توپوں کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا اور یہ توپیں بھی ماسکو سے معائنے پر آنے والے افسروں کو دکھانے کے لیے تھیں پھر جنرل کوزنٹسوف کے پاس سرے سے کوئی دفاعی منصوبہ ہی نہ تھا۔ ہوتا بھی کیوں؟ ماسکو کی اسٹریٹجی یہ تھی کہ جنگ دفاعی نہیں، جارحانہ تھی۔ دوسروں کی سرزمین میں لڑی جائے گی اس لیے سوویت ہائی کمان نے صرف جارحیت کے منصوبے تیار کر رکھے تھے۔ مگر جس قسم کا اسلحہ سوویت فوج کے پاس تھا، اس سے جارحانہ جنگ لڑنے کا تصور بھی خاصا دلچسپ تھا۔ کوزنٹسوف کے 1150 ٹینکوں میں سے 1045 ٹینک پرانے ماڈل کے تھے اور ان میں سے بھی 75 فیصد مرمت کے قابل تھے۔ تین چوتھائی طیارے پرانے اور غیر کارآمد تھے۔ توپیں مشینی ٹرانسپورٹ سے محروم تھیں اور اتنی طاقتور نہ تھیں کہ جرمن توپ خانے یا ٹینکوں کا مقابلہ کر سکیں۔ بارھویں مشینی کور کے سولہ فیصد ٹینک خراب پڑے تھے اور انہیں درست کیا جا رہا تھا۔ تیسری کور میں یہ شرح پینتالیس فیصد تھی۔ ایک جائزے کے مطابق شمال مغربی محاذ پر تیس ڈویژنوں میں سے صرف پانچ ڈویژن پوری طرح ہتھیار بند تھے۔ باقی ماندہ پندرہ سے تیس فیصد کا معیار، افراد اور اسلحہ دونوں اعتبار سے پست تھا۔ ہوائی اڈوں کی حالت بھی قابلِ رشک نہ تھی۔ نئے ابھی نامکمل تھے اور پرانے مرمت طلب۔ بم کے گولوں، بارود اور اسپیئر پارٹس کی بری طرح قلت تھی۔ پوری سوویت فوج کا یہی حال تھا۔

یہ تو سوویت فوج کے سروسامان اور جنگی طاقت کا منظر تھا۔ خود فوج کی اپنی حالت بھی نہایت پتلی اور افسوسناک تھی۔ اسٹالن نے اسے "مرض" (PURGET) دے کر تباہ کر دیا تھا۔

1937-38ء میں جو مرض دیا گیا، اس نے فوج کے تجربے کار اور تربیت یافتہ افراد کا بالکل صفایا کر دیا۔ عوام کے دشمنوں کو ختم کرنے کی اس مہم میں پانچ میں سے تین مارشل، بحریہ کے چار کمانڈروں میں سے دو اور آرمی کورز کے تمام اعلیٰ کمانڈر گولی مار کر ہلاک کر دیے گئے۔ تقریباً ہر ڈویژن کا کمانڈر یا تو گولی کا نشانہ بن گیا یا اسے سائبیریا کے سرد جہنم میں دھکیل دیا گیا۔

رجمنل کمانڈروں، ملٹری کونسلوں کے ارکان اور ملٹری ڈسٹرکٹوں کے سیاسی سربراہوں کی نصف تعداد اس طرح غائب ہو گئی کہ کچھ پتا نہ چلا، انہیں زمین کھا گئی یا آسمان اچک لے گیا۔ مختلف کورز، ڈویژنوں اور بریگیڈوں کے فوجی کمیساروں کی اکثریت برطرف کر دی گئی۔ ایک تہائی رجمنل کمیسار "گم" ہو گئے۔ کل کتنے لوگوں کا صفایا ہوا، اس کا اندازہ کسی زندہ سلامت بچ رہنے والے افسر کو نہ تھا۔ موٹا سا تخمینہ یہ تھا کہ سرخ فوج کے پینتیس ہزار افسروں میں سے ایک تہائی افسر گرفتار کر لیے گئے۔ اونچی صفوں میں گرفتاریوں کی فیصد شرح اور بھی زیادہ تھی۔ اس وحشیانہ "مرض" کے نتائج ہر جگہ دیکھے جا سکتے تھے۔

1940ء کے آغاز میں تقریباً ستر فیصد ڈویژنل کمانڈروں، ستر فیصد رجمنل کمانڈروں اور ساٹھ فیصد سیاسی کمیساروں کو ترقی دی گئی۔ اسی سال موسم خزاں میں 225 رجمنل کمانڈروں کے جائزے سے انکشاف ہوا کہ ایک افسر نے بھی اعلیٰ فوجی درسگاہ کا کورس پورا نہیں کیا۔ صرف پچیس افسروں نے ہائی اسکول گریڈ کی ملٹری اکیڈمی میں تربیت پائی تھی اور دو سو افسر وہ تھے جنہوں نے جونیئر لیفٹیننٹ بننے کا کورس مکمل کیا تھا۔ پوری سوویت فوج میں صرف سات فیصد افسروں نے اعلیٰ فوجی تعلیم پائی۔ 37 فیصد نے تو کسی فوجی تربیتی ادارے کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔

1938ء میں لیفٹیننٹ جنرل ایس کے کالنین سائبیریا کے ملٹری ڈسٹرکٹ کا کمانڈر بن کر نوفوی برسک پہنچا تو یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ ایک کیپٹن ڈسٹرکٹ کمانڈر کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ یہ کیپٹن پورے ملٹری ڈسٹرکٹ کی کمانڈ کا واحد سب سے بڑا افسر تھا جو اسٹالن کے "مرض" سے بچ نکلا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل کالنین کو اپنا منصب سنبھالے چند روز ہی گزرے تھے کہ سیکیورٹی پولیس (N.K.Y.D) کے دو آدمی سیاسی انتظامیہ کے سربراہ کیپٹن بوکلفن کے پاس آئے جس نے اسی روز چارج لیا تھا اور کالنین کی گرفتاری کے احکام پیش کیے۔ وہ تو کیپٹن بوکلفن فوراً ماسکو گیا اور خطرہ مول لے کر اس نے کالنین کو بچا لیا ورنہ اس کا حشر بھی وہی ہوتا جس سے اس کے پیشرو دوچار ہو چکے تھے۔

عین اس وقت جب دشمن روس کی سرزمین کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، مرض کا عمل جاری تھا اور سوویت فوج

جس کے بہترین تجربہ کار افسر پہلے ہی ختم ہو چکے تھے، بچے کھچے کمانڈروں سے محروم ہو رہی تھی۔

ایسی تباہ حال، شکستہ دل اور بے سروساماں فوج سے دشمن کے امڈتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کیونکر ممکن تھا۔ چنانچہ وہ ہر محاذ پر پسپا ہو رہی تھی۔ 128 واں ڈویژن تہس نہس ہو گیا تھا اور اس کا اسٹاف گرفتار۔ آٹھویں فوج کی حالت نہایت خراب ہو چکی تھی۔ 48 انفنٹری کا مکمل طور پر صفایا ہو گیا تھا، ذرائع مواصلات تباہ ہو چکے تھے، جو فوجیں جرمن طوفان کی زد میں تھیں ان کا کچھ پتا نہ تھا۔ پہلے ہی روز سوویت ایئرفورس کے بارہ سو طیارے ضائع ہو گئے تھے جن میں 900 زمین پر اور 300 فضائی لڑائیوں میں تباہ ہوئے۔ جرمن فضائیہ کو صرف دس طیاروں کا نقصان اٹھانا پڑا۔

22 جون کو دوپہر کے وقت جب روس کی دفاعی قلعہ بندیاں ریت کے گھروندوں کی طرح زمین بوس ہو رہی تھیں اور جرمن فوجوں کا طوفانِ بلاخیز سیکڑوں میل اندر شہروں اور قصبات کو اپنی لپیٹ میں لیتا روس کے قلب کی طرف بڑھ رہا تھا، وزیرِ خارجہ مالوٹوف کی آواز ریڈیو پر بلند ہوئی۔ گلیوں، پارکوں، دکانوں اور کارخانوں میں مجمع لوگوں نے آواز پر کان لگا دیے۔ مالوٹوف کی آواز سپاٹ اور جذبات سے خالی تھی۔ البتہ لگتا ہے یہ کہ ہلکا سا ارتعاش اس کے قلبی اضطراب کی غمازی کر رہا تھا۔

"مردو، عورتو، سوویت یونین کے شہریو! سوویت حکومت اور اس کے سربراہ کامریڈ اسٹالن نے مجھے اعلان کرنے کی ہدایت کی ہے کہ جرمن فوجوں نے کسی اشتعال اور سبب کے بغیر اور معاہدۂ امن کے باوصف ہمارے ملک پر حملہ کر دیا ہے اور جرمن فضائیہ زیدومیر، کیف، سیواسٹوپل، کوناس اور دوسرے شہروں پر بمباری کر رہی ہے۔ حکومت سوویت یونین کے شہریوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ عظیم و جلیل بالشویک پارٹی، سوویت حکومت اور عظیم راہنما کامریڈ اسٹالن کے گرد جمع ہو جائیں۔ ہمارا مقصد انصاف پر مبنی ہے۔ دشمن کو کچل دیا جائے گا۔ فتح ہماری ہوگی۔"

تقریر ختم ہو گئی۔ بہت کم لوگوں کو خیال آیا کہ کامریڈ اسٹالن نے خود شہریوں سے خطاب کیوں نہیں کیا؟ اور یہ تو کسی کو خبر نہ تھی کہ عظیم ارضی دیوتا اس نازک مرحلے میں اپنی اعصابی قوت کھو بیٹھا ہے اور اب اپنے بندگان بے کس سے مخاطب ہونے میں اسے کئی ہفتے لگیں گے۔

افواہیں آخرکار درست ثابت ہو گئیں۔ جنگ چھڑ چکی تھی۔ لینن گراڈ کے لوگ بیس سال کے تلخ تجربوں سے اچھی طرح جان چکے تھے کہ بحران اپنے دامن میں کیا کچھ لاتا ہے۔ یوں ان کا پہلا ردِعمل یہ ہوا کہ دکانوں اور بینکوں کے آگے لمبی قطاریں لگ گئیں۔ لوگ اشیائے خورد و نوش خریدنے اور بینکوں میں جمع شدہ چھوٹی بڑی رقوم نکلوانے لگے۔ تین بجے تک بینک بند ہوئے تو کرنسی ختم ہو چکی تھی۔

اگلے روز (پیر) چھٹی تھی۔ منگل کو بینک کھلے تو پھر وہی ہجوم تھا مگر اس روز حکومت نے پورے ملک میں پابندی لگا دی کہ کوئی شخص ایک مہینے میں دو سو روبل سے زیادہ رقم نہیں نکلوا سکتا۔ اشیائے خورد و نوش کی دکانیں کھلی رہیں اور خریداری کا وہی عالم تھا۔ لوگوں نے گھروں میں جو جمع پونجی چھپا رکھی تھی، وہ بھی نکال لائے۔ وہ لوگ خوراک کے بنڈل بے، مکھن، چکنائی، خشک گوشت، ساسیج، آٹا، نمک اور ماچسیں بے تحاشا خرید رہے تھے۔ ہر شخص ذخیرہ کر رہا تھا۔ آنے والے دن نہ جانے اپنے جلو میں کیا لے کر آ گئیں؟ یہی ہول سب کو کھائے جا رہا تھا۔ لوگوں نے شراب تک کا ذخیرہ کر لیا۔ لینن گراڈ ہی کی نہیں، سارے ملک کی یہی حالت تھی۔

لینن گراڈ کا ایک فوری ردِعمل اور بھی تھا۔ کیا دانشور اور کیا عام پڑھے لکھے باشعور آدمی، جن لوگوں نے بھی جرمن حملے کی خبر سنی، ہر ایک کے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ پورا ملک گزشتہ سترہ سال سے بالشویک حکومت کی دہشت، ظلم و ستم اور درندگی کا شکار ہو رہا تھا۔ انقلاب کے نام پر لوگوں کو جو سہانے سپنے دکھائے گئے، وہ سب ٹوٹ چکے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ماضی کے شب و روز پھر رہے تھے۔ جب سیکرٹ پولیس (N.K.V.D) کے آدمی رات کے پچھلے پہر شہریوں کو نکال کر لے جاتے اور پھر مدتوں بعد ان کے وارثوں کو پتا چلتا کہ وہ کسی لیبر کیمپ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو چکے ہیں۔ دو کروڑ آدمی اس وقت بھی سائبیریا کے سرد جہنم اور لیبر کیمپوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ 1937-38ء کے زخم تو ابھی تک رس رہے تھے۔ روس بھر میں شاید ہی کوئی خوش قسمت گھرانا ایسا ہوگا جو اسٹالن اور بالشویک نظام کے لگائے ہوئے زخموں سے محفوظ رہا ہو۔ لینن گراڈ سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔ کیروف کے قتل کے بعد تو گویا اس کی شامت آ گئی تھی۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے ہزاروں افراد غائب ہو چکے تھے۔ ہر گھر سے گھٹی گھٹی آہوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایسی حالت میں دلوں میں مسرت کی لہر کا دوڑ جانا بالکل فطری بات تھی۔

ہر باشعور شخص کا پہلا تاثر یہ تھا کہ اس خبیث ترین نظام سے نجات پانے کے دن قریب آ گئے ہیں۔ جرمن

انہیں اس کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے آرہے ہیں۔ وہ سب محبِ وطن تھے۔ کوئی بھی اپنے ملک کی شکست کا خواہاں نہ تھا مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس شکست کے نتیجے میں ایک ظالم حکومت کا تیاپانچا ہو جائے گا۔ وہ ظالم حکومت جو دو عشروں سے پوری قوم کو اپنے بے رحم قدموں تلے پامال کررہی ہے لیکن یہ مسرت محض عارضی تھی۔

اگلے ہی لمحے انہیں احساس ہوا کہ جس حملہ آور سے انہوں نے نجات کی امید وابستہ کی ہے، وہ خود ویسے ہی ایک خبیث نظام کا علمبردار ہے۔ ان میں سے اکثر نے ہٹلر کی کتاب "مائن کامف" (میری جدوجہد) پڑھی تھی۔ نازیوں نے برسرِاقتدار آنے کے بعد اپنے ملک میں جو کچھ کیا تھا اور اب مقبوضہ ملکوں میں کررہے تھے، وہ اس سے بھی باخبر تھے۔ انہوں نے سوچا جب اسٹالن اور ہٹلر دونوں ہی خبیث نظاموں کے خبیث نمائندے ہیں تو پھر اپنوں کی خباثت کو غیر کی خباثت پر ترجیح کیوں نہ دی جائے۔ اپنوں کی خباثت سے تو کسی وقت بھی نجات مل سکتی ہے مگر ہٹلر کی خباثت ہی کو نہیں، اس کی غلامی کے جوئے کو بھی اپنانا ہوگا۔ غلامی کا جوا، جو اپنے ساتھ بدترین ظلم وستم اور ذلت ورسوائی لے کر آئے گا۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی مسرت کی یہ لہر دم توڑ گئی۔

حب الوطنی کا جذبہ انگڑائی لے کر جاگ اٹھا تھا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ دشمن کو اپنے شہر میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ لہٰذا روس پر جو اچانک افتاد ٹوٹ پڑی تھی، اس کے ذمے دار دو آدمی تھے۔ عظیم راہنما اسٹالن اور پولٹ بیورو کا رکن اور لینن گراڈ، بالشویک پارٹی کا "باس" ژدانوف، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہی اسٹالن کا جانشین ہوگا۔ اسٹالن نے اپنے ملک کو نازی جرمنی کے ساتھ مصالحت کی راہ پر ڈالا اور پھر ہٹلر پر اس طرح اعتماد کیا کہ آخر وقت تک یہ کہتا رہا کہ وہ دغا نہیں دے گا اور اگر اس کی نیت خراب ہوئی تو میں بھاری قیمت دے کر روک لوں گا۔

ژدانوف تو جرمنی کے ساتھ مصالحانہ پالیسی اور اسی کی سیاسی ہنرمندی کا شاہکار تھا۔ جب بھی اس سے حملے کی افواہوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا۔ "ناممکن، جرمنی بیک وقت دو محاذوں پر نہیں لڑسکتا۔"

اب اسٹالن بیمار پڑا تھا اور ژدانوف کریمیا میں چھٹی منا رہا تھا۔ عظیم راہنما کے بغیر راہنمائی کرتا تو کون؟ آخر ملک میں جون کو ایک نئی سٹاؤکا (سپریم کمان) قائم ہوئی مگر یہ محض کاغذی کارروائی تھی۔ مارشل اسٹالن تو اس کے اجلاس میں شریک ہونے کے قابل ہی نہ تھا۔ دوسرے ارکان میں سے بھی کوئی شخص یہ بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ کریملن نے جنگ چھڑنے کے بعد پہلی بار کوئی واضح قدم تیس جون کو اٹھایا۔ ایک فرمان کی رو سے اسٹیٹ ڈیفنس کمیٹی وجود میں آگئی۔ اسٹالن جس کا سربراہ اور مالوٹوف، مارشل وارو شیلوف، مالنکوف اور بیریا ارکان تھے۔ اس کمیٹی کو مملکت کے تمام اختیارات حاصل تھے۔ ژدانوف کو اس سے باہر رکھا گیا اور لینن گراڈ بھیج دیا گیا۔

ابھی راتیں دم توڑ چکی تھیں۔ تاریک دن شروع ہورہے تھے۔ روسی فوجیں ہر محاذ پر شکست کھا رہی تھیں۔ روس نے اپنی سرحدیں بڑھانے اور لینن گراڈ کو محفوظ کرنے کے لیے بالٹک ریاستوں پر قبضہ تو کرلیا تھا مگر وہاں کی آبادی نے سر نہ جھکایا۔ ہزاروں شہری اور غیر کمیونسٹ پارٹیوں کے ارکان گرفتار کرکے سائبیریا بھیج دیے گئے تھے لیکن اضطراب روز بروز شدت اختیار کرتا جاتا تھا۔ جنگ کے بادل جیسے گہرے ہوتے جاتے، زیرِزمین سرگرمیوں میں اضافہ ہورہا تھا۔ روسیوں کو مورچے بنانے کے لیے مقامی مزدور درکار تھے مگر کوئی شخص بھی لائقِ اعتماد نہ تھا۔ عام شہر اور قصبے تو ایک طرف، بالٹک فلیٹ کے ہیڈکوارٹر ٹلن کے اردگرد رات کے وقت گولیوں کی بوچھاڑ اکثر ہوتی رہتی۔ کوئی اکیلا دکیلا روسی زندہ سلامت بچ کر نہ جاتا۔ جنگ شروع ہوئی تو قوم پرست اعلانیہ میدان میں آگئے اور اب روسی بری طرح گھیرے میں آچکے تھے۔ ایک طرف طوفان کی طرح بڑھتی ہوئی جرمن فوجیں تھیں اور دوسری جانب روسیوں کے ہاتھوں زخموں سے چور مقامی آبادی۔ جلد ہی ایستونیا اور لتھوانیا، روسیوں کے قبضے سے نکل گئے اور انہوں نے آزادی کا اعلان کردیا۔ جرمن افواج حیرت ناک برق رفتاری سے بڑھ رہی تھیں۔ 29 جون تک انہوں نے پسکوف، اوستروف، اور پوچکا لائن پر قبضہ کرلیا۔ یہ آخری قدرتی دفاعی لائن تھی اور اب لینن گراڈ جنوب کی طرف سے 145 سے 150 میل تک کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

21 ویں آرمرڈ دستے کا جنرل لیلیو شنکو واحد روسی افسر تھا جس نے اس ساری جنگ میں بڑی شجاعت اور ہوشمندی کا ثبوت دیا اور نازیوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ وہ زبردست نقصان اٹھانے کے باوجود ایک مہینے تک لڑتا رہا۔

روسی فوج کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ایندھن ختم ہوگیا تھا۔ ذرائع مواصلات ٹوٹ گئے تھے اور مختلف یونٹوں کا آپس میں رابطہ نہ رہا تھا۔ جنگ کے واقعات روسی جرنیلوں

کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ بریم کمان اندھا دھند احکامات جاری کر رہی تھی۔ دریائے ویلیکایا پر دفاعی لائن قائم کی جائے، کوناسی پر جوابی حملہ کیا جائے اور پھر مشرقی پریشیا پر۔ میدان جنگ کی حقیقی صورت حال سے بریم کمان بالکل بے خبر تھی۔ خفیہ اشاراتی زبان کی کلید جرمنوں کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ روسی کمانڈر، ہیڈ کوارٹرز کو ماسکو سے ملنے والے احکامات کو مشتبہ سمجھتے۔ وہ نہ تو ان کو خاطر خواہ اہمیت دیتے اور نہ ہیڈ کوارٹرز کو اپنی فوج کی حالت ٹھیک ٹھیک بتا پاتے۔

تین ہفتوں کے اندر اندر شمال مغربی محاذ پر متعین 31 سے 22 ڈویژن اپنی پچاس فیصد سے زائد طاقت گنوا چکے تھے اور وہ بھی ابتدائی دنوں کی لڑائی میں۔ دوسرے محاذوں پر اس سے بھی بری حالت تھی۔ اٹھائیس ڈویژن تو بالکل نیست و نابود ہو چکے تھے اور ستر سے زائد ڈویژن اپنی پچاس فیصد طاقت سے محروم۔ اٹھائیس جون کو تیرھویں ڈویژن کی دوسری انفنٹری کور کے کمانڈر نے مغربی محاذ سے رپورٹ کی کہ اس کے پاس نہ تو گولہ بارود، ایندھن اور خوراک ہے اور نہ سپلائی یا جگہ چھوڑنے کے لیے ٹرانسپورٹ۔ مواصلات کا کوئی بھی ذریعہ باقی نہیں رہا۔ زخمیوں کو کہاں بھیجا جائے۔ انتیس جون کو پورے مغربی محاذ پر حالت نہایت سنگین تھی۔ توپ خانے، ایندھن، خوراک، مشینی بکتر بند کے ساتھ اہم سپلائی ڈپو، گولہ بارود کے دو ہزار ویگن (کل کا 30 فیصد) پانچ ہزار ٹن ایندھن (ریزرو کا پچاس فیصد) مشینی سامان کے پانچ سو ویگن، گھوڑوں کا چار ہزار ٹن چارا (نصف ذخیرہ)، اسپتال اور انجینئرنگ کے سامان کا پچاسی سے نوے فیصد حصہ بالکل تباہ ہو گیا تھا۔

اس ہولناک شکست اور ہمہ گیر تباہی پر کریملن بھنا اٹھا۔ جنرل کوزنٹسوف کو بالٹک محاذ کی کمان سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اس نے جنگ چھڑنے کے بعد صرف دو دن کمان کی تھی کہ زخمی ہو گیا۔ سوویت روس کے فوجی مورخین شمال مغربی محاذ پر تباہ کاریوں کی ذمے داری کوزنٹسوف کی نااہلی اور عملی تجربے کے فقدان پر ڈالتے ہیں۔ تاہم اس کی اونچے حلقے سے وابستگی کام آئی اور اسے صرف سبکدوش کر دینے پر اکتفا کیا گیا۔ سزا ملی تو اس کے ہم چشموں کو جو کوزنٹسوف کے مقابلے میں کہیں کم ہولناک شکست سے دوچار ہوئے تھے۔ انہی میں کوزنٹسوف کا چیف آف اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل پی ایس کلیونوف تھا۔

سوویت کمانڈر ایک آدھ کو چھوڑ کر سب میدان جنگ میں نکمے ثابت ہوئے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ نازی فوج کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟ سوویت انفنٹری ٹینک یونٹوں کے ساتھ مل کر کوئی اقدام کرنے سے قاصر رہی پھر کسی کو خبر نہ تھی کہ (SHOCK TACTICS) استعمال کر کے اور کاری ضرب لگا کر بڑھتے جرمنوں کا رخ پلٹا جا سکتا ہے۔ لاتعداد نازی ٹینکوں اور طیاروں کے حملوں سے روسی فوجوں پر جس طرح دہشت طاری تھی، اس کا اندازہ انفنٹری کے ایک سپاہی کے بیان سے ہو سکتا ہے۔

"ہم نے اپنے حملے کا آغاز تحسین و مسرت کے نعرے بلند کرتے ہوئے کیا۔ جرمن بھاگ اٹھے لیکن پھر نہ جانے کہاں سے ان کے ٹینکوں اور طیاروں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ بڑا ہی خوفناک حملہ تھا۔ ادھر ہمارے پاس ٹینک تھے نہ طیارے، بس انفنٹری تھی۔ ایسی طاقت کے مقابلے میں ہم کیونکر ثابت قدم رہ سکتے تھے؟"

اب لینن گراڈ براہ راست خطرے میں تھا لیکن لوگ جرمنوں کی طوفانی یلغار اور سوویت فوجوں کی مکمل شکست سے بالکل بے خبر اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ روسی فوج چند روز کے اندر اندر نازی حملہ آوروں کو اپنی سرحدوں سے نکال باہر کرے گی۔ لینن گراڈ سکا یا پراودا اپنے قارئین کو خیالی کہانیاں سنا رہا تھا۔ جرمن فضائیہ کے جو پائلٹ پکڑے گئے ہیں ان کا بیان ہے جرمن سپاہی لڑنا نہیں چاہتے۔ کاکس میں نازی بحریہ کے احکام کی تکمیل کرنے کے بجائے بھاگ بھاگ کر سرخ فوج سے مل رہے ہیں۔ ان کہانیوں کی بدولت عام آدمی ہی خیالی دنیا میں نہیں کھوئے ہوئے تھے خود کرنل تک کے فوجی افسروں کو بھی کچھ خبر نہ تھی کہ محاذ جنگ پر کیا ہو رہا ہے؟ جرمن فوجیں پچیس جون تک ڈیڑھ سو میل اندر گھس آئی تھیں اور لینن گراڈ کے فوجی اس خیال میں مگن تھے کہ بس اب پانسا پلٹنے ہی کو ہے۔ سوویت پریس روسیوں کا دل بہلا رہا تھا کہ جرمن پرولتاری، ہٹلر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور سوویت روس کی فتح یابی میں مددگار بنیں گے۔ جرمن فوج کا جذبہ کچلا جا چکا ہے۔ بعض اخبار تو جنگ کو محض مذاق قرار دے رہے تھے۔ جولائی کے آخر میں ایک میگزین "لینن گراڈ" نے ایک بے تکی سی نظم شائع کی جس میں شاعر نے جنگ کو محض ایک عظیم دل لگی قرار دیا تھا۔

لینن گراڈ کے باشندوں نے جنگ کے پہلے روز ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دشمن کو شہر میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ رضا کاروں کی بھرتی شروع ہو گئی تھی۔ کارخانے کی شفٹ گیارہ گھنٹے کی کر دی گئی۔ ہوائی حملے سے بچاؤ کا کام چودہ

ہزار مزدوروں کو سونپ دیا گیا۔ لینن گراڈ روسی صنعت کا مرکز ہے۔ یہاں 520 کارخانے ہیں جن میں سات لاکھ اسی ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔ مختلف نوعیت کے ٹربائن اور بوائلرز انہی کارخانوں میں بنتے ہیں۔ یہاں ٹینک بنانے اور بھاری توپیں ڈھالنے کے بھی کارخانے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی لینن گراڈ اہم شہر تھا۔ کریملن کو انسانوں سے بھی زیادہ ان صنعتوں کی فکر تھی۔

بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ ٹینک بنانے کا پلانٹ یورال منتقل کر دیا جائے لیکن کارخانے کے مزدوروں نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”صنعتی پلانٹ یہیں رہیں گے۔ ان کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے گا اور دشمن ان کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائے گا۔“

فوجی نقطہ نظر سے بھی یہ فیصلہ تباہ کن تھا۔ جرمن طیارے مشینیں لے جانے والی گاڑی کے پرخچے اڑا سکتے تھے۔ مزدوروں کا جوش و جذبہ بہت کارگر رہا اور ٹینکوں کی پیداوار دگنی ہو گئی۔

جون کے آخر میں لینن گراڈ کی پارٹی ایگزیکٹیو نے ہدایت جاری کی۔ فیکٹریاں اور کارخانے گیارہ گھنٹے کی شفٹ کے علاوہ چار گھنٹے فوجی ڈرل کے لیے بھی مختص کر دیں۔ غالباً ژدانوف کو خبر مل چکی تھی کہ گیارھویں، آٹھویں اور ستائیسویں فوج تباہ ہو چکی ہے۔ اس نے پیپلز والنٹیئر کور قائم کرنے کا حکم دیا۔ بعد ازاں دوسرے شہروں میں بھی ایسی والنٹیئر کور وجود میں آ گئیں۔

اس عوامی فوج میں اٹھارہ سے پچاس سال تک کی عمر کے لوگ بھرتی کیے گئے۔ ابتدا میں یہ فوج مختلف ناموں سے موسوم رہی پھر مستقل طور پر ”پاپولر ڈرافٹ“ کہلانے لگی۔ شہر کے تعلیمی، صنعتی اور دفاعی مسائل طے کرنے کے لیے مختلف کمیٹیاں بنائی گئیں۔

☆☆☆

فوجی ساز و سامان کارخانوں میں بڑی تیزی سے بننے لگا۔ جولائی کے آغاز سے پانچ فیکٹریوں میں توپ خانے کا سامان، گیارہ میں اور بارہ میں ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں اور چودہ میں آگ پھینکنے والے بم تیار کیے جا رہے تھے۔ تیرہ کارخانوں میں گرینیڈ تیار ہو رہے تھے۔ ان میں کھلونے اور اسٹور بنانے کی دو فیکٹریاں بھی تھیں۔ موسیقی کے آلات اور عطریات بنانے والی فیکٹریاں ٹینک شکن بارودی سرنگیں بنانے میں مصروف تھیں۔ اگست میں شراب کشید کرنے والی بھٹیاں ایک لاکھ بوتلوں میں الکوحل

یا گیسولین بھرنے لگیں۔ جلد ہی خام سامان ملنا مشکل ہو گیا اور کارخانے بند ہونے لگے۔ اب مزدوروں کو فوج اور والنٹیئر کور میں بھرتی کر لیا گیا۔ بعض کارخانوں کی مشینیں مشرقی علاقے میں منتقل کی جا رہی تھیں۔

فوجی بھرتی زور و شور سے ہو رہی تھی۔ جنگ کے پہلے ہفتے میں دو لاکھ بارہ ہزار لینن گراڈ پیپلز والنٹیئرز میں شامل ہو چکے تھے۔ نوے ہزار پانچ افراد ان کے علاوہ تھے جنہیں پولیس کے امدادی دستوں میں بھرتی کیا گیا۔ لینن گراڈ ملٹری ڈسٹرکٹ کے کمانڈر جنرل پوپوف نے آغاز جنگ سے پہلے شہر کے جنوب میں تقریباً ایک سو میل کے فاصلے پر دریائے لوگا کے ساتھ ساتھ دوسری دفاعی لائن بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔

اب اس نے ژدانوف کی تائید سے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا اور اس کا انچارج کرنل بان چیس کی کو بنا دیا۔ جنرل پیاڈی شیف کو لوگا آپریشن گروپ کا سربراہ مقرر کیا۔ یہ ایک خصوصی فوج تھی جو لوگا لائن کے دفاع کے لیے بھرتی کی گئی۔ لینن گراڈ ملٹری کونسل نے پچیس جون کو اس منصوبے کی منظوری دی اور کام شروع ہو گیا۔

کرنل بان چیس کی نے سپلائی ڈپو کا معائنہ کیا تو صرف ستاون ہزار بارودی سرنگیں موجود تھیں جن میں اکیس ہزار ٹینک شکن تھیں۔ تین فوجوں کو ایک لاکھ سرنگوں کی ضرورت تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ روز تین ساڑھے تین ٹن ایک سملوز تیار کیا جائے۔ لینن گراڈ ایک سملوز ٹرسٹ صرف پچیس ٹن مادہ مہیا کر سکتا تھا۔

بان چیس کی نے ماسکو تار بھیجا مگر جواب آیا۔ ”مرکز کی اپنی ضروریات بھی پوری نہیں ہو رہی ہیں، تمہارے محاذ سے زیادہ اہم محاذ بھی ہیں۔ اپنے مقامی وسائل سے کام لو۔“ آخر پروفیسر اے این کوزنکوف کی ذہانت کام آئی۔ اس نے نمک کا شورہ اور لکڑی کے برادے سے اس کا بدل تیار کر لیا اور یہ کام دو کارخانوں کے سپرد کر دیا گیا۔

لینن گراڈ کی تمام آبادی لوگا لائن کی قلعہ بندیاں تعمیر کرنے میں جھونک دی گئی۔ حکم ہوا ہر بے روزگار آدمی روزانہ آٹھ گھنٹے خندقیں کھودنے اور پناہ گاہیں تعمیر کرنے میں صرف کرے۔ کارخانوں کے مزدوروں سے کہا گیا کہ وہ گیارہ گھنٹے کی شفٹ میں کام کرنے کے بعد تین گھنٹے اس کام کے لیے دیں۔ سب لوگ کام کر رہے تھے۔ دن میں چودہ، سولہ اور اٹھارہ گھنٹے تک۔ شہری تعمیرات کا کام بالکل روک کر مزدوروں کو لوگا لائن تعمیر کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔

میوزیم کا سامان بھی منتقل کیا جانے لگا۔

ہر شخص دفاعی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ تھیٹر اور اوپرا ایک بند ہو گئے اور ان میں کام کرنے والوں نے دفاعی فرائض سنبھال لیے تھے۔ ایک بات حیرت ناک تھی۔ لینن گراڈ کے شب و روز بالکل بدل گئے۔ جرائم کم ہو گئے، چوری چکاری نوے فیصد اور شراب نوشی اسّی فیصد کم ہو گئی۔ اس تبدیلی پر خود پولیس ششدر تھی۔ تاہم وہ اپنے گندے کام میں مصروف تھی۔

یکم جولائی کو یلینا سکرایابینا نے سنا اس کی عزیز دوست اور رفیق کار مادام ہلسکایا کو گرفتار کر لیا ہے۔ پولیس نے حسب معمول رات کے پچھلے پہر اس کے گھر پر چھاپا مارا، تلاشی لی اور کچھ بتائے بغیر اسے پکڑ کر لے گئی۔ غالباً اس لیے کہ اس کی (شادی کے بغیر جنم لینے والی) بیٹی کا باپ ایک فرانسیسی انجینئر تھا جو کچھ مدت لینن گراڈ میں مقیم رہا تھا۔ سکرایابینا اپنی دوست کے خاندان سے ملنے گئی جو بڑھیا ماں، تپ دق کی مریض بہن، تین سالہ ایک بچی اور ایک بھائی پر مشتمل تھا۔ اسے واپس آنے میں دیر ہو گئی تو گھر والوں نے سمجھا پولیس سکرایابینا کو بھی گرا چک لے گئی ہے۔

دانیال ہرمزنا کی ایک سنکی شاعر تھا۔ بہت اچھے شعر کہتا لیکن دو نظموں کے سوا کبھی چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ یورپی بانکوں کی سی ٹوپی اوڑھا کرتا۔ محب وطن اور رجائیت پسند تھا۔

ایک روز کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولا تو وہاں پورٹر نے بتایا نیچے صحن میں کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک جوتا اور جراب پہن رکھی تھی۔ پورے کپڑے بھی جسم پر نہ تھے۔ اسی حالت میں وہ نیچے گیا۔ وہاں ”کالی کدھ“ (پولیس ویگن) منتظر کھڑی تھی جو اسے ہڑپ کر کے جیل خانے لے گئی۔ 1941-42ء کی سردیوں میں وہ سائبیریا میں مر گیا۔

سارا شہر ہی جاسوسی کے خبط میں گرفتار تھا۔ راہ گیروں کو جاسوس قرار دے کر پکڑ لیا جاتا۔ ایک جانا پہچانا صاحب علم اسٹریٹ کار میں جا رہا تھا کہ نوجوانوں کے ایک گروہ نے گھیر لیا۔ ایک نے اس کی لہراتی ہوئی بھاری ڈاڑھی پکڑ کر کھینچی، دوسرا چیخا۔ ”یہ جاسوس ہے۔“ بےچارے نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی۔ سیکیورٹی پولیس کے آدمی گلی کوچوں میں گشت پر رہتے۔ انہوں نے نووکی میں ایک سماجی بہبود تنظیم کو پکڑ لیا۔ اس نے خاکی لباس پہن رکھی تھی اور قدرے لنگڑا کر چل رہا تھا۔ پولیس والوں کو یقین تھا کہ وہ نازی چھاتہ بردار ہے اور طیارے سے چھلانگ لگانے سے اس کے پاؤں میں چوٹ آگئی ہے۔

ایک فوٹو گرافر جارجی خومکین بھی اسی طرح پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ ڈیوٹی پر لیٹ کیا گیا تھا۔ اس نے انگلش ٹوئیڈ کی جیکٹ اور غیر ملکی طرز کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ وہ تو خیریت گزری کہ پولیس اسے فوجی ہیڈ کوارٹرز لے گئی جہاں وہ چھوٹ گیا۔ وہ اگر بہانہ بناتی تو شاید سائبیریا پہنچ جاتا۔

جیل کی ٹریفک یکطرفہ نہیں تھی۔ لوگ رہا بھی کیے جا رہے تھے اور انہیں سیدھا محاذ جنگ پر بھیجا جا رہا تھا۔ ایسے مناظر بھی دیکھنے میں آتے کہ سیکیورٹی پولیس کے سپاہی سنگینیں تانے قیدیوں کے دستوں کو ہانک کر میدان جنگ میں لے جا رہے ہیں۔ غیر فوجیوں کو قلعہ بندیاں تعمیر کرنے کے کام میں لگا دیا جاتا۔ لینن گراڈ کے جنوب مغرب اور شمال مغرب میں دفاعی لائنیں یکے بعد دیگرے ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ لوگا لائن آخری رکاوٹ تھی جہاں دشمن کو روکا جا سکتا تھا۔ تیس ہزار آدمی دن رات کام کر رہے تھے۔ یہ یا تو عام شہری تھے یا بالشویک (کمیونسٹ) پارٹی کے عام ارکان۔

پارٹی کے اعلیٰ عہدیدار بھاگ کر محفوظ علاقوں میں چلے گئے تھے۔ بالکل آخری دنوں میں طلبہ اور طالبات بھی شریک ہو گئے۔ ان لوگوں کو بے سروسامانی کی حالت میں ہاسٹلوں سے سیدھا لوگا لائن پر بھیج دیا گیا۔ جرمن طیارے نیچی اڑان سے ان پر بمباری کرتے رہے۔ ہزاروں مرد و زن اس بمباری سے مارے گئے لیکن کام پورے زور و شور سے جاری رہا۔ آخرکار لوگا لائن مکمل ہو گئی۔ پختہ مورچے بن گئے، بارودی سرنگیں بچھا دی گئیں۔ پسپا ہونے والی روسی افواج کی حالت اس قدر خستہ تھی اور مورال اتنا گرا ہوا کہ لوگا لائن پر ان کا جمنا ناممکن تھا۔

یوں اٹھارہ دن کی لڑائی میں وہ تین سو میل پیچھے ہٹ آئی تھیں۔ ان کی ساری فضائی قوت برباد ہو چکی تھی۔ یہی حال ٹینکوں، بکتربند گاڑیوں اور دوسرے ہتھیاروں کا تھا۔ فرنٹ لائن کے اٹھائیس ڈویژن چار لاکھ بیس ہزار آدمی بالکل نیست و نابود ہو چکے تھے۔ یہی نہیں، ستر سے زائد ڈویژنوں کی پچاس فیصد قوت تباہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ اب جو بھی امید تھی، چار لاکھ اکتیس ہزار رضاکاروں سے تھی جن کے سات ڈویژن وجود میں آ چکے تھے اور جنہیں فوجی افسر تربیت دے رہے تھے۔

عام رضاکاروں کی فوجی تربیت جیسی تھی سو تھی، اکثر افسر خود تربیت سے محروم تھے۔ پہلے ڈویژن کے اٹھارہ سو چوبیس کمانڈروں میں سے صرف دس کا تعلق فوج سے تھا۔

urdunovels.com

دوسرے ڈویژن کے پچاس فیصد افسر ہتھیاروں کا استعمال جانتے تھے۔ کسی ایک شخص کو بھی مورچوں کی کھدائی، کیمو فلاج، فوجی چالوں یا کمان کا تجربہ نہ تھا۔ تجربہ کار آدمی نہ ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ دوسرے ڈویژن کی آرٹلری رجمنٹ کے کمانڈر بار بار تبدیل ہوتے رہے اور کسی نے انیس دن سے زائد کمان نہ کی۔

فرسٹ ڈویژن کے کمانڈر تو لڑائی میں حصہ لینے سے کچھ ہی دن پہلے تبدیل کیے گئے۔ دس جولائی کو پہلا (گیروف) ڈویژن محاذ پر بھیجا گیا۔ ہر شخص کو دستی بم اور گیس وغیرہ سے بھری بوتلیں، ناٹولوف کاک ٹیل دی گئیں۔ رائفلیں اتنی نہ تھیں کہ ایک ایک شخص کو دے سکتے۔ پچیس فیصد مشین گنیں، تیرہ فی صد توپیں اور آٹھ فی صد مارٹر تھے۔ اکثر لوگوں نے صرف کدال، بیلچے، کلہاڑی یا شکاری چاقو اٹھا رکھے تھے۔ بعض کے پاس وہ بندوقیں تھیں جو بالشویکوں نے 1918ء کے انقلاب میں استعمال کی تھیں۔

بے شمار فوجی بالکل خالی ہاتھ تھے۔ ان کے پاس صرف بہادر دل تھے۔ دوسرے ڈویژن کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔ ان دونوں ڈویژنوں کو سب سے پہلے لوگا لائن پر مورچے جمانے کا حکم ملا۔ جلدی میں منظم کیے جانے والے رضا کاروں کو حرکت میں آتے ہی خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ بہت سے محاذ جنگ پر پہنچ ہی نہ سکے۔ ایک کمانڈر نے رپورٹ کی۔

"میرے ایک ہزار آدمیوں میں سے دو سو مارچ کے دوران بیماری، تھکن اور جسمانی کمزوری کی وجہ سے مر گئے ہیں۔"

روسی فوج کی پسپائی کے ساتھ پناہ گزینوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے جو برے حالوں میں دن رات پہنچ رہے تھے اور سڑکیں ان سے پٹ گئی تھیں۔ لوگا لائن پر کام کرنے والوں کے لیے سخت دشواری پیدا ہو گئی تھی۔ اس پر جرمن فضائیہ کی بمباری مزید آفت ڈھا رہی تھی۔ ہر جگہ افراتفری اور انتشار تھا، تاہم کام جاری تھا۔ لوگا لائن تین حصوں میں منقسم کی جا چکی تھی اور والنٹیر ڈویژن محاذ پر پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔

14 جولائی تک انہوں نے پوری لائن پر مورچے سنبھال لیے۔ ادھر دشمن بھی روسی فوجوں کا صفایا کرتے ہوئے پہنچ گیا۔ اس کے حملے کا پہلا اور دوسرا والنٹیر ڈویژن بنا جس کے جوان تھوڑی دیر پہلے ریل گاڑی سے اترے تھے۔ جرمن ٹینک گرجتے، دندناتے ایک گاؤں میں داخل ہوئے جس کی طرف رضا کار دستہ بڑھ رہا تھا۔ اچانک یوں محسوس ہوا کہ دشمن نے چاروں طرف سے ہلا بول دیا ہو۔ والنٹیر مرنے اور زخمی ہونے لگے اور پھر ساری لوگا لائن پر زبردست جنگ چھڑ گئی۔

رضا کاروں نے غیر مسلح اور نہتے ہو کر بھی نہایت سخت مقابلہ کیا۔ وہ جرمن فضائیہ اور زمینی فوجوں اور ٹینکوں کی گولہ باری کا شکار ہو رہے تھے۔ ان کی جگہ لینے کے لیے لینن گراڈ سے رضا کار دھڑا دھڑ پہنچ رہے تھے۔ ان میں عام شہری بھی تھے اور لیبر کیمپوں سے نئے نئے رہا کیے جانے والے قیدی بھی۔

دونوں متقابل فوجوں میں ہر لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق تھا لیکن رضا کار ایسی سرفروشی اور جانفشانی سے لڑے کہ جرمن افواج کی پیش قدمی رک گئی۔ رضا کاروں نے انہیں آٹھ اگست تک روکے رکھا تھا۔

ہٹلر نے لینن گراڈ میں فتح کی پریڈ کرنے کی تاریخ اکیس جولائی متعین کی تھی مگر روسی رضا کاروں کی شدید مزاحمت نے سارا پروگرام ٹھپ کر کے رکھ دیا۔ تاریخ بار بار ملتوی کی جانے لگی۔ ایک جرمن افسر نے لوگا کے حملے کو "موت کی سڑک" قرار دے دیا۔

جرمن چیف آف اسٹاف جنرل ہالڈر نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

"ہم نے دیو پیکر روسیوں کا غلط اندازہ کیا تھا۔"

لیکن آخر کار کوئی بہادری، کوئی جرأت اور کوئی قربانی نازیوں کو نہ روک سکی۔ جرمن جرنیل وان لیب نے اپنی اٹھائیس ڈویژن فوج کو از سر نو ترتیب دیا اور آٹھ اگست کو اس نے پھر سے زوردار حملہ شروع کر دیا۔

(جاری ہے)

ماخذات

ایچ پی او انگلش سیریل "کومبیٹ"، ڈائریکٹر رالڈ ہیرلڈ میسی۔ گریٹ بیٹلز، ریڈرز ڈائجسٹ (اولڈ ایشوز)۔ بک آف وار ایپل بیٹل، انگرج بورڈن

رات کے پچھلے پہر شہر کا وہ حصہ ہمیشہ جاگتا رہتا تھا جہاں ضمیر سوتے تھے۔ بارش تھم چکی تھی مگر سڑکوں پر پھیلا کیچڑ اپنے چمک رہا تھا جیسے ہر قدم پر کسی گناہ کا اعتراف پڑا ہو۔ اس نے کالر اوپر کیا، بھیگی ہوئی جیکٹ سے پانی نچوڑا اور گلی کے کونے پر کھڑے سوڈیم لیمپ کے نیچے چند لمحے ٹھٹک گیا۔ روشنی میں اس کا چہرہ واضح ہوا تو آنکھوں کے نیچے پڑے سیاہ حلقے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ نیند اس کے لیے برسوں سے ممنوع ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جس

ادھوری توبہ

طیب سنگھانوی

بعض دفعہ جرم انسان کو اس قدر پستی میں دھکیل دیتا ہے کہ اس سے نکلنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے... مگر ضمیر ایسی چیز ہے جو اسے دن رات ملامت کرتا رہتا ہے اور جب برداشت جواب دے جاتی ہے تو مجرم کو اقرار جرم اور اپنے کیے کی تلافی اسی میں نظر آتی ہے کہ وہ طاقتور لوگوں کو بھی بے نقاب کرے اور ان کے جرائم کو منظر عام پر لائے۔

اپنے جرائم پر شرمندہ ایک مجرم کی توبہ

دروازے کی طرف اس کے قدم بڑھ رہے تھے، وہ صرف لکڑی اور لوہے کا نہیں، وہ ماضی کی دہلیز ہے، جہاں سے واپس آنا کبھی کسی کے بس میں نہیں رہا۔

اس کا نام سلیم تھا۔ کبھی یہ نام اس کے لیے دعا تھا، آج سزا۔ وہ شہر کے ان چند نامعلوم لوگوں میں شامل تھا جن کے فیصلے اخبارات کے پہلے صفحے تک نہیں پہنچتے، مگر سیکڑوں زندگیوں کی سمت بدل دیتے ہیں۔ وہ خود کو محض ایک مشیر کہتا تھا، مگر اصل میں وہ ان کہانیوں کا معمار تھا جن میں انجام پہلے سے لکھا ہوتا ہے اور کردار سمجھتے ہیں کہ انہیں انتخاب حاصل ہے۔

دروازہ کھلا تو اندر سے سگریٹ کے دھوئیں اور پرانی کاغذوں کی بو نے اس کا استقبال کیا۔ کمرے میں بیٹھا شخص جسے سب حاجی صاحب کہتے تھے، ایک لمحے کے لیے چونکا، پھر مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ خوشی کی نہیں تھی، یہ اس پہچان کی تھی جو خطرے کو سلام کرتی ہے۔

"وقت پر آئے ہو۔" حاجی صاحب نے کہا۔ "یہ عادت اب کم لوگوں میں رہ گئی ہے۔"

سلیم نے جواب نہیں دیا۔ اس نے کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ کمرے کی دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک اسے اپنی نبض جیسی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر سیکنڈ کسی وعدے کی یاددہانی تھا، وہ وعدہ جو اس نے خود سے کیا تھا اور جسے وہ ہر دن توڑ دیتا تھا۔

"کام کیا ہے؟" سلیم نے سیدھا سوال کیا۔

حاجی صاحب نے فائل آگے بڑھائی۔ اندر چند تصاویر، ایک نقشہ اور ہاتھ سے لکھی چند سطریں تھیں۔ ایک نام بار بار ابھر رہا تھا...... نعمان۔ سلیم کے ہاتھ ایک لمحے کو ساکت ہو گئے۔ ناموں کی دنیا میں وہ شاذ ہی کسی نام پر رکتا تھا، مگر یہ نام اس کے اندر کہیں دھنس گیا۔

"یہ لڑکا......؟" سلیم نے پوچھا۔

"صحافی ہے۔" حاجی صاحب نے بے پروائی سے کہا۔ "غلط سوال پوچھتا ہے۔"

غلط سوال۔ سلیم نے دل ہی دل میں مسکرا کر سوچا کہ ہمیشہ غلط سوال ہی ہوتا ہے۔ وہ فائل بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں یہ نہیں کروں گا۔" اس نے کہا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ حاجی صاحب کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"نہیں کرو گے؟" آواز میں حیرت نہیں، یاددہانی تھی۔ "سلیم! ہم سب نے کچھ نہ کچھ ادھورا چھوڑا ہے، تمہاری تو یہ بھی ادھوری ہی رہی ہے۔"

یہ لفظ "ادھوری" سلیم کے اندر کہیں گونج گیا۔ وہ دروازے تک پہنچا، مگر باہر جانے سے پہلے رک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ حاجی صاحب کی آنکھوں میں وہی پرانی یقین دہانی تھی...... طاقت کی۔

"مجھے وقت چاہیے۔" سلیم نے کہا۔

"وقت......؟" حاجی صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "وقت ہمیشہ کم پڑ جاتا ہے۔"

باہر بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ سلیم نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے برسوں پہلے اسی بارش میں ہاتھ اٹھا کر معافی مانگی تھی، بغیر یہ طے کیے کہ کن گناہوں کی۔ اس نے سمجھا تھا کہ محض ندامت کافی ہوگی، مگر ندامت اگر عمل میں نہ ڈھلے تو محض خود فریبی رہ جاتی ہے۔

نعمان کی تصویر اس کے ذہن میں ابھر آئی۔ ایک جوان چہرہ، آنکھوں میں سوال اور ہاتھ میں قلم۔ وہی ہتھیار جس سے سلیم ہمیشہ ڈرتا آیا تھا۔ سلیم جانتا تھا کہ اگر اس نے قدم پیچھے کھینچا تو ماضی اسے چھوڑ دے گا، مگر مستقبل شاید معاف نہ کرے اور اگر آگے بڑھا تو وہ آخری دھاگا بھی ٹوٹ جائے گا جو اسے انسانیت سے باندھے ہوئے تھا۔

وہ چلتا رہا۔ ہر قدم کے ساتھ شہر کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں اور اس کے اندر کی آواز بلند۔ ایک آواز کہہ رہی تھی۔ "یہی موقع ہے۔" دوسری سرگوشی کر رہی تھی۔ "اب بہت دیر ہو چکی ہے۔"

گھر پہنچ کر اس نے لائٹ آن نہیں کی۔ اندھیرے میں بیٹھ کر اس نے دراز کھولی، جہاں ایک پرانی ڈائری رکھی تھی۔ اس نے آخری صفحہ کھولا۔ وہاں ایک سطر لکھی تھی، اسی کی لکھائی میں۔ "توبہ اس دن مکمل ہوگی جب قیمت ادا کرو گے۔"

سلیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ باہر بارش تیز ہو رہی تھی، کہیں دور کسی مسجد سے فجر کی اذان کی ابتدائی صدا ابھری، مگر سلیم جانتا تھا کہ یہ صدا اس کے لیے نہیں...... ابھی نہیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نعمان سے ملے گا۔ نہ حاجی صاحب کے لیے، نہ اپنے ماضی کو بچانے کے لیے، بلکہ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے جو اس نے برسوں پہلے خود سے پوچھا تھا اور جس سے وہ بھاگتا رہا تھا۔

اندھیرے میں بیٹھا سلیم پہلی بار خوفزدہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو آنے والا ہے، وہ اسے توڑ دے گا یا جوڑ دے گا اور یہی وہ نکتہ تھا جہاں سے کہانی نے اصل رخ لیا تھا۔

ایک ایسی راہ کی طرف، جہاں ہر قدم کے ساتھ توبہ یا تو مکمل ہوتی ہے یا ہمیشہ کے لیے ادھوری رہ جاتی ہے۔

فجر کی اذان مکمل ہونے سے پہلے ہی سلیم گھر سے نکل آیا تھا۔ شہر ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سوتے نہیں، صرف انتظار کرتے ہیں۔ نعمان بھی انہی میں سے ایک تھا۔ سلیم کو اس کی باتوں کی تفصیل فائل سے نہیں، اپنے تجربے سے معلوم تھی۔ صحافی وہ نہیں ہوتا جو خبر کے پیچھے جاتا ہے، بلکہ وہ جس کے پیچھے خبر چلتی ہے۔

سلیم نے گاڑی ایک سنسان سڑک پر موڑی۔ شیشے پر بارش کے قطرے بے ترتیب لکیریں کھینچ رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر لکیر اس کی زندگی کے کسی موڑ کی نمائندگی کر رہی ہو۔ کوئی سیدھی نہیں، سب ٹیڑھی۔ اس نے ریڈیو آن کیا مگر آواز فوراً بند کر دی۔ آج اسے کسی اور کی بات سننے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ برسوں بعد وہ خود سے بات کرنے جا رہا تھا۔

نعمان کا دفتر شہر کے اس حصے میں تھا جہاں کرائے کم اور سوال مہنگے ہوتے ہیں۔ پرانی عمارت، ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں اور دروازے پر لگا بوسیدہ بورڈ: تحقیقی صحافت۔ سلیم چڑھتے چڑھتے رکا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ یہاں طاقتور کے طور پر نہیں، ایک ممکنہ مجرم کے طور پر آیا ہے۔

دروازہ کھلا تو سامنے نعمان کھڑا تھا۔ آنکھوں میں حیرت نہیں تھی، جیسے وہ سلیم کا انتظار کر رہا ہو۔

"آپ دیر سے آئے ہیں۔" نعمان نے کہا۔

"میں ہمیشہ دیر سے آتا ہوں۔" سلیم نے جواب دیا۔ "اصل بات یہ ہے کہ آیا کیوں ہوں؟"

دفتر میں داخل ہوتے ہی سلیم کی نظر دیوار پر لگی تصاویر پر پڑی۔ گمشدہ افراد، نامعلوم قبریں، ادھوری فائلیں۔ یہ کوئی سجاوٹ نہیں تھی، یہ ایک چارج شیٹ تھی۔ سلیم کرسی پر بیٹھ گیا، مگر اس بار اسے کرسی بوجھل محسوس ہوئی۔

"مجھے معلوم ہے آپ کون ہیں۔" نعمان نے کہا۔ "اور یہ بھی کہ آپ کیوں آئے ہیں۔"

سلیم نے چونک کر دیکھا۔ "پھر بھی مل رہے ہو؟"

"کیونکہ آپ نے خود ملنے کا فیصلہ کیا۔" نعمان نے کہا۔ "ورنہ آپ جیسے لوگ ہمیشہ پیغام بھیجتے ہیں، خود نہیں آتے۔"

یہ جملہ سلیم کے لیے آئینہ تھا۔ وہ برسوں دوسروں کو استعمال کرتا رہا تھا، مگر آج پہلی بار اس نے خود کو استعمال کے لیے پیش کیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔

"مجھے روکو۔" سلیم نے آہستہ سے کہا۔

نعمان نے ابرو اٹھائے۔ "کس سے؟"

"خود سے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر سے گزرنے والی بس کا شور آیا، پھر ختم ہو گیا۔ نعمان نے فائل کھولی، وہی فائل جس میں سلیم کا نام بار بار آتا تھا، مگر کبھی مکمل نہیں۔

"آپ جانتے ہیں۔" نعمان نے کہا۔ "توبہ کا سب سے مشکل مرحلہ اقرار نہیں، بلکہ نقصان کی تلافی ہے۔"

سلیم نے نظریں جھکا لیں۔ اسے حاجی صاحب کی بات یاد آئی...... ادھوری توبہ۔ وہ جانتا تھا کہ وہ یہاں اعتراف کے لیے نہیں آیا بلکہ سزا اعلان کرنے آیا ہے۔

"اگر میں سب بتا دوں؟" سلیم نے پوچھا۔ "نام، تاریخیں، فیصلے...... سب؟"

نعمان نے فائل بند کر دی۔ "پھر آپ محفوظ نہیں رہیں گے۔"

"میں اب محفوظ رہنا بھی نہیں چاہتا۔" سلیم نے کہا۔

یہ جملہ کہہ کر سلیم کو عجیب سا سکون محسوس ہوا، جیسے اس نے برسوں کا بوجھ اتار دیا ہو، اگرچہ اٹھانا ابھی باقی تھا۔

نعمان کھڑا ہوا، کھڑکی کے پاس جا کر پردہ ہٹایا۔ دن پوری طرح نکل آیا تھا۔

"میں وعدہ نہیں کرتا کہ آپ بچ جائیں گے۔" نعمان نے کہا۔ "لیکن یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ سچ دفن نہیں ہوگا۔"

سلیم نے سر ہلایا۔ یہی کافی تھا۔

اسی لمحے سلیم کے فون کی اسکرین روشن ہوئی۔ حاجی صاحب کا نام نظر آیا۔ نعمان نے دیکھا، مگر کچھ نہیں کہا۔ سلیم نے کال کاٹ دی۔ پہلی بار اس نے طاقت کو جواب نہیں دیا تھا۔

"یہیں سے اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔" نعمان نے کہا۔

سلیم نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "نہیں، یہیں سے ختم ہونے لگتی ہے۔"

دفتر کے باہر قدم رکھتے ہی سلیم کو محسوس ہوا کہ شہر بدل گیا ہے یا شاید وہ خود بدل رہا ہے، مگر وہ جانتا تھا کہ تبدیلی کا اعلان نہیں ہوتا، اس کی قیمت وصول کی جاتی ہے اور قیمت اب بہت زیادہ تھی۔

دور کہیں سائرن کی آواز ابھری۔ سلیم نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے پہلی بار لگا کہ شاید اذان اس کے لیے بھی ہو سکتی ہے، اگر وہ اس راستے پر قائم رہا۔

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اصل امتحان اب شروع ہوا تھا، جہاں ہر سچ ایک نیا دشمن پیدا کرتا ہے اور ہر

urdunovels.com

اعتراف ایک نیا زخم۔ سلیم نے قدم بڑھا دیے۔ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا کیونکہ ادھوری توبہ مکمل ہونے کے لیے سب کچھ چھن جانا ضروری ہوتا ہے۔

شہر میں خبر پھیلنے میں زیادہ وقت نہیں لگا، بس کسی کو سانس لینے کا موقع ملنا چاہیے۔ نعمان نے سلیم کے دیے گئے ابتدائی نکات کو فائل میں ترتیب دیا، مگر شائع کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ جلد بازی سچ کو نہیں، صرف شور کو جنم دیتی ہے۔ سچ کو وزن چاہیے ہوتا ہے اور وزن ثبوت سے آتا ہے۔ اس نے سلیم سے کہا تھا کہ وہ کچھ دن نظر سے اوجھل رہے، مگر سلیم جانتا تھا کہ اب وہ نظر سے نہیں، نیت سے پکڑا جا چکا ہے۔

اسی شام سلیم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک میں عجلت نہیں تھی، وہی خود اعتمادی جسے وہ برسوں سے پہچانتا آیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے فہد کھڑا تھا، ایک ایسا آدمی جس کا تعارف نام سے نہیں، خاموشی سے ہوتا ہے۔ فہد کبھی کسی عہدے پر نہیں رہا، مگر ہر عہدہ اس سے مشورہ لیتا تھا۔

"تم غلط سمت میں چل پڑے ہو۔" فہد نے اندر آتے ہوئے کہا۔

سلیم نے دروازہ بند کیا، تالا نہیں لگایا۔ "میں پہلی بار سیدھی سمت میں ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

فہد نے کمرے کا جائزہ لیا۔ سادہ فرنیچر، ایک ڈائری، ایک بند بیگ۔ "تم نے ہمیشہ کم سامان رکھا۔" اس نے کہا۔ "کیونکہ تم جانتے تھے کہ کب نکلنا ہے۔"

"اب نہیں نکلوں گا۔" سلیم نے کہا۔

فہد ہنسا نہیں، مسکرایا بھی نہیں۔ "یہ ضد ہے یا توبہ؟"

سلیم نے جواب نہیں دیا۔ اس نے دراز کھولی، چند کاغذات نکالے اور میز پر رکھ دیے۔ "یہ تاریخیں ہیں، نام فیصلے۔ کچھ غلط ہو تو بتا دو۔"

فہد نے کاغذات کو ہاتھ نہیں لگایا۔ "تم نے پہلے ہی بہت کچھ غلط کر دیا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "اب درست کرنے کی ضد تمہیں لے ڈوبے گی۔"

سلیم کو حاجی صاحب کی آواز یاد آئی۔ وقت کم پڑ جاتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اب وقت نہیں، قیمت کا سوال ہے۔

"میں تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

"کس کے لیے؟" فہد نے پوچھا۔

"ہر چیز کے لیے۔"

اسی لمحے باہر بجلی چلی گئی۔ اندھیرے میں فہد کی آواز زیادہ واضح ہو گئی۔ "ہم تمہیں ایک موقع دے سکتے ہیں۔ نعمان سے پیچھے ہٹ جاؤ، فائلیں ہمارے حوالے کر دو۔ تمہاری زندگی معمول پر آ جائے گی۔"

سلیم نے اندھیرے میں آنکھیں بند کیں۔ معمول وہ لفظ تھا، جس کا مطلب وہ بھول چکا تھا۔ "معمول ہی مسئلہ ہے۔" اس نے کہا۔

فہد چند لمحے خاموش رہا پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ "تم نے خود انتخاب کر لیا ہے۔"

دروازہ بند ہوا تو سلیم نے گہری سانس لی۔ اندھیرے میں اسے اپنی ڈائری یاد آئی۔ اس نے موم بتی جلائی اور صفحہ پلٹا۔ اس بار اس نے نئی سطر لکھی۔ "قیمت وصول ہونا شروع ہو گئی ہے۔"

اگلے دن نعمان کو پہلی دھمکی ملی۔ ایک بے نام ای میل، چند جملے اور ایک تصویر، اسی عمارت کی جہاں اس کا دفتر تھا۔ نعمان نے ای میل بند کی مگر تصویر دیر تک دیکھتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ آغاز ہے، انجام نہیں۔ اس نے سلیم کو فون کیا مگر نمبر بند تھا۔

سلیم شہر چھوڑ چکا تھا، مگر بھاگنے کے لیے نہیں، وہ اس جگہ جا رہا تھا جہاں اس سے پہلی لغزش ہوئی تھی۔ ایک پرانا گودام، جہاں ایک فیصلہ ایک دستخط کے بغیر نافذ ہوا تھا اور تین زندگیاں خاموشی سے مٹ گئیں۔ گودام اب ویران تھا، مگر دیواریں یادداشت رکھتی ہیں۔ سلیم نے اندر قدم رکھا تو ماضی نے اسے پہچان لیا۔

وہیں اسے احساس ہوا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ قدموں کی آہٹ، پھر ایک سایہ۔ فہد واپس آ چکا تھا، مگر اس بار تنہا نہیں۔ دو اور آدمی، چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔

"ہم نے تمہیں موقع دیا تھا۔" فہد نے کہا۔

"میں نے بھی خود کو موقع دیا ہے۔" سلیم نے جواب دیا۔

بات لمبی نہیں ہوئی۔ شور کم، ارادے واضح تھے۔ سلیم نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ بھاگنے سے توبہ نہیں، تاخیر ہوتی ہے۔ ایک ضرب، پھر دوسری۔ درد نے اسے زمین پر گرا دیا، مگر اس کے ذہن میں نعمان کا وعدہ گونج رہا تھا...... سچ دفن نہیں ہوگا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو اندھیرا تھا، مگر یہ اندھیرا پہلے جیسا نہیں تھا۔ اس نے جیب ٹٹولی، ڈائری غائب تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر ہمتی درد میں بدل گئی۔ ڈائری چلی گئی تھی مگر باتیں نعمان کے پاس تھیں۔ یہ سوچ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

دوسری طرف نعمان نے اشاعت کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس نے پہلی قسط میں نام نہیں دیے، صرف طریقۂ کار، نقشہ اور اوقات بیان کیے۔ شہر میں ہلچل مچ گئی۔ سوالات اٹھنے لگے، وہی سوالات جن سے یہ سب شروع ہوا تھا۔

سلیم اسپتال کے بستر پر پڑا تھا، شناخت نامعلوم، مگر ضمیر واضح۔ اس نے ٹی وی پر خبر دیکھی، اپنی کہانی، بغیر اپنے نام کے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو درد کے نہیں تھے، یہ اس احساس کے تھے کہ توبہ شاید مکمل ہونے کے قریب ہے، مگر انجام ابھی باقی ہے۔

باہر پولیس کی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ طاقت نے رخ بدلنا شروع کر دیا تھا۔ سلیم جانتا تھا کہ اب ہر دن ایک نیا موڑ لائے گا یا نجات، یا آخری قیمت۔ اس نے دل میں ایک دعا کی، اس بار بغیر شرائط کے۔

کہانی اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں سچ اپنی حفاظت خود کرتا ہے اور انسان اپنی کمزوریوں کے ساتھ کھڑا رہتا ہے۔ سلیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب جو بھی ہوگا، وہ ادھورا نہیں ہوگا۔

اسپتال کی سفید دیواریں سلیم کے لیے اجنبی نہیں تھیں، مگر اس بار ان کی سفیدی میں کوئی تسلی نہیں تھی۔ کمرے میں جراثیم کش دوا کی بو پھیلی ہوئی تھی اور کھڑکی کے باہر دن کی روشنی بے حسی سے اندر جھانک رہی تھی۔ اس کے جسم پر زخموں کی ایک خاموش نقشہ گری تھی۔ ہر نشان ایک یاد دہانی، ہر درد ایک سوال، مگر اصل تکلیف جسم کی نہیں تھی، وہ اندر کہیں زیادہ گہری تھی، وہاں جہاں فیصلے جنم لیتے ہیں اور پچھتاوے پلتے ہیں۔

نرس نے آکر اس کی پٹی بدلی۔ ”آپ خوش قسمت ہیں۔“ اس نے رسمی لہجے میں کہا۔ ”وقت پر پہنچ گئے تھے۔“

سلیم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا کہ کچھ لوگ وقت پر پہنچ کر بھی برسوں دیر کر دیتے ہیں۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو نعمان کا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہی سنجیدہ آنکھیں، وہی ٹھہرا ہوا لہجہ۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ نعمان کہاں تک جا چکا ہے، مگر یہ یقین تھا کہ اب واپسی ممکن نہیں رہی۔

دوپہر کے وقت ایک اجنبی آیا۔ سادہ کپڑے، مگر نگاہ میں وہی احتیاط جو طاقت کے قریب رہنے والوں میں ہوتی ہے۔ اس نے اپنا تعارف نہیں کرایا، بس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”آپ کی شناخت ابھی واضح نہیں ہوئی۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن آپ کے معاملات خاصے واضح ہوتے جا رہے ہیں۔“

سلیم نے چھت کی طرف دیکھا۔ ”یہ دھمکی ہے یا اطلاع؟“

”یہ موقع ہے۔“ اجنبی نے جواب دیا۔ ”ریاست کو بھی کبھی کبھی توپ کی ضرورت ہوتی ہے، بس فرق یہ ہے کہ ریاست قیمت طے کرتی ہے۔“

سلیم خاموش رہا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی ذاتی جنگ اب اجتماعی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے جو کیا، اس کا حساب دینا چاہتا ہوں۔“

اجنبی نے فائل کھولی۔ ”حساب صرف عدالت میں نہیں ہوتا، کبھی تاریخ میں بھی ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کہاں کھڑے ہونا چاہتے ہیں؟“

سوال سلیم کے لیے نیا نہیں تھا، مگر آج اس کی گونج مختلف تھی۔

”سچ کے ساتھ۔“ اس نے کہا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک سال کے لیے 12 شمارے (رسالے) بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3,500 روپے
بیرون ممالک کے لیے زرسالانہ 50,000 روپے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ
مرزا ثمر عباس
0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

اجنبی نے فائل بند کی۔ "سچ مہنگا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" سلیم نے جواب دیا۔

اسی شام نعمان کی رپورٹ کی دوسری قسط شائع ہوئی۔ اس بار نام نہیں، مگر رشتے واضح تھے۔ طاقت کے حلقوں میں بے چینی پھیل گئی۔ فون بجنے لگے، ملاقاتیں طے ہوئیں اور وہ لوگ جو کبھی ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کرتے تھے، اب ایک دوسرے کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے۔ سچ نے پہلا وار کر دیا تھا اور یہ وار خاموش نہیں تھا۔

نعمان اپنے دفتر میں بیٹھا تھا، مگر آج دفتر اس کے لیے قلعہ نہیں رہا تھا۔ باہر ایک گاڑی دیر تک کھڑی رہی، پھر چلی گئی۔ اس نے نوٹ بک میں ایک سطر لکھی۔ "جب سچ حرکت میں آتا ہے تو سائے بھی متحرک ہو جاتے ہیں۔" اس نے سلیم کا نمبر ملایا...... وہ اب بھی بند تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگلا قدم خود اٹھانا ہوگا۔

اسپتال میں رات اتر آئی۔ سلیم کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، دور کہیں شہر کی بتیاں جل بجھ رہی تھیں۔ اسے اپنی ڈائری کی کمی شدت سے محسوس ہوئی، مگر پھر اسے خیال آیا کہ شاید ڈائری کا غائب ہونا ہی ضروری تھا۔ تحریر کبھی کبھی بوجھ بن جاتی ہے اور بوجھ اتارنا توبہ کا حصہ ہے۔

دروازہ آہستہ سے کھلا، نعمان اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر تھکن تھی، مگر قدموں میں تردد نہیں۔ سلیم نے چونک کر دیکھا، پھر گہری سانس لی۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" سلیم نے کہا۔

"تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔" نعمان نے جواب دیا۔ "اب یہ ذاتی نہیں رہا۔"

دونوں چند لمحے خاموش رہے، پھر نعمان نے کرسی کھینچی۔ "ہمیں تمہاری گواہی چاہیے۔" اس نے کہا۔ "کھلے نام سے۔"

سلیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جس سے وہ بھاگتا آیا تھا۔ "اس کا مطلب ہے......؟"

"یہ کہ تم بچ نہیں پاؤ گے۔" نعمان نے صاف کہا۔

سلیم نے ہلکا سا سر ہلایا۔ "پھر توبہ مکمل ہو جائے گی۔"

نعمان نے اس کی طرف دیکھا، پہلی بار اس نظر سے جو ہمدردی اور احترام کے بیچ کہیں ٹھہری ہے۔ "تم جانتے ہو لوگ تمہیں غدار کہیں گے۔"

"میں خود سے غداری نہیں کرنا چاہتا۔" سلیم نے جواب دیا۔

اسی وقت کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ وہی اجنبی افسر واپس آ گیا تھا۔ اس نے دونوں کو دیکھا، پھر دروازہ بند کر لیا۔

"وقت آ گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "یا تو ہم طریقہ کار کے مطابق چلیں، یا پھر واقعات ہمیں گھسیٹتے ہوئے لے جائیں گے۔"

سلیم نے نعمان کی طرف دیکھا۔ "جو لکھا ہے، لکھتے رہو۔"

نعمان نے اثبات میں سر ہلایا۔

اگلے دن سلیم کو ایک محفوظ مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ یہ حفاظت نہیں تھی، انتظار تھا۔ اس نے وہاں بیٹھ کر پہلی بار ماضی کے ہر فیصلے کو ترتیب سے سوچا۔ کس لمحے اس نے خاموشی کو ترجیح دی، کہاں اس نے سوال کو دبایا۔ اسے احساس ہوا کہ گناہ ہمیشہ شور سے نہیں، سہولت سے جنم لیتا ہے۔

شہر میں اب باتیں کھل کر ہونے لگیں۔ کچھ نام پس پردہ رہے، کچھ منظر عام پر آ گئے۔ طاقت کے توازن میں دراڑ پڑ چکی تھی۔ نعمان کی تیسری اشاعت کی تیاری جاری تھی۔ اس بار مکمل نقشہ اور ایک گواہ تھے۔

سلیم نے رات کو دعا کی۔ یہ دعا الفاظ سے خالی تھی، بس نیت سے بھری ہوئی۔ اسے پہلی بار لگا کہ وہ کسی نتیجے کی دعا نہیں کر رہا، بس درست ہونے کی۔

کہانی اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جہاں انجام قریب ہوتا ہے، مگر واضح نہیں۔ ہر کردار اپنے مقام پر کھڑا تھا اور ہر خاموشی ایک فیصلے کی منتظر۔ سلیم جانتا تھا کہ آخری قدم باقی ہے، وہ قدم جس کے بعد توبہ ادھوری نہیں رہے گی، چاہے زندگی ادھوری ہی کیوں نہ رہ جائے۔

محفوظ مقام کی خاموشی سلیم کے لیے نئی نہیں تھی، مگر اس بار یہ خاموشی انتظار کی نہیں، فیصلے کی تھی۔ کمرے میں ایک میز، دو کرسیاں اور دیوار پر لگی گھڑی جو وقت نہیں، انجام ناپ رہی تھی۔ سلیم کھڑکی کے پاس کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔ دھند میں لپٹا شہر یوں لگ رہا تھا جیسے اپنی ہی کہانی چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے دل میں سوچا کہ شہر بھی انسان کی طرح ہوتا ہے۔ جتنا چھپاتا ہے، اتنا ہی بے نقاب ہو جاتا ہے۔

دروازہ کھلا۔ وہی افسر اندر آیا، اس بار تنہا نہیں، اس کے ساتھ ایک عورت تھی، سادہ لباس میں مگر نگاہ میں غیر معمولی ٹھہراؤ تھا۔ اس نے اپنا تعارف نہیں کرایا، مگر اس کی موجودگی بتا رہی تھی کہ یہ لمحہ رسمی نہیں۔

"ہم نے طریقہ کار طے کر لیا ہے۔" افسر نے کہا۔

"آپ کی گواہی بند کرنے میں نہیں ہوگی۔"

سلیم نے پلٹ کر دیکھا۔ "تو پھر......؟"

"عدالتی ریکارڈ، پارلیمانی کمیٹی اور عوامی سماعت...... تینوں جگہ۔" عورت نے جواب دیا۔ "یہ آپ کی شرط تھی یا شاید آپ کی سزا۔"

سلیم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے نعمان سے کہا تھا۔ "جو لکھا ہے، لکھتے رہو۔" اب لکھا جانا باقی تھا، اس کا اپنا نام، اپنے اعمال کے ساتھ۔

اسی شام نعمان نے آخری اشاعت مکمل کی۔ اس بار کوئی استعارہ نہیں تھا، کوئی پردہ نہیں۔ نقشہ مکمل تھا، رشتے واضح اور سب سے بڑھ کر گواہی کی تاریخ درج۔ شہر میں جیسے سانس رک گئی۔ کچھ لوگوں نے چینل بدلے، کچھ نے فون بند کیے اور کچھ نے پہلی بار سوال پوچھنے کی ہمت کی۔

عدالت کے باہر ہجوم تھا۔ نعمان ایک طرف کھڑا تھا، کیمرے سے دور، مگر کہانی کے عین مرکز میں۔ سلیم کو اندر لایا گیا تو چند آوازیں ابھریں، طنز، غصہ اور حیرت۔ اس نے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج نگاہیں معنی نہیں رکھتیں، الفاظ رکھتے ہیں۔

گواہی شروع ہوئی۔ تاریخیں، فیصلے، نام سب وہی تھے جو برسوں سے فائلوں میں دبے پڑے تھے۔ سلیم کی آواز کہیں نہیں لرزی۔ شاید اس لیے کہ لرزنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ کیسے سہولت نے جرم کو جنم دیا، کیسے خاموشی نے اسے پالا اور کیسے طاقت نے اسے تحفظ کا نام دیا۔

کمرائے عدالت میں خاموشی اتری۔ یہ وہ خاموشی نہیں تھی جو دباؤ سے آتی ہے، یہ وہ تھی جو سچ سے آتی ہے۔ نعمان نے نوٹس لیے کم، مگر درست۔ اسے معلوم تھا کہ یہ تاریخ میں ایک پیراگراف بنے گا، سرخی نہیں۔

وقفے میں افسر نے سلیم کے قریب آکر آہستہ سے کہا۔ "اب بھی وقت ہے، کچھ نام چھوڑ دیے جائیں تو...... نتائج نرم ہو سکتے ہیں۔"

سلیم نے اس کی طرف دیکھا، پہلی بار مسکرا کر۔ "نرمی نے ہی تو یہ سب کیا ہے۔"

وقفہ ختم ہوا۔ سلیم نے آخری جملہ کہا۔ "میں نے توبہ لفظوں میں نہیں، نقصان کی تلافی میں ڈھونڈی ہے۔ اگر سزا اس کا حصہ ہے تو میں تیار ہوں۔"

فیصلہ محفوظ ہو گیا، مگر فیصلے سے پہلے ہی کہانی اپنا اثر دکھا چکی تھی۔ کمیٹیاں بنیں، عہدے بدلے اور کچھ دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔ یہ کوئی انقلاب نہیں تھا، مگر ایک دراڑ تھی اور کبھی کبھی دراڑ ہی کافی ہوتی ہے۔

رات کو سلیم کو حراست میں واپس لے جایا گیا۔ کمرا چھوٹا تھا، مگر اس کے اندر عجیب سا سکون تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو پہلی بار کسی شور نے پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ اسے اپنی ڈائری یاد آئی جو گم ہو چکی تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ شاید ڈائری کی آخری سطر اب لفظوں کی محتاج نہیں۔

کچھ دن بعد فیصلہ آیا۔ سخت تھا، مگر واضح۔ سلیم نے سر جھکا کر سنا۔ سزا سن کر کسی نے تالیاں نہیں بجائیں، مگر کہیں دور کسی نے سکون کی سانس لی۔ یہی کافی تھا۔

نعمان نے آخری کالم لکھا۔ اس میں سلیم کا نام تھا، مگر مرکزی کردار کے طور پر نہیں، ایک مثال کے طور پر۔ اس نے اختتام پر لکھا۔ "توبہ تب مکمل ہوتی ہے جب سچ کی اپنی قیمت خود چکانے دی جائے۔" اس نے کالم ختم کیا، لیپ ٹاپ بند کیا اور باہر نکل آیا۔ شہر اب بھی وہی تھا، مگر سوال زندہ تھے۔

جیل کی مسجد میں ایک دن سلیم نے پہلی بار امامت کے پیچھے نماز پڑھی۔ دعا میں کوئی مطالبہ نہیں تھا، بس شکر تھا اس موقع کا کہ وہ ادھورا نہیں رہا۔ اس نے جان لیا تھا کہ سچائی کا مطلب بچ جانا نہیں، درست ہو جانا ہے۔

مہینے گزرے۔ شہر میں نئی خبریں آگئیں، پرانی دب گئیں، مگر کہیں نہ کہیں، کسی دفتر میں، کسی کلاس میں، کسی گھر میں وہ کہانی پڑھی جاتی رہی جس میں طاقت نے خود کو آئینے میں دیکھا تھا۔

ایک دن نعمان کو ایک لفافہ ملا۔ اندر چند سطریں تھیں، سادہ خط میں۔ "میں نے حساب دے دیا ہے۔ اگر کہیں کمی رہ گئی ہو تو اسے تمہارے سوال پورا کریں گے۔" کوئی نام نہیں تھا، مگر دستخط کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

نعمان نے خط تہ کیا اور کتاب میں رکھ دیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، بارش نہیں تھی مگر ہوا میں تازگی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ سچ کبھی آخری لفظ نہیں ہوتا، وہ ایک سلسلہ ہے۔

سلیم نے رات کو سلاخوں کے پار آسمان دیکھا۔ ستارے کم تھے، مگر موجود تھے۔ اس نے دل میں ایک آخری جملہ کہا، اور خدا سے۔ "اب ادھورا نہیں ہوں۔"

اور یوں کہانی ختم نہیں ہوئی، مکمل ہوئی...... کیونکہ کچھ انجام اختتام نہیں، تکمیل ہوتے ہیں۔

xxx

جانباز

اسماء قادری

دنیا میں موجود طبقاتی فرق بگاڑ کو جنم دینے کا موجب ہے... جب امارت کے نشے میں بدمست لوگ کمزوروں پر ظلم اور اپنے زبردست لوگوں کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں تو نفرتوں کے انگارے دلوں میں سُلگنے لگتے ہیں... جس کی چنگاریاں آہستہ آہستہ ایسی آگ دہکاتی ہے کہ وہ سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتی ہے... ظالموں کی خودسری و دیدہ دلیری سب دھری رہ جاتی ہے... اور بالآخر ظالم اپنے بھیانک انجام کو پہنچتے ہیں... کیونکہ ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو مٹ جاتا ہے۔

ظلم کے خلاف سینہ سپر نوجوان کی داستان

"اماں......!" آنسوؤں میں ڈوبی دلدوز پکار نے تخت پر پھیل کر بیٹھے تیز رنگ لباس والے وجود کو ہلا کر رکھ دیا اور اس نے پان کا بیڑا اپنی طرف بڑھاتے ہاتھ کو نظر انداز کر کے پھرتی سے آواز کی سمت میں گردن گھمائی۔

"اماں!" سامنے نازک نین نقش اور گورے رنگ والا نازک سا عارف آنسوؤں سے تر بتر چہرہ لیے سراپا التجا بنا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ریشمی بال بکھرے ہوئے تھے اور لباس پر جگہ جگہ لگی مٹی گواہی دے رہی تھی کہ وہ زمین پر گرا ہے۔

"ہائے اللہ! اماں صدقے، یہ کیا ہوا میرے منے کو؟" تخت پر دراز وجود نے پہلے پان کا بیڑا اٹھائے کھڑی دلربا نے ردعمل دیا اور لپک کر عارف کے قریب پہنچی۔

"پکڑو شبو باجی!" عارف بس اماں کی نظر کرم کا منتظر تھا چنانچہ شبو پر ایک نگاہ غلط ڈالے بغیر تیز نیلے اور گلابی رنگ کی آمیزش والے لباس میں ملبوس ہستی کی طرف ہی متوجہ رہا۔ ہاں اس نے اپنے شانوں پر ایک بوجھ کی طرح دھرے کتابوں کے بستے کو ضرور شبو کے حوالے کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے، کیوں لڑکیوں کی طرح ٹسوے بہا رہا ہے؟" کرخت لہجے میں کیا گیا سوال اس کی توقع کے برخلاف تھا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ اس کی درد بھری پکار اماں کو تخت سے اتار کھڑا کرے گی لیکن وہاں تو ایسی سرد مہری تھی کہ وہ خود اپنے قدموں کو تخت سے چند قدم کے فاصلے پر ہی

روکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"ساجد اور عابد نے مارا ہے۔" بتاتے ہوئے ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"کیوں؟" سوال پوچھتے لبوں پر اب بھی سختی ہی تھی۔

"وہ سب میرا مذاق اڑاتے ہیں، مجھے چھیڑتے ہیں۔ کوئی میرے بال کھینچتا ہے تو کوئی بازو پر چٹکی کاٹتا ہے۔ آج مجھے غصہ آ گیا تو انہیں گالی دے دی۔ بس اتنی سی بات پر انہوں نے چھٹی کے بعد مجھے گھیر کر خوب مارا۔" اسے اس شدت سے رونا آ رہا تھا کہ بات کرنا مشکل ہو رہی تھی۔

"تو نے جواب میں انہیں کتنے تھپڑ اور گھونسے مارے؟" اس کے رونے دھونے سے صرفِ نظر کیے مسلسل تفتیش کا سلسلہ جاری تھا۔

"ایک بھی نہیں۔ میں ان سے ڈر گیا تھا۔" اس نے روتے ہوئے اعتراف کیا۔ اگلے ہی لمحے ایک زوردار چھڑی کی ضرب اس کے پہلو پر پڑی۔

"اماں......!" وہ بے یقینی اور درد سے چیخا لیکن جواب ایک اور ضرب سے ملا۔

"کیوں مار کھائی تو نے، تیرے ہاتھ پیر نہیں ہیں، تو معذور، لولا لنگڑا ہے، روٹی کی جگہ کچھ اور کھاتا ہے یا خود کو ان کی طرح انسان نہیں سمجھتا جو ان کی زیادتی کا جواب نہیں دے سکا؟" بدن پر پڑتی چھڑی کی ضربیں اور ایک ابھرتی ہوئی آواز کے سوا اس کے اردگرد سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔

"اماں...... اماں! چھوڑ دو اماں...... معاف کر دو مجھے، آئندہ ایسا نہیں کروں گا، نہیں کھاؤں گا کسی کی مار۔" چیختے چیختے اس کا حلق خشک ہو گیا۔

"دادا......!" اپنی چیخوں کے درمیان اس نے کہیں دور سے آتی آواز سنی مگر جسم پر مسلسل پڑتی ضربوں نے اس آواز کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔

"آنکھیں کھولیں دادا!" اس بار زوردار آواز سے پکارنے کے ساتھ ساتھ اس کے بازو کو بھی ہلایا گیا تو اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اردگرد کا ماحول یکسر بدل گیا اور اس نے اپنے پسینے میں بھیگے ہوئے جسم کو نرم آرام دہ بستر پر پایا۔

"پانی پی لیں دادا!" قریب ہی اس کا سب سے قابلِ اعتماد ساتھی اور خدمت گار پانی کا گلاس تھامے مؤدب کھڑا تھا۔

"پھر وہی خواب۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا اور آہستہ

سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔

"اشفاق......!" اشفاق کے تھمائے گلاس سے دو گھونٹ پانی لینے کے بعد اس نے اسے پکارا۔

"جی دادا!" اشفاق رات کے اس پہر بھی پوری طرح چاق چوبند اس کے جاری کردہ احکامات سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھا۔

"صبح تھانے جاؤ اور اس انسپکٹر کو سمجھاؤ کہ محبت سے معاملہ کرلے ورنہ عارف دادا کی دشمنی اسے بہت مہنگی پڑے گی۔ اسے یہ بھی بتانا کہ عارف دادا اپنی اماں کی چھتری کے سوا دنیا کی کسی چیز سے نہیں ڈرتا، اس لیے اپنی طاقت اور اختیار کی دھمکی یہاں ضائع نہ کرے۔" وہ اماں کا اس دن پڑھایا سبق ساری زندگی نہیں بھولا تھا۔ بھول بھی نہیں سکتا تھا کہ اماں جب چاہے یاد دہانی کروانے خواب میں آدھمکتی تھیں۔

☆☆☆

گھونگٹ ڈھکی...... لاج

سجی آئی...... خوشی چھائی......

لکھی...... ماہ جی دعا...... ساہ میں وفا...... پیار سندھو......

ساہ بند ہو...... جون جیون...... سکھ سوہن (دلہن آ گئی، خوشی چھا گئی، گھونگٹ ڈال کر، شرم و حیا جھلک رہی ہے، ماں کی دعا ہے، دل میں وفا ہے، پیار دریا ہے، رشتہ مضبوط رہے، نئی زندگی، خوشیوں سے بھری ہو)۔

صحن میں بیٹھی لڑکیاں بالیاں ڈھول کی تھاپ پر خوب مگن ہو کر گا رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں ان کی ہنسی کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی تھیں لیکن جس کے لیے یہ سارا اہتمام تھا، وہ دیوار کے ساتھ پشت لگائے یوں آنکھیں موندے بیٹھی تھی جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہو۔ کمرے میں داخل ہوتی صبوحی نے اس منظر کو دیکھ کر ایک گہری سانس لی پھر خاموشی سے اس کے قریب آ بیٹھی۔

"مہرو......!" جب اس کے آنے اور بیٹھنے کو محسوس نہیں کیا تو مجبوراً صبوحی کو اسے پکارنا پڑا۔

"ارے صبو! تو کب آئی اندر؟" اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔

"تیرے مراقبے ختم ہوں تو اردگرد کا کچھ ہوش بھی ہو۔" صبوحی نے خفگی کا اظہار کیا۔

"مراقبہ کیا؟ ذرا سر دکھ رہا تھا تو آرام کے لیے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ کتنا برا گاتی ہو تم لوگ، اس پہ سے کسی دن ڈھنگ بھی نہیں کرتیں۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ شریر انداز میں ہنسی لیکن صبوحی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہ آئی۔ آتی بھی کیسے؟ وہ دیکھ سکتی تھی کہ ہنستے ہوئے اس کی پیاری سہیلی کی حسین آنکھیں ویران تھیں اور اسے ان آنکھوں کی ویرانی سے وحشت ہوتی تھی۔

"اب بھی وقت ہے مہرو! ایک بار پھر سوچ لے، تھوڑی سی ہمت کرلے۔" وہ بے ساختہ ہی اس کا ہاتھ تھام کر ملتجی ہوئی۔

"ہش......" مہرو نے اسے ایک چپت لگائی۔

"نہ فضول بول، نہ فضول سوچ۔ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں میری رضا شامل ہے۔ کسی نے میرے ساتھ زور زبردستی نہیں کی ہے۔"

"پر تو، تو اپنے ساتھ، اپنے دل کے ساتھ زور زبردستی کر رہی ہے نا۔"

"عزت والیاں ایسا ہی کرتی ہیں۔ دل کی مان کر میں خود کو بے مول نہیں کر سکتی تھی۔"

"مجھے تو موقع دیتی، میں تیرے دل کا مقدمہ شاہنواز......"

"بس، چپ کر جا۔" مہرو نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "بات تو کرتی یا میں، فرق کوئی نہیں پڑتا۔ وہ سمجھ جاتا کہ میں نے تجھے پیامبر بنا کر بھیجا ہے۔"

"سمجھ لیتا تو بھی کیا برا تھا۔ کم از کم تیرے دل کی مراد تو پوری ہو جاتی۔"

"اور اگر جو وہ انکار کر دیتا؟" اس کے تیز لہجے میں کیے سوال نے پل بھر کو صبوحی کو خاموش کر دیا لیکن پھر چہک کر بولی۔

"لے بھلا، کوئی تجھے کیسے انکار کر سکتا تھا۔ گوٹھ کی سب سے سوہنی لڑکی ہے تو۔"

"پر اس کی دنیا صرف گوٹھ تک نہیں ہے صبوحی! وہ شہر میں رہتا ہے، ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی سے واسطہ پڑتا ہوگا اس کا۔ میرے حسن کا جادو اگر ایسا ہی چلنے والا ہوتا تو مجھے سفارشی بن کر اس کے پاس جانے کا سوچنا ہی نہیں پڑتا۔" اس نے صبوحی کی دلیل کو رد کیا۔

"بچپن سے اب تک اس نے بھی کتابوں سے سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا ہے جو اسے خبر ہوتی کہ اس کے قریب کیا سوہنا گلاب کھلا ہے۔" صبوحی نے صدقے واری جاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیوں بیکار بحث میں الجھی ہے، ذرا انگلیوں پر گن

کر دیکھ لے، کتنے تھوڑے دن رہ گئے ہیں بیاہ میں۔ تو بجائے اس کے کہ بھائی کے سہرے کے گیت گائے، یہاں بیٹھی اس کی منگ کو ورغلا رہی ہے۔" اس کے ہاتھ میں حقیقت کا ایسا آئینہ تھا جس نے صبوحی کو گنگ کر دیا۔ کچھ دیر بعد اپنی اداسی چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی اور زبردستی شوخی سے بولی۔

"اوا سرمد ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا ہے۔ آج کل خوشی سے پاؤں زمین کو نہیں لگتے اس کے۔ روزانہ مجھ سے تیرا پوچھتا ہے، شکایت بھی کرتا ہے کہ چاچی نے خوامخواہ اتنے دن پہلے سے پردے میں بٹھا دیا ہے تجھے۔"

"دیوانہ ہے وہ تو۔" وہ ہنس کر کہتی۔

"سچ مچ دیوانوں کی طرح چاہتا ہے تجھے۔ تو دیکھنا کہ تجھے کیسے پھولوں کی طرح رکھے گا۔ اس کی سنگت میں تو دنیا کا ہر دکھ بھول جائے گی۔" وہ جو کچھ دیر پہلے اس سے اس کے لیے لڑ رہی تھی، اب اسے نئی زندگی کی اچھی امیدیں دلانے لگی۔

"میں سب جانتی ہوں صبو! مجھے سرمد کے خلوص کی بہت قدر ہے۔ تو دیکھنا کہ میں کبھی اسے کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گی اور ہمیشہ اس کی وفادار بن کر رہوں گی۔" وہ سمجھ سکتی تھی کہ صبوحی جیسی مخلص لڑکی جسے سہیلی کی اتنی فکر ہے، بھائی کے لیے کیسے جذبات رکھتی ہوگی۔ اس لیے اسے یقین دہانی کروانے لگی۔

"اری چھوکریو! تم یہاں باتوں میں مگن ہو، وہاں باہر تمہاری ساری سہیلیاں روٹھ کر چلی گئی ہیں کہ مہرو اور صبو کو تو ایک دوسرے کے سوا کسی کی ضرورت ہی نہیں ہے پھر ہم کیوں یہاں بیٹھ کر اپنا گلا خشک کریں۔" مہرو کی ماں سکینہ نے اندر آ کر اطلاع دی تو انہیں احساس ہوا کہ باہر صحن میں جاری گانے بجانے کا سلسلہ تھم چکا ہے۔

"ہائے اللہ جی......! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ انہوں نے مجھے تمہیں باہر لانے کے لیے بھیجا تھا۔" صبوحی نے بوکھلا کر سر پہ ہاتھ مارا۔

"غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں نا وہ کہ تمہیں ایک دوسرے کے آگے کچھ یاد نہیں رہتا۔" سکینہ نے انہیں گھورا۔

"فکر نہ کرو چاچی! میں کل انہیں دوبارہ منا کر لے آؤں گی۔" صبوحی نے اٹھ کر سکینہ کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

"سو گئی خبر آ گئی، تو کتنی چالاک آ ہے۔" سکینہ ہنسی پھر موضوع بدل کر بولی۔

تجوری

ایک صاحب رات کے تین بجے نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے گھر پہنچے۔ چند منٹ بعد ریڈیو سے خاؤں غراپ کی عجیب و غریب آوازیں ابھرنے لگیں۔ بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر ڈائل زور زور سے گھمائے جا رہا ہے۔ بیوی نے پوچھا۔ "خدا کی پناہ! آپ کیا کر رہے ہیں؟"

شوہر نے چلا کر جواب دیا۔ "مجھے پریشان نہ کرو، پتا نہیں کس بیچارے نے اپنے آپ کو تجوری میں مقفل کر لیا ہے اور مجھے تجوری کھولنے کے نمبر یاد ہی نہیں آ رہے۔"

(مرسلہ: راحیلہ خان، کوئٹہ)

مکالمہ

ایک عورت نے دوسری عورت کے دانتوں کی تعریف کی اور کہا۔ "ہائے اللہ! کتنے خوبصورت دانت ہیں۔ بالکل تراشے ہوئے ہیرے ہیں۔ کیا تمہارے اپنے دانت ہیں؟"

دوسری عورت نے کہا۔ "اپنے ہی تو ہیں۔ دندان ساز کا بل دکھاؤں؟"

(مرسلہ: عمار علی، ملتان)

"گل بدھ (بات سن)، کل ذرا تیاری سے آنا۔ تجھے مہرو کے ساتھ حویلی جانا ہوگا۔ وڈی بی بی سائیں نے اسے ملاقات کا پیغام بھیجا ہے۔ اکیلی تو نہیں جا سکتی نا، تو ساتھ چلی جانا۔"

"فکر ہی نہ کر چاچی! میں سب سنبھال لوں گی۔" صبوحی کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ اس کے ذہن میں کوئی خیال جنم لے چکا ہے۔

☆☆☆

"نہ جانا ادا رفاقت! اس کے ساتھ مت جانا۔" رحمت بی بی کا ہنڈیا میں ڈوئی ہلاتا ہاتھ مٹھو کی بلند آواز پہ یکدم ہی ساکت ہوا اور وہ ہنڈیا جوں کی توں چھوڑ کر اس چھوٹے سے کوٹھری نما کمرے کی طرف بھاگی جس میں آٹھ سالہ مٹھو کو سوتا چھوڑ کر آئی تھی۔ مٹھو کو کل رات سے بخار تھا اس لیے آج وہ دوسرے بھائیوں کے ساتھ کام پر نہیں گیا تھا۔ انہوں نے چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا ٹھیکے پہ لے رکھا تھا۔

باپ بیٹے مل کر اس چھوٹے سے ٹکڑے پر خوب محنت کرتے تھے کہ فصل عمدہ ہو تو گزارہ سکھ آرام سے ہو جائے۔ مٹھو جو سب سے چھوٹا تھا، اس مشقت میں بساط بھر باپ، بھائیوں کا ہاتھ بٹاتا تھا لیکن آج وہ طبیعت کی خرابی کے باعث گھر پر ہی تھا۔

''وہ بڑی مونچھوں والا بہانے سے ادا رفاقت کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہے۔ ادا رفاقت نے نہا دھو کر سفید اجلا جوڑا پہنا ہے، وہ بہت سوہنا لگ رہا ہے پر...... پر......'' کوٹھڑی کے ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھے مٹھو کی آنکھیں ایک دیوار پر جمی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوف ہی خوف تھا۔ رحمت بی بی کا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے جھنجوڑ ڈالے تاکہ وہ اس کیفیت سے باہر آ جائے لیکن زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے اور وہ دل میں آئی پر عمل نہیں کر سکی۔

''ادا رفاقت کھیتوں سے گزر رہا ہے، اس کے بال ہوا سے اڑ رہے ہیں پر......'' مٹھو نے واضح طور پر خوف سے خشک پڑتا اپنا گلا تھوک نگل کر تر کیا اور پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔

''ادا رفاقت کا اجلا کرتہ خون سے لال ہو گیا ہے، وہ کھیتوں میں گرا پڑا ہے اور وہ بڑی مونچھوں والا...... اس کے ہاتھ میں لال سرخ خنجر ہے...... خون...... وہ...... وہ...... سب جگہ خون ہی خون ہے۔'' اب مٹھو نے اپنی دونوں آنکھیں زور سے میچ لی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں سر تھام کر گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا تھا۔ اس کے گرتے ہی رحمت بی بی پر طاری سکتہ ٹوٹا اور وہ تیر کی طرح مٹھو کے قریب پہنچی۔

''مٹھو......! سب خیر آ ہے پتر! کچھ نہیں ہوا۔'' وہ اس کے کانپتے وجود کو اپنی بانہوں میں بھینچے اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ پر اندر بات کر اس کا اپنا دل قابو میں نہیں تھا اور کسی بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ جو اس نے سنا تھا، وہ معمولی نہیں تھا اور مٹھو کے لبوں سے نکلنے کے بعد تو بالکل غیر معمولی ہو چکا تھا۔

''چھا کریاں، ہاں چھا کریاں، ہاں رفاقت کے اے رفاقت! ہائی! کیہیں بچایاں؟'' اپنے شوہر کے بھتیجے کی زندگی کی طرف سے شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کی زندگی بچانے کے لیے کیا اقدامات کرے۔ فی الحال تو مٹھو کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر اس جگہ سے ہل نہیں سکتی تھی۔ اس نے کپکپاتے بدن کو اپنی ممتا کی گرمی سے سنبھالتے ہوئے اس نے بمشکل اسے بستر پر سیدھا لٹایا اور اس کے وجود کو ایک بھاری رلی سے ڈھانپ دیا۔

''پانڑی پی پتر!'' آہستہ آہستہ مٹھو کے وجود کی کپکپاہٹ دور ہوئی تو اس نے اسے سہارے سے بٹھا کر پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ مٹھو نے مشکل سے دو گھونٹ پانی حلق سے نیچے اتارا اور نڈھال سا ہو کر اپنا سر تکیے پر ڈال دیا۔ رحمت بی بی دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ چھ گھنٹوں کے لیے سو جائے گا اور سو کر اٹھنے کے بعد بھی کئی گھنٹوں تک مضمحل رہے گا۔ وہ بس اس کی نیند گہری ہونے کی منتظر تھی تاکہ کھیت میں کام کرتے شوہر کے پاس جا کر اسے سارا قصہ سنا سکے۔

آہستہ آہستہ مٹھو کی سانسیں بوجھل ہونا شروع ہوئیں تو وہ بہ احتیاط اس کے پاس سے اٹھ کر باہر آئی اور پہلی بار اس کے نتھنوں نے جلنے کی اس بو کو محسوس کیا جو جانے کتنی دیر سے فضا میں چکراتی پھر رہی تھی۔

''ہانڈی سڑی وئی۔'' وہ باورچی خانے کے طور پر استعمال ہونے والے چھپڑ کی طرف بھاگی۔ ابھی مشکل سے چولہا بجھایا تھا کہ بیرونی دروازہ زور سے کھلا اور اس کے دونوں بڑے بیٹے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔

''اللہ سائیں خیر کر۔'' اس نے بے ساختہ ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر دعا مانگی لیکن دعا کا وقت گزر چکا تھا۔

''ادا رفاقت کو کسی نے چاقو مار کر کھیتوں میں پھینک دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے چاچا بشیر نے دیکھ کر شور مچایا۔ ابا، چاچے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اسے شہر کے اسپتال لے گیا ہے، پر سارے کہہ رہے تھے کہ خون بہت بہہ گیا ہے، جان بچنا مشکل ہے۔'' اس کا دوسرے نمبر والا بیٹا بغیر سانس لیے اسے پوری خبر دے چکا تھا اور وہ بے دم ہوتی ٹانگوں کے ساتھ اس کوٹھڑی کے دروازے پر نظریں گاڑے کھڑی تھی جہاں ننھا مٹھو اس کے پورے وجود میں بھونچال پیدا کر کے خود گہری نیند سو رہا تھا۔

☆☆☆

''بی پی، شوگر، ہارٹ بیٹ، سب ایک دم پرفیکٹ ہے۔ باقی میں نے بلڈ سیمپل لے لیا ہے، لیبس کروا کر کریٹینین، ل اور سی بی سی وغیرہ کی رپورٹس کل تک واٹس ایپ کر دوں گا۔ فی الحال آپ پہلے کی طرح پابندی سے دوائیں لیتے ... تھا۔ وجوان خوبرو ڈاکٹر نے عارف دادا کا چیک

urdunovels.com

اپ مکمل کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے پہلے انہیں ان کے احوال سے آگاہ کیا پھر ہدایت دی۔

"دوا کی تو یہ اشفاق سالا ایسی پابندی کرواتا ہے کہ کبھی ماں نے ایسی پابندی نماز روزے کی نہ کروائی ہوگی۔ سالا کسی داروغہ کی طرح اس وقت تک میرے سر پر سوار رہتا ہے جب تک ایک ایک گولی میرے حلق سے نیچے نہ اتر جائے۔ میں سمجھاتا ہوں اسے کہ عارف دادا نے ساری زندگی بندوق کی گولیوں کے سائے میں بے جگری سے گزاری ہے، اب تو مجھے ڈاکٹروں کی گولیوں میں نہ الجھا لیکن سنتا ہی نہیں۔" عارف دادا کے لہجے میں اشفاق کے لیے ایک محسوس کی جانے والی شفقت تھی۔

"بالکل صحیح کرتا ہے۔ ہماری گولیاں پابندی سے لیتے رہیں گے تو ہی بندوق کی گولیاں چلانے کے لائق رہیں گے۔"

"لے سن لے اشفاق! ایک تو لاڈلا ہے، دوسرا یہ۔ دونوں مل کر اس عارف دادا پر رعب جماتے ہو جس کے نام سے بڑے بڑے بدمعاش کانپتے ہیں۔"

"میں کہاں لاڈلا ہوں دادا! میں تو سارا دن آپ کی ڈانٹیں کھاتا ہوں اور گالیاں سنتا ہوں پھر بھی آپ خوش نہیں ہوتے۔ لاڈلے تو یہ ڈاکٹر صاحب ہیں جن کے آتے ہی آپ کا چہرہ کھل اٹھتا ہے اور منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں۔" اشفاق نے مسکین سی صورت بنا کر شکوہ کیا۔

"ابے چل کمینے۔ اب کیا میں تجھ سے لکھنوی انداز میں بات کروں گا؟ ڈاکٹر صاحب کی بات اور ہے۔ پڑھے لکھے بندے سے تو تہذیب کے دائرے میں ہی بات کرنی پڑتی ہے۔" اس نے ڈاکٹر کے شانے پر پرشفقت تھپکی دی۔

"اپنی بدمعاشی میں کہیں گھستی تھی یہ پڑھائی تو کیا کرتے۔" اشفاق بسورا۔

"ابھی تو بس تو یہ کر کہ بابے کو شام کے کھانے میں مٹن پلاؤ اور چکن نہاری بنانے کا کہہ دے۔ ڈاکٹر سائیں شام کا کھانا ادھر ہی کھا کر جائیں گے۔"

"نہیں، نہیں دادا! میں نہیں رک سکتا۔ میری آج نائٹ ڈیوٹی ہے۔ یہاں سے جا کر تھوڑی دیر ریسٹ کروں گا پھر تیار ہو کر اسپتال۔"

"یہ تو کوئی گل نہ آئی ڈاکٹر! تیرے پاس ہمارے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔" عارف دادا نے شکوہ کیا۔

"ایسے تو نہ کہیں دادا! پوچھ لیں اشفاق سے، اس کی کال ملتے ہی سیدھا یہاں آیا ہوں کہ نہیں۔"

"وہ تو تجھ کو آنا ہی آنا تھا پتر! تو چنگی طرح جانتا ہے جو ہمارے بلانے پر شرافت سے نہ آئے، ہم اسے اٹھوا لیتے ہیں۔" دادا نے شرارت سے آنکھ ماری تو ڈاکٹر ہنس پڑا پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"غنڈا، بدمعاش یا دادا، پر آپ کو باقی دنیا کہتی ہوگی۔ میرے لیے تو آپ رحمت کا وہ فرشتہ ہیں جو مجھے فرشتۂ اجل کے پنجے سے چھڑوا کر لایا تھا۔ اگر اس روز آپ نہ ہوتے تو میرے بوڑھے ماں باپ میری تصویر سینے سے لگائے مجھے شہر کی سڑکوں پر ڈھونڈتے پھرتے۔"

"ابے نہیں لاڈلے! ہم نہ ہوتے تو کوئی اور ہوتا۔ اوپر والے نے جب کسی کو سہارا دینا ہوتا ہے تو وسیلے خود بنا دیتا ہے۔ کل کسی نے ہمارا ہاتھ تھاما تھا تو آج ہم تجھے اس گدی پر بیٹھے دکھائی دے رہے ہیں۔ تو، تو پڑھا لکھا بندہ ہے، تیری اڑان بہت اونچی ہوگی۔ دنیا سے الگ بہت اونچی کرسی پر بیٹھے گا تو۔ ادھر تو ہم تجھے بس تھوڑی دیر دیدار کرنے کو گھسیٹ لیتے ہیں...... کیا کریں، دل جو جڑ گیا ہے تجھ سے۔"

"دل تو میرا بھی آپ سے جڑ گیا ہے دادا! ورنہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دنیا سے کوئی واسطہ رکھوں گا۔" اس نے ایک نظر کھڑکی کے باہر نظر آتے منظر پر ڈالی۔ کوٹھی کے احاطے میں شکل ہی سے بدمعاش دکھائی دینے والے چار پانچ مسلح افراد گھوم رہے تھے۔

"یہ سارے رب سائیں کے دھندے ہیں۔ کہاں کی تاریں کہاں جوڑ دے، یہ اس کی مرضی۔ پر ٹھیک ہے، اب تو جا، تجھے رات کی ڈیوٹی کرنی ہے، اس سے پہلے آرام ضروری ہے۔" دادا نے گھڑی پر نظر پڑتے ہی اسے اجازت دی اور اشفاق کی طرف تحکمانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ فوراً ہی حرکت میں آگیا۔ نوجوان ڈاکٹر لگژری گاڑی میں بیٹھ کر اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوا تو جانتا تھا کہ دنیا کی کئی نعمتوں سے بھرے ٹوکرے اس کے ساتھ جارہے ہیں۔

"ادھر روک لو۔" ایک کچی بستی کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے ان الفاظ کو سننے کا ڈرائیور پہلے سے ہی منتظر تھا۔ چنانچہ بغیر کوئی سوال کیے گاڑی روک دی۔ اگلے ہی لمحے وہ سارے ٹوکرے گاڑی کے باہر رکھے تھے اور چہروں پر بے حد غربت و افلاس والے بچے کھلکھلاتے ہوئے ان ٹوکروں سے نکلنے والی نعمتیں لوٹ رہے تھے۔ ٹوکروں کو خالی کر کے وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا تو مطمئن تھا کہ اپنے باپ کے پڑھائے حرام و حلال کے فلسفے کو نہیں بھولا ہے۔ عارف دادا کا لاڈ پیار بے حساب وصول

urdunovels.com

کرتے ہوئے اس نے اس بات کا ہمیشہ حساب رکھا تھا کہ اس کے مال میں حصے دار نہ بنے۔

☆☆☆

''کہاں جارہی ہو تم دونوں؟'' باتوں میں مگن (...) منزل کی طرف بڑھتی وہ اچانک سنائی دینے والی اس بارعب آواز پر بری طرح اچھل پڑیں۔

''سرمد کے بچے......!'' رعب جھاڑنے والے کا چہرہ سامنے آیا تو مہرو نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔

''اللہ سائیں نے چاہا تو سال بھر کے اندر ہی آجائیں گے، بس تو تیار رہنا۔'' جواباً وہ شرارت سے بولا تو مہرو کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی۔ کچھ اور بس نہ چلا تو ساتھ کھڑی صبوحی پر چڑھ دوڑی۔

''بڑے دانت نکال نکال کر ہنس رہی ہے۔ میں جانتی ہوں یہ ساری تیری سازش ہے۔ تو نے ہی بتایا ہوگا اسے کہ ہم اس وقت حویلی جانے کے لیے گھر سے نکلیں گے۔''

''ہاں تو، ساری دنیا تو تیری طرح ظالم نہیں ہوسکتی نا؟ میری بہن ہے، میرا بھلا تو سوچے گی نا۔'' سرمد نے اس کی توجہ صبوحی سے ہٹا کر دوبارہ اپنی طرف مرکوز کی۔

''میں ابھی آئی۔'' مسکراہٹ چھپاتی صبوحی وہاں سے اڑن چھو ہوئی۔

''رک تو......!'' مہرو نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ تو کسی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی دور نکل چکی تھی۔

''ماتھے سے بل ہٹا کر ذرا ایک پیار بھری نظر ادھر بھی ڈال لے۔'' سرمد نے اس کے بگڑے تیوروں کو دیکھ کر اسے ٹوکا۔

''ایسے اچھا نہیں لگتا سرمد! کسی نے دیکھ لیا تو خوامخواہ بدنامی ہوگی۔'' اس بار اس نے ذرا نرم لہجے میں اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

''بدنامی کیسی؟ سب کو پتا ہے تو میری منگ ہے اور تھوڑے ہی دنوں میں ہمارا بیاہ ہونے والا ہے۔''

''وہی تو میں کہہ رہی ہوں، بس تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں۔ تو چند دن صبر نہیں کرسکتا؟''

''تو کیا جانے میں دن کی ایک ایک گھڑی کیسے گن گن کر گزارتا ہوں۔ تیرے قدموں کی آہٹ، دوپٹے کی سرسراہٹ، چوڑیوں کی کھنکناہٹ، سانسوں کی گرماہٹ...... کیا کیا نہیں ہے جو میرے دل کو تڑپانے چلی آتی ہے۔ میں تو کتنے دن ہوئے ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ سوتے میں اچانک دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے، یوں لگتا ہے تو آئی ہے۔ گہری نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ آس پاس پھیلی تیری خوشبو مجھے مست کردیتی ہے تو کبھی واہموں میں گھر جاتا ہوں کہ کہیں میرا یہ خوبصورت خواب ادھورا نہ رہ جائے۔'' اس کی جذبات سے بوجھل ہوتی آواز مہرو کو نروس کررہی تھی۔

''تو، تو جھلا ہوگیا ہے سرمد!'' اس نے دانستہ سحر کو توڑنے کی کوشش کی۔

''تو اگر میری جگہ ہوتی اور خود کو میری نظروں سے دیکھتی تو تجھے لگ پتا جاتا کہ کوئی کیسے دیوانہ ہوتا ہے۔'' سرمد کی سرخ ڈوروں والی آنکھوں میں ڈولتی چاہت اسے اس سے نظر ہی نہیں ملانے دے رہی تھی۔

''کسی ڈاکٹر یا سیانے حکیم کو دکھا کر اپنا علاج کروا۔'' وہ نہیں چاہتی تھی کہ سرمد پر اس کی گھبراہٹ عیاں ہو اس لیے مسلسل اسے جھٹکے جواب دے رہی تھی۔

''فون کردیا ہے میں نے شاہو کو، آرہا ہے وہ ہمارے بیاہ میں شریک ہونے۔ اس سے کہوں گا کہ کرے میرے مرض کا کوئی علاج۔'' سرمد نے ہنس کر اسے جواب دیا۔ اصل میں وہ اتنا خوش تھا کہ اسے مہرو کی کوئی تیکھی بات بری نہیں لگ رہی تھی۔

''اس سے نہیں ہونے والا تیرا علاج۔ وہ کچھ کرسکتا تو تجھے اپنی طرح پڑھاکو نہیں بنالیتا؟'' اس موقعے پر شاہنواز کے ذکر نے اسے تکلیف دی تھی اس لیے جل کر سرمد کو طعنہ دے بیٹھی۔

''بھئی ایک ہی دل تھا، وہ تیرے ساتھ لگ گیا پھر بھلا پڑھائی میں کیا خاک لگتا۔'' سرمد نے ذرا جھینپ کر کان کھجایا۔ یہ سچ تھا، بچپن سے یک جان دو قالب بن کر رہنے والے وہ اور شاہنواز اس ایک نکتے پر یکجا نہیں ہوسکے تھے۔ شاہنواز جتنا کتابی کیڑا تھا، وہ اتنا ہی پڑھائی سے دور بھاگتا تھا۔ مشکل سے میٹرک پاس کیا تھا اور پھر زمینوں کے کام میں لگ گیا تھا۔ گھر والوں کو بھی اس کے اس عمل پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ باپ خود چاہتا تھا کہ بیٹا اس کا بازو بنے۔

''بس باتیں بنوا لو تجھ سے۔'' وہ سر جھٹک کر آگے بڑھی۔

''کہاں چلی؟'' سرمد نے بے قراری سے اسے پکارا۔

''تیری چالباز بہن کو دیکھنے جارہی ہوں۔'' اس نے رکے بغیر جواب دیا تو سرمد ہنس پڑا لیکن مزید اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مزاج آشنا تھا، جانتا تھا اب وہ رو کے سے بھی نہیں رکے گی۔

''چاچا شمشاد کے کھیت گڑیاں توڑنے گئی تھی پر ملی ہی نہیں۔'' صبوحی جو دور چھپ کر کھڑی نظر رکھے ہوئے تھی،

زرا ہی مہرو کے سامنے آ گئی۔

"چھوٹے بھائی نے نہ بتا، یہ کون سا موسم ہے گڑیاں بننے کا؟" مہرو نے اسے ڈپٹا۔

"میرے بھائی کے دل کی کلی کھلنے کا تو موسم ہے نا؟ دیکھا نہیں، کیسا چمک گیا ہے اس کا چہرہ تیری صورت دیکھ کر۔" صبوحی شوخی سے بولی تو وہ جواباً خاموش رہی اور سر جھکائے چلتی رہی۔

"میرے بھائی کی محبت کی قدر کرنا مہرو! ادا سرمد بہت دل سے چاہتا ہے تجھے۔" صبوحی کو جانے کیا وہم ستایا کہ اس کا ہاتھ تھام کر اس سے درخواست کرنے لگی۔ مہرو ٹھٹک کر رک گئی۔

"کبھی بھول کر بھی ایسا ویسا نہ سوچنا صبو! مہرو کردار کی ہلکی نہیں ہے۔ مر جاؤں گی پر سرمد سے بے وفائی نہیں کروں گی۔" وہ عہد جو سرمد کی منگیتر بنتے ہی اس نے خود سے کیا تھا، صبوحی کے آگے دہرایا۔

"دل پر نہ لے۔ مجھے خبر ہے تو کتنی کھری لڑکی ہے، پر ادا سرمد کی دیوانگی دیکھتی ہوں تو ڈر جاتی ہوں کہ جانے تو اتنا بوجھ اٹھا پائے گی یا نہیں؟" صبوحی کی زبان پر جو واہمہ تھا، وہ اس کے اپنے دل کا بھی خوف تھا۔ شاہنواز اس کا پہلا پیار تھا اور وہ یہی سنتی آئی تھی کہ پہلا پیار انسان کبھی بھلا نہیں پاتا۔

"نہ ڈر صبو! مانا کہ میرے دل پر پہلی دستک شاہنواز کی محبت نے دی ہے لیکن سرمد بھی تو کوئی غیر نہیں۔ ہم بچپن سے ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہیں، خون کا رشتہ بھی ہے، پھر سنا ہے نکاح کے بول بھی دلوں کو جوڑ دیتے ہیں۔ میں بھی سرمد کو خود سے ناراض یا مایوس نہیں ہونے دوں گی۔" وہ جو وعدہ کر رہی تھی، اسے نبھانے کا پورا پورا ارادہ بھی رکھتی تھی۔

☆☆☆

رفاقت کا جواں سال لمبا چوڑا وجود چارپائی پر بے جان پڑا تھا اور اس کے سفید لباس پر خون کی سرخی غالب آ گئی تھی۔ اس کی چارپائی کے گرد کھڑی اس کی ماں بہنوں کے ساتھ ساتھ دیگر رشتے دار خواتین بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں، خصوصاً اس کی ماں کا حال بہت برا تھا۔ بیچاری بار بار غش کھا جاتی تھی۔ ایسے میں رشتے دار خواتین اپنا رونا دھونا بھول کر اسے سنبھالنے اور ہوش میں لانے میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ عورتوں کے اس ہجوم میں ایک صرف رحمت بی بی تھی جس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ رونا اور بین کرنا تو دور کی بات، وہ آگے بڑھ کر اپنی غم سے نڈھال جیٹھانی کو سنبھال تک نہیں پا رہی تھی۔ وہ بس رفاقت کی لاش پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اور پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی کیفیت دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

"صدمہ لگ گیا ہے بیچاری کو۔ بھتیجا بھی ہے اور سگی خالہ کا بیٹا بھی، غم تو ہونا ہے۔" عورتیں اس کی حالت پر تبصرہ کر رہی تھیں لیکن وہ خود ان کی باتیں سننے اور سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ بس مسلسل مشو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے وہ سارے الفاظ یاد آ رہے تھے جو مشو نے رفاقت کے قتل کی خبر آنے سے پہلے ادا کیے تھے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ مشو نے کسی واقعے کی اطلاع اس کے پیش آنے سے پہلے دے دی تھی۔ اس پر اچانک ہی ایک کیفیت سی طاری ہو جاتی تھی اور ساکت نظروں سے کسی ایک سمت گھورتا یوں بولتا چلا جاتا تھا جیسے سب کچھ اس کے سامنے کسی فلم کی طرح چل رہا ہو۔ کسی کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع، کسی کو بیٹا ہونے کی خوشخبری، آن چاہے وقت پر ہونے والی بارش کی پیشگوئی، یہاں تک کہ کسی لڑکا لڑکی کی خفیہ ملاقات تک، بہت کچھ تھا جو مشو نے اپنی اس کیفیت میں بیان کیا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی قتل کی خبر دی تھی، وہ بھی قاتل کے حلیے کے ساتھ۔

رحمت بی بی اور اس کا شوہر، مشو کی اس غیر معمولی صلاحیت سے پہلے ہی بہت خوفزدہ رہتے تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ یہ باتیں اوروں کے کانوں تک نہ پہنچیں لیکن وہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں تھے۔ ایک بار اپنے تایا کی موجودگی میں اس پر یہ کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت اپنے بھتیجے کی کیفیت دیکھ کر جو حیران ہوا تھا، سو ہوا تھا، بعد میں من و عن ویسا ہی واقعہ پیش آ جانے پر بالکل ہی دنگ رہ گیا تھا اور اپنے چھوٹے بھائی سے اس بارے میں استفسار بھی کیا تھا۔ اس وقت رحمت بی بی اور اللہ ڈنو کو مختصراً اسے اس بارے میں بتانا پڑا تھا لیکن انہوں نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اس بارے میں لوگوں کو کچھ بتا کر اپنے بیٹے کے لیے مشکلات کھڑی نہیں کرنا چاہتے۔ اس نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن خود وقتاً فوقتاً پوچھتا رہتا تھا کہ آیا مشو نے کوئی نئی پیشگوئی کی ہے یا نہیں۔ عام طور پر وہ دونوں میاں بیوی اسے ٹال دیتے تھے۔ ایک آدھ بار کوئی چھوٹا موٹا قصہ سنا بھی دیا تھا لیکن ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ یہ موضوع نہ چھیڑا جائے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اندر ہی اندر انہیں اس بات کا احساس تھا کہ یہ غیر معمولی صلاحیت کبھی ان کے بچے کے لیے مصیبت بن سکتی ہے۔ پھر نہیں تو

کوئی نوسرباز اور ٹھگ مشو کی اس صلاحیت کی وجہ سے اسے اغوا بھی کرسکتا تھا کہ لوگوں کو اس کی جاگتی آنکھوں کے خواب سنا کر ان سے پیسا بٹور سکے۔ اس لیے بس انہوں نے خاموشی ہی مناسب سمجھی تھی لیکن اب جو غیر معمولی واقعہ پیش آچکا تھا، اس نے رحمت بی بی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ دیکھ رہی تھی اللہ ڈنو، اس کا بڑا بھائی اور برادری کے دوسرے کئی مرد رفاقت کی جوان موت پر غم و غصے سے نڈھال تھے اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ قاتل کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالیں۔ قاتل کون تھا؟ یہ تو رحمت بی بی اندازہ نہیں لگا سکی تھی لیکن اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ قاتل کی شناخت ہوگئی تو ہنگامہ بہت بڑھ جائے گا اور اس کے شوہر سمیت کئی لوگوں کے ہاتھ خون سے رنگ جائیں گے۔ اس نے اپنے اردگرد دشمنیوں کے کئی سلسلے دیکھے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ سلسلہ اس کے خاندان میں بھی شروع ہو کیونکہ ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوتا تو پھر اس کے شوہر اور بیٹوں کو اس آگ کا ایندھن بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

"رو لے رحمتے......! تھوڑا سا رو لے، نہیں روئی تو غم سے سینہ پھٹ جائے گا۔" برادری ہی کی کوئی عورت تھی جس نے اس کا بازو ہلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں...... ہاں...... کیا؟ منجھو مشو کہیں آ ہے؟" وہ یوں بڑبڑائی جیسے کسی گہری سوچ سے باہر آئی ہو۔

"صبر رحمتے! صبر۔ سب ٹھیک آ ہے۔" عورتوں نے اسے تسلی دی۔

"نبی بخش! مشو کے سد پو (مشو کو بلا دو)۔" ایک عورت نے کسی بچے کو آواز لگا کر ہدایت دی تو وہ مزید پریشان ہوگئی۔

"نہ نہ...... مشو حتی کونہ آ ہے۔ حسن جی طبیعت خراب ہئی، ماں ان کو گھر چھڈی آئی آھیان (نہیں نہیں، مشو یہاں نہیں ہے۔ اس کی طبیعت خراب تھی میں اس کو گھر چھوڑ کر آئی ہوں)۔" وہ جلدی سے بول پڑی۔ اس اندیشے کے تحت کہ کہیں مشو قاتل کو دیکھ کر کسی کے سامنے زبان نہ کھول بیٹھے۔ وہ اسے گھر پر ہی سوتا چھوڑ آئی تھی اور بچھلے بیٹے کو بھی اس کے پاس ہی چھوڑ دیا تھا کہ گھر رہ کر چھوٹے بھائی کا خیال رکھے۔ اطلاع ملنے کے بعد اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ مشو یا دوسرے بچوں کو کچھ سمجھا پاتی۔ اس نے جلدی جلدی میں جو اقدامات کر سکتی تھی، وہ کر آئی تھی۔ قریبی رشتے داری کا معاملہ تھا اس لیے اس کا اس وقت وہاں موجود رہنا بہت ضروری تھا۔

"مشو مشو، ٹھیک آ ہے۔ پان ذرا ہوش کر، اپنی بھی جیڑانی جو دھیان رکھ۔" ایک عورت نے اسے نصیحت کی تو اس نے خود کو سنبھالا اور بڑھ چڑھ کر معاملات میں حصہ لینے لگی۔

رونے دھونے کے درمیان ہی ضروری کام بھی انجام پاتے رہے، یہاں تک کہ رفاقت کا جنازہ اپنی آخری آرام گاہ تک جانے کے لیے تیار کردیا گیا۔ پولیس نے پوسٹ مارٹم کی تجویز دی تھی لیکن رفاقت کی ماں کو اپنے اکلوتے بیٹے کی لاش کی چیر پھاڑ گوارا نہیں تھی۔ اس نے وہ واویلا کیا کہ باپ کو وڈیرے کی سفارش سے پوسٹ مارٹم رکوانا پڑا۔ مدعی سست پڑجائے تو پولیس کو کیا ضرورت پڑی تھی کارکردگی دکھانے کی۔ یوں رفاقت کا جنازہ بغیر کسی تاخیر کے اپنی آخری آرام گاہ تک روانگی کے لیے تیار ہوگیا۔

مرد جنازہ اٹھانے اندر آئے، کلمۂ شہادت کا نعرہ بلند ہوا۔ رفاقت کی ماں چیختی چلاتی اس کی چارپائی کے پایوں سے لپٹ گئیں۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جس نے دیکھنے اور سننے والوں کے دل چیر کر رکھ دیے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر ہونٹ پر سسکیاں تھیں۔ ایسے میں رحمت بی بی کا دل بہت بری طرح دھڑکا، اس کی نظر مشو پر پڑی۔ وہ اس کے بچھلے بیٹے کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا اور آنکھوں میں حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت لیے چارپائی پر پڑی رفاقت کی میت کو دیکھ رہا تھا۔ ماں کی خواہش پر لے جانے سے پہلے ایک بار پھر اس کا چہرہ کھول کر دکھایا جارہا تھا۔ رحمت بی بی کسی ان دیکھے خدشے کے تحت مشو کی طرف بھاگی۔

"وڈی موچھن وارو خونی۔" یکدم ہی مشو جنازہ اٹھانے کے لیے آنے والے مردوں میں سے ایک کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے چلایا۔ رحمت بی بی نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا آہ و بکا کے طوفان میں شاید ہی کسی نے مشو کی بات پر توجہ دی تھی لیکن ایک بڑی مونچھوں والا تیس بتیس سالہ مرد چونک کر پلٹا تھا اور اس کی نظریں مشو کے چہرے پر آ ٹکی تھیں۔

"چپ...... آواز نہ کر۔" رحمت بی بی نے اسے چپکے سے ڈانٹا اور دھیرے سے پیچھے کی طرف لے گئی۔ لاشعوری طور پر وہ مشو کو ان سرخ آنکھوں سے دور لے جانا چاہتی تھی جو ابھی تک مشو پر لگی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

"عارف......!" اماں کی آواز میں موجود جلال نے عارف کے ہاتھ سے پلاسٹک کی وہ چھوٹی سی تھیلی گروادی جس میں سے وہ رنگ برنگی، کھٹی میٹھی گولیاں نکال نکال کر

منہ میں رکھتا خوب چسکے لے رہا تھا۔ تھیلی گری تو فرش پر ہر طرف رنگین گولیاں بکھر گئیں۔

''جلدی کر عارف! اماں بہت غصے میں ہے۔'' اس کے اٹھنے سے پہلے شبو کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی اور اسے پکارا۔

''کیا ہوا ہے شبو باجی؟'' اس نے قدرے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ کونے والا رشید آیا ہے اپنی ماں کے ساتھ، تیری شکایت لگانے۔ تو نے مارا تھا اسے؟'' شبو نے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ استفسار بھی کیا۔ عارف جواب دیتا اس سے قبل اماں کی دوسری پکار سنائی دی۔ اس پکار میں پہلے سے زیادہ غضب تھا۔ عارف تیر کی طرح باہر کی طرف لپکا لیکن اب اس کی چال میں اعتماد تھا۔ اب وہ پہلے جتنا نازک اور کمزور سا بچہ نہیں رہا تھا۔ اماں کی سخت تربیت اور توجہ نے اسے پہلے کے مقابلے میں مضبوط اور پُراعتماد بنا دیا تھا۔

''جی اماں؟'' وہ رشید اور اس کی ماں کو نظر انداز کر کے حسبِ معمول شوخ لباس میں ملبوس اماں کے مقابل جا کھڑا ہوا۔

''جی اماں کے بچے! سامنے بیٹھی خالہ نسرین دکھائی نہیں دے رہی؟ سلام کر پہلے اسے۔'' اماں نے اسے بری طرح جھڑکا۔

''السلام علیکم خالہ!'' مجبوراً اس نے خالہ نسرین کو سلام کیا اور ان کے پہلو میں بیٹھے رشید کو اماں سے بھی زیادہ غضب ناک نظروں سے گھورا۔

''دیکھو اماں! یہ ڈرا رہا ہے مجھے۔'' رشید نے فوراً دہائی دی۔

''کیا بات ہے عارف! تو کیا محلے کا غنڈا بنا ہوا ہے؟'' اماں نے فوراً اسے ڈپٹا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے اماں!'' وہ جھینپا۔

''پھر کیوں مارا ہے تو نے نسرین کے لڑکے کو؟''

''یہ میرا مذاق اڑا رہا تھا، سارے اسکول کے سامنے کھسرا کھسرا کہہ کر چھیڑ رہا تھا، پھر میں نے بھی اسے بتا دیا کہ کسی مرد سے پنگا لینے کا انجام کیا ہوتا ہے۔'' غصے سے پھولی پھلائے، اکڑ کر بولتا وہ اماں کو ایسا پیارا لگا کہ مشکل سے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ شبو نے البتہ دور کھڑے کھڑے ہی اس کی بلائیں لے لیں۔

''اب تم خود ہی سن لو نسرین کہ تمہارے لڑکے نے کیا حرکت کی تھی۔ کسی مرد بچے کو کھسرا کہہ کر چھیڑے گا تو پھر مار تو کھانا پڑے گی نا۔'' پان کی گلوری منہ میں رکھتی اماں اس بار اس کی حمایتی تھی۔

''بچہ ہے جی۔ اپنی سمجھ کے مطابق بات کر گیا۔ اسے تو یہ لگا ناکہ یہ کھسروں کے ساتھ رہتا ہے تو خود بھی کھسرا ہی ہوگا۔'' نسرین نے منہ بنا کر اپنے بیٹے کی حمایت کی اور مزید چمک کر بولی۔

''چلو غصے میں مار لیا تھا، اتنا بھی سمجھ میں آتا ہے، لیکن بچے کی کتاب پھاڑنے اور پیسے چھیننے کی کیا تک بنتی تھی؟ یہ تو نری غنڈا گردی ہے نا؟''

''ارے بہنو...... غصہ تو پھر غصہ ہے۔ غصے میں سمجھ تھوڑی آوت ہے کہ کتنا بدلہ لینا بنتا ہے، کتنا نہیں۔ تم بھی بچوں کی بات سمجھ کر نظر انداز کرنے کے بجائے شکایت لگانے یہاں چلی آئی ہو۔ مٹی ڈالو اس سارے قصے پہ۔ میں تمہیں چائے کے ساتھ سونف خوشبو والا پان کھلاتی ہوں۔'' شبو جس کا عارف سب سے زیادہ لاڈلا تھا، فوراً ہی اس کی حمایتی بن کر میدان میں اتر آئی۔

''چپ کر جا شبو! غلطی، غلطی ہوتی ہے، عارف کو کوئی حق نہیں تھا کہ رشید کی کتاب پھاڑتا یا اس کے پیسے چھینتا۔'' اماں نے فوراً شبو کو ڈپٹا پھر عارف کی طرف رخ کر کے سنجیدگی سے حکم دیا۔

''معافی مانگ رشید سے اور اپنی پہ کل کی جیب خرچی اس کو دے دے۔'' اماں نے پاندان کے کسی خانے سے دو کا نوٹ نکال کر عارف کو تھمایا۔ عارف جانتا تھا کہ اماں کی حکم عدولی کا کوئی امکان نہیں ہے چنانچہ چاروناچار نوٹ تھام کر رشید کی طرف پیش قدمی کی اور نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

''سوری!''

رشید نے جھٹ نوٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی باجی! میں تو بس اس لیے تمہارے پاس شکایت لے کر آگئی تھی کہ محلے داری ہے اور محلے داری میں لڑائی جھگڑے نہیں سجتے۔ ویسے تو بھی ذرا سوچ سمجھ کر چل۔ لڑکا ہے یہ اور لڑکے تو اپنے باپ کی نہیں سنتے، تم لوگوں سے کیسے سنبھلے گا یہ لڑکا، ابھی تو اس کی مونچھیں بھی نہیں نکلیں اور لگا ہے غنڈا گردی دکھانے۔ تھوڑا اور بڑا ہوا تو تمہیں ناکوں چنے چبوا دے گا۔'' ناحق کو زخم پا کر نسرین کے جو منہ میں آیا، بولتی چلی گئی۔

''وہ ہمارا مسئلہ ہے آپا نسرین! ہم آپ دیکھ لیں گے۔

تم اپنا لونڈا سنبھالو۔ ایسے ہر کسی سے بھڑتا رہا تو کسی دن اپنی ہڈی پسلی تڑوا بیٹھے گا۔ عارف نے تو پھر محلے داری کا لحاظ کر لیا، کوئی دوسرا لحاظ نہیں کرے گا۔" شبو کے لیے نسرین کا رونا ناقابلِ برداشت ہو گیا تو اسے کھری کھری سنا دیں۔

"سن رہی ہو تائی جی؟" نسرین نے فوراً تائی جی کو شکایتی انداز میں پکارا۔

"بہتر ہے بتو! اب تم اپنے گھر کو جاؤ۔ ایک حد سے زیادہ تو کوئی بھی نہیں سن سکتا۔" تائی جی کا لہجہ بھی روکھا ہو گیا تو نسرین منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

"کاہے کو اسے منہ لگایا گروجی! یہ کم بختیں ساری کی ساری فسادن ہیں۔ اپنے بچوں کے کرتوت دکھائی نہیں دیتے اور چل پڑتی ہیں ان کی حمایت کرنے۔" شبو کو اب بھی غصہ آ رہا تھا۔

"اپنے بچوں کو وہ خود جانیں، ہمیں تو اپنے بچے کی تربیت کرنی ہے۔" تائی جی نے شبو کو جواب دیا پھر عارف کی طرف دیکھ کر محبت سے بولی۔

"ادھر آ میرا لال! یہاں بیٹھ میرے پاس۔" اس نے تخت پر اپنے قریب عارف کے لیے جگہ بنائی تو وہ کچھ روٹھا ہوا سا اس کے پاس جا بیٹھا۔

"ناراض ہے مجھ سے؟" تائی جی نے اس کی ٹھوڑی کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے چھوا۔ عارف کی اجلی رنگت اور نازک نین نقش اب بھی ویسے کے ویسے تھے لیکن گزرے دنوں نے قد اور صحت پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ اچھی کھلائی پلائی اور باقاعدہ ورزش کے نتیجے میں اب وہ ماضی کے مقابلے میں خاصا مضبوط دکھائی دینے لگا تھا۔

"دیکھ میرے چاند! طاقت اور بہادری کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کے ساتھ زیادتی کی جائے۔ غصے اور دشمنی میں بھی انصاف سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ تو نے رشید کو اس کی چھیڑ خانی پہ مارا تو اچھا کیا لیکن یہ کتاب پھاڑنے اور پیسے چھیننے والی بات غلط تھی۔ مجھے تجھے بہادر بنانا ہے، غنڈا نہیں۔"

"سوری اماں!" وہ اماں تائی کی بات پوری طرح سمجھا تھا یا نہیں، ان سے معذرت کر لی تھی۔ جواب میں تائی نے اسے گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔

"دادا......!" وہ جانے کب تک ماضی کی یاد میں ڈوبا رہتا، اشفاق نے پکارا تو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

"اس لونڈے کے دماغ کی گرد جھاڑ دی ہے دادا! آگے جو آپ کا حکم ہو، وہ بتا دیں۔" اشفاق کارکردگی کی رپورٹ دیتا اشفاق اس سے مؤدبانہ پوچھ رہا تھا۔

"چل، چلتے ہیں ذرا اس کے پاس۔" اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اشفاق مؤدبانہ اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ آگے پیچھے چلتے وہ ایک اندرونی کمرے میں موجود اس لڑکے تک پہنچے جو ایک کرسی پر رسیوں سے بندھا بیٹھا تھا اور اس کا حلیہ اس کے ساتھ گزری کا فسانہ سنا رہا تھا۔

"معافی دے دیں دادا! میری توبہ، میرے ماں باپ کی توبہ جو آئندہ ایسی غلطی کی۔" اسے دیکھتے ہی لڑکے نے دہائیاں دینا شروع کر دیں۔

"جب میرے آدمیوں نے زبانی تجھے سمجھایا تھا تو سمجھ جاتا۔ کم از کم تیرا خوبصورت تھوبڑا خراب ہونے کی نوبت تو نہ آتی۔" اس نے لڑکے کے چہرے پر پڑے نیل کے نشانات کی طرف دیکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"بس دادا! غلطی ہو گئی، پر آئندہ کبھی نہیں ہو گی۔" لڑکا اس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا۔

"ہونی بھی نہیں چاہیے ورنہ تُو معافی مانگنے کے لیے زمین کے اوپر موجود نہیں رہے گا۔" وہ سخت لہجے میں غرایا پھر اشفاق کی طرف رخ کر کے بولا۔ "کاجل کو بلاؤ، یہ کاجل کا مجرم ہے۔ اگر وہ مان گئی تو اسے رہا کر دینا۔"

"جی اچھا دادا!" اشفاق نے مؤدبانہ کہا اور پھر اپنے موبائل پہ پیغام بھیجنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں میں اسٹائلش سے جوڑے میں ملبوس کاجل وہاں موجود تھی۔

"تیرا مجرم تیرے سامنے ہے کاجل! تو بتا، اسے معافی دینی ہے یا اور پھینٹی لگانا ہے؟"

"مجھے معاف کر دو کاجل! میں آئندہ اس راستے پہ بھی نہیں گزروں گا جہاں تم موجود ہو۔" کاجل کی طرف سے جواب ملنے سے قبل ہی لڑکا اس کی خوشامد کرنے لگا۔ کاجل اس پر ایک نگاہِ غلط ڈالے بغیر عارف کی طرف رخ کر گئی اور سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"یہ ذرا سی جسمانی اذیت اس تکلیف کا بدل نہیں ہو سکتی جو میرے دل و دماغ نے اس کے گھٹیا جملوں اور غلیظ مذاق کے نتیجے میں سہی لیکن میں صرف اور صرف اس وجہ سے معاف کرنے کے لیے تیار ہوں دادا کہ اس نے آپ کے سامنے آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"بس تو میری گارنٹی ہے تجھے۔ آئندہ اس نے تجھے تنگ کیا تو دنیا دیکھے گی اس کا حال۔ زبان سے معافی مانگنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔" عارف نے کاجل کے سر پر ہاتھ رکھ کر یقین دہانی کروائی پھر لڑکے کی طرف سخت نظروں سے

urdunovels.com

دیکھتے ہوئے بولا۔

"کھوپڑی میں اچھی طرح بٹھا لے یہ بات کہ کاجل ہماری بچی ہے، اس پر غلط نظر ڈالی تو تیری آنکھیں نکال دی جائیں گی۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں دادا! آئندہ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا اس کی طرف۔" لڑکے کی جان پر بنی تھی اس لیے جھٹ وعدہ کرلیا۔

"جانے دے اشفاق اسے۔" عارف نے حکم صادر کیا اور خود کمرے سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کہانی ختم نہیں، شروع ہونے جارہی ہے۔

☆☆☆

"سلام بی بی سائیں!" نفیس سے لباس پر بڑی سی روایتی سندھی کڑھائی والی چادر اوڑھے بیگم جلال شاہ کمرے میں داخل ہوئیں تو مہرو اور صبوحی احتراماً اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئیں۔

"وعلیکم السلام، بیٹھو بیٹھو۔" انہوں نے شفقت سے جواب دیتے ہوئے انہیں بیٹھنے کو کہا اور خود بھی مقابل ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"بڑی سوہنی ہوگئی ہے مہرو! کئی برس پہلے تو نشی جی کے ساتھ آئی تھی، تبھی کا دیکھا ہوا ہے میں نے تجھے۔ تو نے تو کبھی عید تہوار پر بھی سلام کے لیے ادھر آکر نہیں جھانکا۔" وہ شکوہ ضرور کررہی تھیں لیکن انداز میں روایتی زمینداروں جیسا طنز نہیں بلکہ اپنائیت تھی۔

"یہ کدھر گھر سے باہر نکلتی ہے بی بی سائیں! جب تک اسکول میں پڑھتی تھی بس تبھی تک ہم نے گھر سے باہر اس کی شکل دیکھی۔ اب تو بس عید کے چاند کی طرح ہی شکل سے نکلتی ہے۔ گھر بھی جاؤ تو سارا ٹائم کتابوں میں سر دیے بیٹھی دکھائی دیتی ہے۔" جواب مہرو کے بجائے صبوحی نے دیا جسے سن کر بی بی سائیں ہنس پڑیں پھر یاد آنے پر پوچھنے لگیں۔

"دسویں کے امتحان میں تو نے پورے ضلعے میں ٹاپ کیا تھا نا مہرو؟"

"جی بی بی سائیں!" مہرو نے دھیمی آواز میں مختصر جواب دیا۔

"پھر آگے پڑھائی کی؟" انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"پرائیویٹ انٹر کیا تھا، اب بی اے کے پرچوں کی تیاری کررہی ہوں۔"

"اسے ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا بی بی سائیں! پر پاس میں لڑکیوں کا کوئی کالج ہی نہیں ہے تو یہ کیا کرتی؟ چاچا، چاچی اسے شہر بھیج کر ہاسٹل میں رہنے پر راضی نہ ہوئے ورنہ یہ بھی ماسٹر صاحب کے بیٹے شاہو کی طرح ڈاکٹرنی بن جاتی۔ شاہو سے بھی زیادہ ذہین ہے ہماری مہرو۔" صبوحی نے جلدی جلدی ساری تفصیل کہہ سنائی۔

"ڈاکٹرنی بن جاتی تو کیا پتا پھر تیری مہر جائی بننے کو راضی نہ ہوتی۔" انہوں نے صبوحی کو چھیڑا۔

"کیسے نہ بنتی، میں خود اس کا کسی ڈاکٹر سے رشتہ جڑوا دیتی۔" صبوحی کے لہجے میں موجود بے ساختگی اور اخلاص خالص تھا جس نے بی بی سائیں کو خوش کیا وہ ہنستے ہوئے مہرو سے بولیں۔

"تو تو بڑی خوش نصیب ہے مہرو جو اتنی پیار کرنے والی نند مل رہی ہے تجھے۔"

"صرف میں ہی نہیں، میرا ادا بھی بہت چاہتا ہے اسے۔ بس کا چھالا بنا کر نہ رکھا تو میرا نام بدل دیجیے گا۔" صبوحی نے بڑھ چڑھ کر دعویٰ کیا۔

"بس کر، چپ ہوجا۔" مہرو نے چپکے سے اس کے پہلو میں کہنی مارتے ہوئے دھیمی آواز میں ٹوکا۔

"لو جی، میں نے کیا کہا، بس سچ ہی تو بولا ہے۔" صبوحی کی زبان بھلا کہاں رکنے والی تھی۔ بی بی سائیں مسکرا کر دلچسپی سے سب سنتی رہیں۔ وہ واجبی سے نقوش والی لگ بھگ پچاس برس کی خاتون تھیں جو اپنے چہرے کے نرم تاثرات کے باعث اپنے اندر ایک عجیب سی کشش رکھتی تھیں۔ کم از کم مہرو کو تو وہ بہت اچھی لگی تھیں۔ ان کے اچھا ہونے کے لیے یہ دلیل ہی کیا کم تھی کہ انہوں نے اس کی شادی کی خبر سن کر خاص پیغام بھیج کر اسے اپنے پاس بلوایا تھا اور برابری کی سطح پر بٹھا کر گفتگو کررہی تھیں۔ یہاں تک کہ ملازماؤں نے کسی بہت معزز مہمان کی طرح ان کی خاطر مدارات کے لیے میز پر لوازمات بھی لاکر سجانے شروع کردیے تھے۔

"چلو چھوکریو! کھانا پینا شروع کرو۔ یہ سب تمہارے لیے ہی ہے۔" ان کی طرف سے پیار بھرا حکم ملا تو ان دونوں نے جھجکتے ہوئے پلیٹ میں اپنے لیے چند چیزیں نکالیں۔ بی بی سائیں اصرار سے ان کو مزید کھانے پر اکساتی رہیں۔ مہمان نوازی کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو انہوں نے ایک ملازمہ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ چند لمحوں میں اس نے ایک خوبصورت کپڑے سے ڈھکا ہوا بڑا سا تھال لاکر میز پر رکھ دیا اور بی بی سائیں کے اشارے پر تھال پر سے کپڑا ہٹا لیا۔ تھال میں زیور والا سرخ مخملیں ڈبا، زرتار سرخ جوڑا، چھوٹی

urdunovels.com

سی مٹھائی کی ٹوکری اور ایک چھوٹا ہوا لفافہ رکھا تھا۔

"یہ میری طرف سے تیری شادی کا تحفہ ہے مہرو! رب سائیں خیر سے تجھے اپنے گھر کا کرے اور سدا خوش اور آباد رکھے۔" انہوں نے قیمتی تحائف کے ساتھ ہی اپنی دعاؤں سے بھی نوازا۔

"آپ کی دعائیں ہی میرے لیے سب سے قیمتی تحفہ ہیں بی بی سائیں! آپ نے اتنا سارا تکلف کیوں کیا؟" مہرو کو اتنا کچھ لینے میں جھجک محسوس ہوئی۔

"بیٹی جیسی ہو تم میرے لیے اور بیٹیوں کو تو دے دلا کر ہی رخصت کیا جاتا ہے۔ پھر منشی جی کی اتنی خدمات بھی تو ہیں اس حویلی کے لیے۔ اتنے برسوں سے وہ ایک پائی کا بھی ہیر پھیر کیے بغیر سب کچھ اتنی ایمانداری سے سنبھال رہے ہیں۔ یہ سب ان کا حق بنتا ہے۔" انہوں نے اسے سمجھایا پھر صبوحی کو مخاطب کر کے بولیں۔

"ذرا اپنی بہنلی کو یہ دوپٹا تو اوڑھا کر دکھاؤ۔ کاریگر عورتوں کو خاص آرڈر دے کر میں نے اس کے لیے اس جوڑے پر کام کروایا ہے۔ دیکھوں تو کیسا لگتا ہے اس پر یہ رنگ۔"

"جی بی بی سائیں!" صبوحی فوراً حکم کی تعمیل کے لیے حرکت میں آ گئی اور بھاری کام کا سرخ دوپٹا احتیاط سے کھول کر مہرو کے سر پر اوڑھایا۔ سرخ زرتار دوپٹے کے ہالے میں اس کا چاند سا چہرہ دمکنے لگا۔ چہرے پر چھائی حیا کی سرخی کسی مہنگے ترین بیوٹی پارلر کے میک اپ سے بڑھ کر اس کے روپ کو دو آتشہ کر گئی۔

"ماشاء اللہ!" بی بی سائیں کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ اسی وقت دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور ایک اونچا پورا جوان مرد اندر داخل ہوا۔

"آہا، دلہن!" مہرو پر نظر پڑتے ہی اس نے کسی بچے کی طرح خوشی سے قلقاری ماری اور لپک کر اس کے قریب آیا۔

"میری منکوحہ دلہن آ ہے نا اوی سائیں؟"

"نہیں سجاول شاہ! یہ تمہاری دلہن نہیں ہے، یہ سرمد کی دلہن ہے۔" بی بی سائیں نے اسے سمجھایا۔

"نہیں، یہ میری دلہن ہے، سجاول شاہ کی دلہن۔ میں اسے یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔ سرمد سے کہیں اپنے لیے دوسری دلہن ڈھونڈ لے۔" اس نے کسی بچے کی طرح مچل کر کہا اور تیزی سے مہرو کی کلائی اپنی گرفت میں لے لی۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ مہرو کو اپنی کلائی کی ہڈی ٹوٹتی محسوس ہوئی اور درد کی شدت کے باعث لبوں سے ایک تیز سسکاری نکلی۔

"اچھے بچے ضد نہیں کرتے سجاول! دیکھو دلہن کو درد ہو رہا ہے، اس کا ہاتھ چھوڑ دو۔" بی بی سائیں جن کے اپنے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے، پیار سے اسے سمجھانے لگیں۔

"نہیں۔" سجاول نے زور زور سے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"میں اس کا ہاتھ چھوڑوں گا تو یہ سرمد کے پاس چلی جائے گی، میں نہیں جانے دوں گا اسے سرمد کے پاس۔" اس کی گرفت لحہ بہ لحہ مزید سخت ہوتی جا رہی تھی۔ بے بسی اور تکلیف کی شدت سے مہرو نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔

"مغل، اللہ داد...... کدھر ہیں دونوں۔ انہیں بلاؤ، بولو آ کر سنبھالیں سجاول کو۔" بی بی سائیں گھبراہٹ میں خود ملازمین کو آوازیں دے رہی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اچانک ہی کمرے میں ایک شخص داخل ہوا اور بھاری بلند آواز میں استفسار کیا۔

"سائیں!" آنے والے کو پہچان کر اس ساری صورت حال پر حیران پریشان کھڑی صبوحی کے لبوں سے سرگوشی نکلی۔ دوسری طرف مہرو نے محسوس کیا کہ سجاول کی اس کے ہاتھ پر گرفت پہلے کے مقابلے میں ذرا کمزور ہو گئی ہے۔

"یہ منکوحہ دلہن آ ہے۔" گرفت کی طرح لہجہ بھی کمزور ہو گیا تھا۔

"چھوڑو اس کا ہاتھ۔" آنے والا جسے وہ سائیں جلال شاہ کی حیثیت سے شناخت کر چکی تھیں، سجاول کو اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں غرایا تو سجاول نے ایک جھٹکے میں مہرو کی کلائی چھوڑ دی اور تیزی سے کمرے سے باہر بھاگ گیا۔

"کمرے میں بند کر کے رکھا کرو اس پاگل کو ورنہ کل کو کسی کی جان لے لے گا۔" جلال شاہ نے سپید پڑتا چہرہ لیے کھڑی بی بی سائیں کی طرف دیکھ کر سرد لہجے میں کہا اور پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے سے قبل اس نے مہرو پر ایک نظر ڈالی تھی۔ ایک ایسی نظر جس کے مقابلے میں مہرو کو اپنی کلائی پر سجاول کی سخت گرفت کی وجہ سے ہونے والی تکلیف ہیچ محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

ایک بہت تکلیف دہ اور کٹھن دن کا اختتام اس طرح ہوا تھا کہ غم اور تھکن سے نڈھال وجود بستر پر دراز ہونے کے باوجود سکون نہیں پا رہے تھے۔ اپنی چارپائی پر لیٹی رحمت بی بی کے ذہن میں پورے دن کے مناظر کسی فلم کے ٹکڑوں کی طرح چل رہے تھے۔ کبھی منشو کا جاگتی آنکھوں دیکھا گیا خواب یاد آتا، کبھی چارپائی پر پڑی رفاقت کی خون

...گئی، بڑی اپنی بہت...
...مغرور سے... اس کی بیٹیوں کے بین کانوں میں گونجنے لگتے۔ سب سے خوفناک یاد ان سرخ آنکھوں کی تھی جنہیں اس نے اپنے منو کے وجود پر مرکوز دیکھا تھا۔ "بڑی مونچھوں والا خونی" الفاظ کسی اور نے سنے تھے یا نہیں، انہیں اس سرخ آنکھوں والے نے واضح طور پر سنا تھا۔ ب ہی تو وہ بری طرح چونک گیا تھا اور منو کو گھور رہا تھا۔

"نیند نہیں آرہی رحمت؟" اس کے بار بار کروٹیں بدلنے پر آنکھوں پر بازو رکھ کر چت لیٹے اللہ ڈنو نے آخرکار اسے پکار ہی لیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی۔ بار بار بھتیجے کا خون آلود لاشہ اور بھائی کے جھکے ہوئے کندھے نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔

"منھنجو دل گھبرائی رہیو آہے۔" رحمت بی بی بستر پر اٹھ بیٹھی۔

"منھنجو دل کھے بھی ھک پل بھی سکون نا ھی۔" اللہ ڈنو نے اعتراف کیا پھر طیش زدہ لہجے میں بولا۔ "منھنجی وس میں ہو تو مان رقاقت کے قاتل کو جان سے مار دوں۔"

"اھڑی گالھ نہ کر اللہ ڈنو! خون خرابے کی گالھ نہ کر۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔" رحمت بی بی رونے والی ہو گئی۔

"کیسے نہ کروں، میرے بھائی کا گھر اجڑ گیا۔ تجھے نہیں معلوم کتنا پیارا تھا مجھے رفاقت؟ اپنی گود میں کھلا کر بڑا کیا تھا اسے۔" غم سے اللہ ڈنو کا لہجہ چیخ رہا تھا۔

"پیارا تو مجھے بھی بہت تھا پر......" رحمت بی بی بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔

"چھا گالھ آ ہے رحمت؟ تو موں کھے پریشان نظر اچی رہی آھیاں۔ (کیا بات ہے رحمت؟ تو مجھے پریشان نظر آرہی ہے)۔" اللہ ڈنو نے پہلی بار رحمت بی بی کے انداز کا غیر معمولی پن محسوس کیا اور خود بھی لیٹے سے اٹھ گیا۔

"پریشانی ای جی گالھ آھی۔" رحمت نے اعتراف کیا اور الف تا یے ساری بات اللہ ڈنو کو کہہ سنائی۔

"تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، وہیں پکڑ کر گاڑ دیتے اس کو۔" اللہ ڈنو کی آواز غصے اور طیش سے بلند ہو گئی۔

"اسی لیے نہیں بتایا، بچے کی بات پر اتنا ہنگامہ کون کرتا ہے۔" رحمت بی بی نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بچے کی بات......؟" اللہ ڈنو چلایا۔

"بچے کی بات نہیں رحمت! وہ منو کی بات تھی۔ تو اچھی

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ مئی 2026ء کی جھلکیاں

دشمن کا مہمان
محمود شام جیسے کہنہ مشق قلمکار کا دلچسپ سفرنامہ

نظریہ ساز
اصول طب میں انقلاب برپا کردینے والے ڈاکٹر کی سوانح حیات

دریچہ ماضی
کھار اور کی گلیوں سے نکل کر انگلینڈ کے ماہر ڈاکٹروں کی صف میں شامل ڈاکٹر کی خود جی

عکس بولان
سیر پاکستان کے حوالے سے ایک نہایت دلچسپ تحریر

تاریک کنارہ
اس ڈائن بہن کی سچ بیانی جس نے اپنی ہی بڑی بہن کو اجاڑ دیا

اور بہت کچھ علاوہ

اور بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، سچے واقعات
وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

طرح جانتی ہے کہ مشو کی زبان سے نکلا ہر لفظ سچا ہوتا ہے۔"

"پر تو بس تو اور میں جانتے ہیں، قانون تو نہیں مانے گا نا اس بات کو۔" رحمت بی بی نے اسے سمجھایا۔

"قانون......" اللہ ڈنو نے غصے میں قانون کو گالی دی۔ "ہم اپنا انصاف خود کرتے ہیں بلکہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تو نام بتا مجھے اس خبیث کا؟" غصہ اللہ ڈنو کو کچھ سوچنے سمجھنے نہیں دے رہا تھا۔

"ہاں بن جا خونی، چڑھ جا سولی پر۔ پر اس سے پہلے میرا اور بچوں کا گلا گھونٹ دینا۔ سر سے تیرا سایہ اٹھنے کے بعد یہ دنیا ویسے بھی ہمیں نوچ کھائے گی۔" رحمت بی بی کو بھی غصہ چڑھ گیا اور بولنے پر آئی تو غصے میں بولتی ہی چلی گئی۔

"میں نے تجھے یہ گالھ اس لیے نہیں بتائی تھی کہ میں مشو کے واسطے ڈر گئی تھی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ بدمعاش ہمارے مشو کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

"تو ٹھیک ہے پر مشو کے ان کان بچائیو لائے بھی تا ان ماڑھن جو نالو معلوم عین گھرجی۔" اللہ ڈنو نے خود کو سنبھال لیا اور رسان سے دلیل دی۔

"موں کی نالو معلوم نا هی، بس حلیہ بتا سکتی ہوں۔" رحمت بی بی بڑی مونچھوں والے کا حلیہ بتانے لگی جسے اللہ ڈنو نے بہت توجہ سے سنا۔

"ٹھیک ہے، اب تو سکون سے سو جا۔ کچھ نہیں ہونے دوں گا میں تیرے مشو کو۔" اللہ ڈنو نے کیا سوچا تھا، یہ تو رحمت بی بی کو نہیں بتایا بس ایک وعدہ اسے تھما دیا۔ ایک عام سی سیدھی سادی عورت کے لیے اپنے سر کے سائیں کا وعدہ ہی سب کچھ تھا جس پر یقین کر کے وہ کافی حد تک پرسکون ہو گئی۔ اس بار وہ بستر پر لیٹی تو تھوڑی سی کوشش سے ہی نیند بھی مہربان ہو گئی البتہ اللہ ڈنو کی آنکھوں سے نیند ہنوز غائب تھی اور دماغ کسی گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"آپ والدہ ہیں اس کی؟" ہیڈ ماسٹر نے ایک اچٹتی سی نظر حسب معمول تیز رنگ کی ساڑی پہنے تاجی کو دیکھا۔

"سب کو معلوم ہے، آپ نئے آئے ہیں اس لیے آپ کو خبر نہیں ہوگی کہ یہ تاجی کا بیٹا ہے۔" تاجی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"اور اس کے والد؟" ہیڈ ماسٹر کی آنکھوں میں ایک کھوج سی تھی۔

"لڑکے کا رشتہ طے کرنے تو نکلی نہیں ہوں میں کہ پورا خاندان ساتھ لے کر آتی۔ آپ بولو، آپ کو کیا کمپلین ہے بچے سے؟ اس کی غلطی ہوئی تو ابھی آپ کے سامنے مرغا بنا دوں گی اسے۔" تاجی کا دبنگ انداز ہیڈ ماسٹر کو کھسیاہٹ میں مبتلا کر گیا اور اسی کھسیاہٹ کو چھپانے کے لیے تیز لہجے میں بولے۔

"کچھ خبر ہے آپ کو، آپ کا بیٹا اسکول میں کیا کرتا پھر رہا ہے؟ بجائے پڑھنے کے، بدمعاشی دکھانے آتا ہے یہ اسکول۔"

"کیا بدمعاشی دکھائی ہے اس نے؟" ہیڈ ماسٹر کے مقابلے میں تاجی کا لہجہ بہت پُرسکون تھا۔

"اپنی جماعت کے لڑکوں کو بری طرح مارا پیٹا ہے اس نے۔ ان لڑکوں کے والدین بہت غصے میں تھے اور اس سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ میں نے مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں ٹھنڈا کیا کہ بچوں میں ایسے جھگڑے ہو جاتے ہیں، میں عارف کے پیرنٹس کو بلا کر ان سے کمپلین کروں گا تاکہ آئندہ کے لیے وہ اسے سمجھا بجھا کر رکھیں۔"

"اچھا تو آپ ان لڑکوں اور ان کے والدین کو بھی ادھر ہی بلا لیں تاکہ سب کے سامنے ہی پوری بات ہو جائے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے، فی الحال میں آپ کو انفارم کر رہا ہوں۔ آپ مجھے گارنٹی دے دیں کہ آئندہ یہ ایسا کچھ نہیں کرے گا ورنہ مجبوراً مجھے اس کا نام اسکول سے خارج کرنا پڑے گا۔" تاجی کے مطالبے نے ہیڈ ماسٹر کو شپٹاہٹ میں مبتلا کر دیا لیکن انہوں نے بہت خوبصورتی سے خود کو سنبھال کر تاجی پر دباؤ ڈالنے کے لیے سخت لہجے اور دھمکی کا استعمال کیا۔

"نہیں ہیڈ ماسٹر صاحب! جنہیں شکایت ہے اصل میں ان کی تسلی بہت ضروری ہے۔ آپ بلائیں ان لڑکوں اور ان کے ماں باپ کو، مجھے جو گارنٹی دینا ہے، ان کے سامنے ہی دوں گی۔" تاجی نے اپنے ٹھوس لہجے سے ثابت کر دیا کہ وہ ہیڈ ماسٹر کے دباؤ میں نہیں آئے گی۔

"آپ کیوں ضد کر رہی ہیں۔ میں اتنا بکھیڑا پھیلا کر اپنا ٹائم ویسٹ نہیں کرنا چاہتا۔" ہیڈ ماسٹر صاحب جھنجلا گئے۔

"اور میں یہ سب ہوئے بغیر یہاں سے واپس جانے والی نہیں۔ آپ بلوائیں ان لوگوں کو، جب تک وہ نہیں آئیں گے میں یہاں سے ہلوں گی بھی نہیں۔" تاجی نے اعلان کیا اور پھر اس ساری گفتگو میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے موجود عارف کی طرف رخ کر کے بولی۔

"جا بچہ! باہر جا کر شیبو باجی اور باقی سب سے کہہ دے کہ جب تک اماں اجازت نہ دے، اسکول کے گیٹ

دم کر بیٹھی رہی۔ اب اماں کی اجازت کے بغیر نہ کوئی محرّل سے باہر جائے گا اور نہ ہی اندر آئے گا۔ آج اسکول کی چھٹی کی گھنٹی اماں کی اجازت سے ہی بجے گی۔"

"یہ...... یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ یہ سراسر غنڈا گردی ہے۔ میں پولیس کو بلواؤں گا۔" ہیڈ ماسٹر صاحب بیک وقت غصے اور گھبراہٹ میں چلا دکھائی دیے جبکہ عارف ہر بات سے بے نیاز تاجی کے حکم کی تعمیل کے لیے حرکت میں آ چکا تھا۔

"آپ سیدھے سبھاؤ میری بات مان لیتے تو مجھے انگلیاں ٹیڑھی نہ کرنا پڑتیں۔ رہی پولیس کی بات، تو ان کو رہنے دیں۔ آپ کا ان سے زندگی میں مشکل سے دو چار بار ہی پالا پڑا ہوگا، ہمارا روزانہ کا میل جول ہے۔ آپ سے زیادہ وہ ہماری سنیں گے۔" تاجی کا اعتماد ہیڈ ماسٹر کو نروس کر گیا۔ انہوں نے بے اختیار ہی جیب سے رومال نکال کر ماتھے پر آیا پسینا صاف کیا۔

"ویسے پولیس کو بلائیں گے کیسے آپ؟ اسکول سے باہر تو اب کوئی قدم نہیں نکال سکتا اور فون ہے نہیں آپ کے پاس۔ سرکار سترہ گریڈ کے ڈپٹی کمشنر کو گھر، گاڑی، ٹیلی فون اور جانے کیا کیا دیتی ہے لیکن سترہ گریڈ کا اسکول ہیڈ ماسٹر بس لوگوں کے کاغذات پر ٹھپے لگانے کی حد تک ہی افسری دکھا سکتا ہے۔" تاجی نے لگے ہاتھوں ہیڈ ماسٹر کو آئینہ بھی دکھا دیا کہ ملکی نظام میں اس کی حیثیت کیا ہے۔

"میں ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتا ہوں۔" سٹپٹاتے ہوئے ہیڈ ماسٹر اپنی کرسی چھوڑ کر آفس سے باہر نکل گئے۔ تاجی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر جا کر وہ باقی اسٹاف سے مشاورت کرے گا۔ ہیڈ ماسٹر نیا تھا اور اسٹاف پرانا۔ تاجی سے واقف پرانے اسٹاف نے ہیڈ ماسٹر کو بھی یہی مشورہ دینا تھا کہ تاجی کی بات مان لینے میں ہی بھلائی ہے۔

پندرہ منٹ بعد ہیڈ ماسٹر آفس سے واپس آئے تو ان کا انداز بدلا ہوا تھا، انہوں نے نہ صرف تاجی کا مطالبہ تسلیم کر لیا تھا بلکہ اس کے لیے چائے بھی بنوائی تھی۔ جب تک مطلوبہ لڑکے اور والدین اسکول میں حاضر نہیں ہو گئے، وہ لوگ اسکول کے ملازم کی تیار کردہ چائے سے لطف اٹھاتے رہے۔

"ہاں بھئی، اب بتاؤ کیا قصہ ہے؟ کیا کیا ہے عارف نے تم لوگوں کے ساتھ؟" تاجی نے پیچھے کو گھبرائے کھڑے لڑکوں سے نرمی سے دریافت کیا۔

"بچوں سے کیا پوچھنا، ہم بتاتے ہیں۔ تمہارے لڑکے نے ہمارے بچوں کو اتنی بری طرح مارا پیٹا ہے کہ ان کے جسموں پر نیل پڑ گئے ہیں۔" لڑکوں کی طرف سے جواب آنے سے قبل تنومند وجود والے ایک لڑکے کے باپ نے غصے سے دخل دیا اور جوش میں کھڑے ہو کر اپنے بیٹے کی قمیص ایک جھٹکے سے اٹھا کر اس کی پیٹھ پر پڑے نیل کے نشانات دکھائے۔

"ٹھیک ہے، میں نے دیکھ لیے نشان اور بہت کچھ سمجھ بھی گئی لیکن ان لوگوں سے سننا چاہتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟ مطلب کہ ایسی نوبت آئی کہ بات مار پیٹ تک چلی گئی؟"

"تمہارے لڑکے کی بدمعاشی ہے اور کیا۔" اس شخص نے چمک کر جواب دیا۔

"تم بولو لڑکے!" اس شخص کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے تاجی لڑکے سے مخاطب ہوئی۔

"ایسے ہی جی، بس اس کی عادت ہے خوامخواہ بچوں پر دھونس جمانے کی۔" تاجی کی اندر تک اترتی نظروں نے لڑکے کو کوئی ٹھوس بہانہ نہ بنانے دیا۔

"تم بتاؤ۔" تاجی نے دوسرے لڑکے کو مخاطب کیا۔

"ہماری ارشد سے کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ یہ خوامخواہ بیچ میں کود پڑا اور مار کٹائی شروع کر دی۔" اس نے عارف کو کینہ توز نگاہوں سے گھورتے ہوئے وجہ بیان کی۔

"بحث نہیں ہو رہی تھی، تم دونوں مل کر اس بیچارے کو مار رہے تھے، وہ بھی اس بات پر کہ اس نے ٹیسٹ میں تمہیں چیٹنگ نہیں کروائی تھی۔" عارف جواب تک خاموش کھڑا رہا تھا، چیخ کر بولا۔

"تو تجھے چاہیے تھا ہیڈ ماسٹر سے آ کر شکایت کرتا، خود کیوں خدائی فوجدار بن کر بیچ میں کود پڑا؟" تنومند آدمی نے طرّاری دکھاتے ہوئے عارف کو دبانے کی کوشش کی۔

"باتھ روم کے پیچھے لے جا کر مار رہے تھے یہ ارشد کو، وہ تو میں اتفاق سے اسی وقت باتھ روم چلا گیا تو مجھے آوازیں آ گئیں۔ اب وہاں سے میں اتنی دور ہیڈ ماسٹر صاحب کے آفس تک آتا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر جاتا تو اس وقت تک تو یہ دونوں مل کر اس بیچارے کی ہڈی پسلی ایک کر چکے ہوتے۔" عارف کے پاس اپنے عمل کی دلیل موجود تھی۔

"دیکھو میاں! میں نے اپنے بچے کو ظلم پر خاموش رہنا سکھایا ہی نہیں۔ نہ یہ خود پر ظلم سہتا ہے اور نہ دوسروں پر ہوتا دیکھ سکتا ہے۔ تم اسے بیکار کی نصیحتیں کرنے کے بجائے بہتر ہوگا اپنے بچوں کی تربیت پر زور دو۔ اس عمر میں انہیں چیٹنگ اور دھونس بازی کی عادت پڑ گئی تو آگے جا کر وہ وہ

دکھیں کریں گے کہ تم اپنا سر پکڑ کر رو دو گے۔" تاجی نے متنبہ کیا۔

"میرے خیال میں صورت حال واضح ہونے کے بعد اب مزید بحث مباحثے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔" ہیڈ ماسٹر نے گلا کھنکھارتے ہوئے گفتگو میں دخل دیا اور دونوں لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"نوید اور شہزاد تم دونوں ایک معافی نامہ لکھ کر اس پر اپنے اپنے والد سے دستخط کرواؤ اور یاد رکھو کہ آئندہ اگر ایسی کوئی حرکت کی تو اسکول سے نکال دیے جاؤ گے۔"

"واہ ہیڈ ماسٹر صاحب! یہ آپ نے خوب انصاف کیا ہے۔ اس جھوٹے لڑکے کی بات مان کر خوامخواہ ہم سے معافی نامے لکھوا رہے ہیں اور وہ جو ہم نے آپ سے شکایت کی تھی، اس پر آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔" مخنی شخص نے فیصلہ سن کر احتجاج کیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے مسٹر! پہلے میں آپ کے شور مچانے پر عارف کو ڈانٹ چکا ہوں لیکن کچھ دیر پہلے میں نے ارشد، ان کے کلاس ٹیچر اور ایک دو دوسرے بچوں سے بھی معلومات لی ہیں اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ جھوٹ عارف نہیں بلکہ نوید اور شہزاد بولتے رہے ہیں۔" ہیڈ ماسٹر کی بات سے تاجی کو معلوم ہوا کہ پندرہ منٹ آفس سے باہر رہ کر وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

"میں دستخط کرنے کو تیار ہوں۔" مخنی آدمی مزید بحث کرتا، اس سے قبل شہزاد کے والد نے اعلان کر دیا۔

"ٹھیک ہے، میں بھی کر دیتا ہوں لیکن میرا دل مطمئن نہیں ہے۔" نوید کے مخنی سے ابا نے بادل ناخواستہ ہامی بھر لی۔

"دل کو مطمئن کر لیں۔ ایک استاد کی حیثیت سے یہ سارے بچے میرے اپنے ہیں۔ میں ان میں سے کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کروں گا۔" ہیڈ ماسٹر نے انہیں سبھاؤ سے سمجھایا پھر عارف کو مخاطب کر کے بولے۔

"تم بھی آئندہ خیال رکھنا میاں! اچھائی کا ساتھ دینا اچھی بات ہے لیکن ہر جگہ ہیرو بننے کے بجائے کہیں حدود کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ تم نے اس بات کا خیال نہیں رکھا تو زندگی میں کبھی کوئی بڑا نقصان بھی اٹھا سکتے ہو۔" عارف قائل ہوا یا نہیں، ان کے احترام میں سر جھکا لیا۔

☆☆☆

"مٹھو کتھے بھی ہامی (مٹھو کہیں نہیں ہے)۔" اللہ ڈنو ابھی گھر کے دروازے سے دور ہی تھا کہ سراسیمہ سی رحمت بی بی نے اسے آلیا۔

"چھا مطلب؟ مٹھو کتھے ہلیو ویو آہی؟ (کیا مطلب؟ مٹھو کہاں چلا گیا ہے؟)" اللہ ڈنو اس خبر کو سن کر سٹپٹا گیا۔

"مون کے خبر نا ہی۔ اسے سوتا چھوڑ کر پڑوس میں گئی تھی، واپس آئی تو وہ گھر پر نہیں تھا۔ سب جگہ دیکھ لیا، وہ کہیں نہیں ملا۔ تو کچھ کر مٹھو کے ابا! کہیں سے میرا مٹھو ڈھونڈ کر لا۔" اپنی بات کے اختتام پر رحمت بی بی نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ آس پڑوس کی عورتیں جو رحمت بی بی کی طرف سے مٹھو کی تلاش شروع کیے جانے کے باعث اس کی پریشانی سے آگاہ ہو گئی تھیں بلکہ خود بھی اس کے ساتھ اس کام میں حصہ بٹاتی رہی تھیں، اسے تسلی دلاسے دینے لگیں۔ پریشان حال اللہ ڈنو کو بیوی کو تسلی دینے کی بھی فرصت نہیں ملی اور وہ ان چند گنے چنے مردوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو ضعیفی یا کسی بیماری کی وجہ سے کام پر جانے کے لائق نہیں تھے اور گھر پر ہی رہتے تھے۔ ان افراد سے اسے جو معلوم ہوا اس کے مطابق مٹھو آخری بار کنوئیں کی طرف جاتا دکھائی دیا تھا۔ کنواں مٹھو کے پسندیدہ مقامات میں سے ایک تھا۔ اسے کنوئیں کے قریب لگے درختوں پر ڈلے جھولوں پر بیٹھ کر کنوئیں سے پانی نکالتی عورتوں کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ جب رحمت بی بی کنوئیں سے پانی بھرنے جاتی تھی تو وہ بھی برتن اٹھا کر اس کے ساتھ چل پڑتا تھا لیکن رفاقت کے قتل کے بعد سے رحمت بی بی نے اسے ساتھ لے جانا چھوڑ دیا تھا اور ایسا اس نے اللہ ڈنو کی ہدایت پر کیا تھا۔

اصل میں رحمت بی بی کی طرف سے رفاقت کے قتل میں کسی بڑی مونچھوں والے کے ملوث ہونے کی اطلاع سن کر وہ اس کی کھوج میں لگ گیا تھا۔ بنیادی معلومات اسے اپنے منجھلے بیٹے سے ہی مل گئی تھیں۔۔ اس کے پوچھنے پر کہ رفاقت کی میت پر بڑھ چڑھ کر کام کرنے والا بڑی مونچھوں والا شخص کون تھا؟ اسے بیٹے نے بتایا تھا کہ وہ بڑے شاہ سائیں کا نیا کارندہ تھا جو ابھی کچھ دن پہلے ہی کام پر لگا تھا اور گاؤں کے باہر سے آیا تھا۔ اللہ ڈنو کو اس کارندے کا نام شوکت معلوم ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی پتا چلا تھا کہ رفاقت کی تدفین والے دن کے بعد سے شوکت غائب ہے۔ اس نے اس کے ایک ساتھی کارندے سے سرسری طور پر اس کے متعلق معلوم کیا تو پتا چلا تھا کہ شوکت اپنی ماں کی بیماری کا بتا کر چھٹیوں پر گیا ہوا ہے۔

UrduNovels.com

ان سب معلومات کے حصول کے بعد اللہ ڈنو کو یقین ہو گیا تھا کہ مٹھو نے جو کچھ دیکھا تھا، وہی سچ تھا اور رفاقت کے قتل میں شوکت ہی کا ہاتھ تھا۔ وجہ البتہ اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔ شوکت گاؤں میں نووارد تھا، اس کی رفاقت سے کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ سننے میں آیا تھا کہ دونوں کے درمیان اچھی میل ملاپ ہو گئی تھی۔ وقوعہ سے ایک روز قبل بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے دکھائی دیے تھے۔ بہرحال جو بھی تھا، اللہ ڈنو اس سے اپنے لاڈلے بھتیجے کے خونِ ناحق کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن رحمت بی بی کے مسلسل سمجھانے بجھانے پر کوئی جذباتی قدم اٹھانے سے باز رہا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے بھائی کو بھی مٹھو کے خواب اور اپنے شکوک و شبہات کے متعلق آگاہ نہیں کیا تھا۔ کل اسے رحمت سے ایک اور عجیب بات معلوم ہوئی تھی۔

رحمت نے اسے بتایا تھا کہ عورتوں کے درمیان دبی زبان میں یہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ رفاقت کا گاؤں کی ایک لڑکی سموں سے عشق محبت کا سلسلہ چل رہا تھا۔ دونوں آپس میں چھپ چھپ کر ملا بھی کرتے تھے۔ سموں کی ایک سہیلی کے مطابق رفاقت سموں سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس انتظار میں تھا کہ پہلے اس سے چھوٹی بہن کا رشتہ کہیں طے ہو جائے تو پھر ماں سے سموں کے گھر رشتہ لے جانے کا کہے گا۔ ان ساری باتوں کی تائید کے لیے یہ دلیل کافی تھی کہ جس دن رفاقت قتل ہوا تھا، اس دن کے بعد سے سموں مسلسل بیمار تھی۔ اس نے کھانا پینا اور بات چیت کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا، زیادہ تر آنکھیں بند کیے بستر پر پڑی رہتی تھی یا اگر جاگ رہی ہو تو خاموش بیٹھی خلا میں گھورتی رہتی تھی۔ یہ کیفیت محض عام سی بیماری کے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ سموں کو کوئی صدمہ لگ گیا ہے۔

سموں اور صداقت کی اس داستانِ محبت کے ساتھ اللہ ڈنو کو جو سب سے اہم بات پتا چلی تھی، وہ یہ تھی کہ نوجوان چھوٹا سائیں بھی سموں میں دلچسپی رکھتا تھا۔ کچھ لوگوں نے اسے سموں کے راستے میں کھڑا ہوتا اور اس پر فقرے کستا دیکھا تھا لیکن کون تھا جو اسے روکتا ٹوکتا۔ یہ سارا گاؤں اس کے باپ کی ملکیت تھا اور اکثریت نے ذہنی طور پر یہ تسلیم کر رکھا تھا کہ زمینوں کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی وڈیرے سائیں کی ملکیت ہیں۔ اس ذہنی غلامی نے ان سے احتجاج کی صلاحیت چھین لی تھی۔

رحمت ... ...

ہونے کے باوجود ہونٹ سے بیٹھے تھے۔ انہیں شبہ تھا کہ شوکت نے کسی ذاتی دشمنی کے باعث نہیں بلکہ چھوٹے وڈیرہ سائیں کے اشارے پر رفاقت کا قتل کیا ہے۔ رقابت کی آگ، وہ بھی نوجوان چھوٹے سائیں جیسے بااختیار بندے کے دل میں لگی ہو تو سفید پوش باپ کے اکلوتے بیٹے کا قتل کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔ رفاقت بھی قتل کر دیا گیا تھا لیکن ابھی تو مسئلہ مٹھو کا تھا۔ شوکت کو خونی کہہ کر پکارنے والا مٹھو غائب ہو گیا تھا اور اس کے کم حیثیت والدین کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کہاں اور کیسے تلاش کریں؟

''کھوجی کے سدا ہوا، ان کے کھوج سراغ کڈھے۔ (کھوجی کو بلواؤ، اس سے کھوج کر سراغ لگائے)۔'' دیہی طرح کی باتوں اور آراء کے درمیان اللہ ڈنو کو ایک بڑے میاں کا دیا گیا یہ مشورہ اچھا لگا۔ فوراً اس سلسلے میں بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ ایک بچہ بھاگ کر گاؤں کے واحد کھوجی غلام فرید کو بلا لایا۔ فرید نے آ کر ساری صورت حال معلوم کی اور اعتماد سے بولا۔

''کا پہ مسئلو نا ہی۔ مان گھنو گولا کری چھڈیاں تھو تا مٹھو کتھے آ ہی (کوئی مسئلہ نہیں، میں ابھی کھوج لگا لیتا ہوں کہ مٹھو کہاں ہے؟)'' اس نے اللہ ڈنو کے شانے پر تھپکی دے کر اسے تسلی دی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

پچاس کے پیٹے میں موجود غلام فرید کو یہ فن اپنے باپ سے منتقل ہوا تھا۔ وہ اتنا ماہر کھوجی تھا کہ اکثر پولیس والے بھی اس سے مدد لیتے رہتے تھے۔ گاؤں کے عام لوگ اپنے مویشی وغیرہ گم ہو جانے یا کبھی کبھار ہونے والی چوری چکاری کی وارداتوں میں اس کی خدمات حاصل کرتے تھے بلکہ وہ آس پاس کے دوسرے گاؤں دیہاتوں سے بھی اس کام کے لیے بلوایا جاتا تھا لیکن اپنی خدا ترس فطرت کی وجہ سے اس کی آمدنی بہت معمولی تھی، پھر یہ کوئی مستقل روزگار بھی نہیں تھا۔ بعض اوقات تو مہینوں کسی کو اس کی خدمات کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے اس کے بیٹوں میں سے کسی نے اس کا فن سیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بچپن سے حالات کے جبر کے تحت محنت مزدوری کرنے والے بچے جوان ہونے تک اپنے اپنے طور پر مناسب مستقل روزگار سے لگ گئے تھے جبکہ غلام فرید آہیں بھرتا پھرتا تھا کہ اس کے باپ دادا کا فن اس کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔

... مٹھو کا کھرا۔'' تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد غلام فرید نے اعلان کیا۔

... اور اللہ ڈنو بھی اس وحشت ... تھے۔ اسی لیے رفاقت کی موت پر شدید غم و غصے میں جتلا

اب اللہ ڈتو، محلے کے ایک دو مرد اور کچھ بچے غلام فرید کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اگر ہمسائیاں رحمت بی بی کو سمجھا بجھا کر گھر کے اندر نہ لے گئی ہوتیں تو یقیناً وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ چل پڑتی۔

زمین پر جھکے جھکے چلتا غلام فرید مٹھو کا کُھرا اٹھاتے انہیں کنوئیں تک لے گیا تو اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ مٹھو آخری بار وہیں دیکھا گیا تھا۔ اب اصل میں یہ معلوم کرنا تھا کہ وہاں سے مٹھو کہاں گیا تھا؟ کنوئیں سے پانی بھرنے والی جن عورتوں نے مٹھو کو وہاں دیکھا تھا، وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکی تھیں۔ ان کے مطابق ان کی واپسی تک مٹھو وہیں جھولے پر بیٹھا ہوا تھا اور انہوں نے اسے کہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

غلام فرید نے اپنی مہارت سے یہ عقدہ بھی حل کرنا شروع کر دیا۔ کنوئیں سے آگے مٹھو کے قدموں کے نشان پرلی طرف موجود کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیے۔

"ہتی کان مٹھو جی قدمن جی نشانن سان گڈ ھک بیو ماڑھو جی قدمن جا نشان بھی شامل تھی ویا آھن۔ (یہاں سے مٹھو کے قدموں کے نشانات کے ساتھ ایک دوسرے آدمی کے قدموں کے نشانات بھی شامل ہو گئے ہیں)۔" کنوئیں والی جگہ سے تھوڑا ہی آگے جا کر غلام فرید نے اعلان کیا۔

اس بات کو سن کر اللہ ڈتو کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ غلام فرید کی یہ نشاندہی اس کے اس شک کو تقویت دے رہی تھی کہ کوئی ڈرا دھمکا کر یا بہانے سے بہلا پھسلا کر مٹھو کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

جیسے جیسے کُھرا اٹھایا جاتا رہا، اللہ ڈتو کی حالت غیر ہوتی گئی کیونکہ قدموں کے نشانات کھیتوں کے ساتھ چلتے چلتے وڈیرہ سائیں کی اوطاق کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ جو ایک دو مرد چلے تھے، وہ بھی یقیناً اس بات کو بھانپ چکے تھے اس لیے انہوں نے اپنی ضعیفی کا سہارا لے کر مزید چلنے کی طاقت نہ ہونے کا بہانہ بنایا اور واپس پلٹ گئے لیکن غلام فرید اپنی دھن کا پکا تھا۔ اپنے فن سے عشق کرنے والا وہ بڈھا جب کام شروع کرتا تھا تو باقی ہر شے سے ہٹ کر اس کا فوکس بس مطلوبہ شخص کے قدموں کے نشانات پر ہوتا تھا۔ اب [illegible] اوطاق کے دروازے پر جا کر رکا۔

"چھا مسئلو آھی؟ تو ھان ھتے چھا کری رھیا آھیو؟ (کیا مسئلہ ہے؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟)" اوطاق کے باہر کھڑے وہ لوگ ابھی گومگو کی کیفیت میں ہی تھے کہ اس سے آگے کیا کریں کہ اندر سے رائفل کندھے سے لٹکائے وڈیرے سائیں کا ایک کارندہ وہاں آیا اور ڈپٹنے کے انداز میں پوچھا۔

"بھتیجو مٹھو گم تھی ویو آھی، مان ھن کو گولی رہیو آھیان۔ (میرا بھتیجا مٹھو گم ہو گیا ہے، میں اسے تلاش کر رہا ہوں)۔" اللہ ڈتو نے ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے جواب دیا۔

"ھوتے نا ھی آھے، ہل بھاگ۔" کارندے نے اسے جھڑک کر رکھ دیا۔

"ھن جو سراغ ھتی تائین ملیو آھے، تو ھان غلام فرید کان پچھو۔ (اس کا سراغ یہیں تک ملا ہے، تم غلام فرید سے پوچھ لو)۔" اللہ ڈتو نے اپنی بات کی تصدیق کے لیے غلام فرید کو آگے کیا۔ اس نے محض سر کی جنبش سے اللہ ڈتو کی تائید کی۔

"انھن کے اندر سڈ یو بچل (انہیں اندر بلاؤ بچل)۔" اندر سے آنے والی وڈیرے سائیں کی بارعب آواز شناخت کرنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

"ھلو۔" بچل نے اشارہ کیا تو اللہ ڈتو اور غلام فرید ڈرتے جھجکتے اندر داخل ہوئے جبکہ ان کے پیچھے لگ کر یہاں تک آ جانے والے بچوں کو بچل نے باہر ہی سے بھگا دیا تھا۔

"ہاں بابا! چھا مسئلو آھے؟" وڈیرے سائیں نے ان کے سلام کا اشارے سے جواب دیتے ہوئے رعب سے پوچھا۔

"سائیں! بھتیجو مٹھو گم تھی ویو آھے۔" اللہ ڈتو نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولنا شروع کیا اور وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو باہر بچل سے بھی کہہ چکا تھا۔

"ٹھیک ہے، تجھے شک ہے تو یہاں کی تلاشی لے لے۔" ساری بات سن کر وڈیرے سائیں نے ایک ہنکارا بھرا اور اللہ ڈتو کو پیشکش کی۔ ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کی گئی پیشکش ایسی تھی کہ اللہ ڈتو کے وجود میں سرد لہر دوڑ گئی۔

"نہ نہ سائیں! شک نا ھی آھے۔ وہ تو بس قدمن جا نشان......" سٹپٹایا ہوا سا اللہ ڈتو اپنی بات بھی مکمل نہ کر سکا۔

"بس تو پھر اپنی تسلی کر لے۔" وڈیرے سائیں نے اسے مزید بات کرنے کا موقع نہیں دیا اور بچل کو آواز دے کر اسے حکم دیا کہ اللہ ڈتو کو اچھی طرح ساری اوطاق دکھا دے۔ [illegible] کر لے یہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن [illegible] کے مصداق وہ بچارے [illegible] والی صورت حال تھی۔ [illegible] ساتھ چل پڑا جبکہ غلام فرید کو وڈیرے سائیں نے اپنے پاس

UrduNovels.com

روک لیا تھا۔
کچیل کی راہنمائی میں اوطاق کے ایک ایک کمرے کا جائزہ لینا اللہ ڈنو واپس وڈے سائیں کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کی مٹھی میں مٹھو کی قمیص کا ننھا سا بٹن دبا ہوا تھا اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ غلام فرید وہاں موجود نہیں ہے۔
"ہاں بابا! ہوگئی تسلی؟" اسے دیکھ کر وڈے سائیں نے رعب سے پوچھا۔
"جی سائیں!" ننھے بٹن کو مٹھی میں مزید زور سے بھینچتے ہوئے اس نے دولفظی جواب دیا۔
"حوصلہ رکھ۔ ادھر اُدھر کہیں بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہوگا، مل جائے گا۔"
"میں دیکھتا ہوں سائیں!" اللہ ڈنو کو وڈے سائیں کی تسلی کی ضرورت نہیں تھی۔ دل میں وحشت لیے اب بس وہ اس جگہ سے چلا جانا چاہتا تھا، سو جواب دینے کے بعد مزید ادب و آداب کا خیال کیے بغیر وہاں سے بھاگ نکلا۔

☆☆☆

"بس کردیں شبو باجی! اب میں بڑا ہوگیا ہوں، کوئی چھوٹا بچہ نہیں رہا ہوں جو آپ یوں اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر زبردستی مجھے کھلاتی رہتی ہیں۔" عارف کے ہاتھ میں کتاب تھی اور وہ اپنی تمام توجہ کتاب کے مندرجات پر مبذول رکھنا چاہتا تھا لیکن شبو ہر تھوڑی دیر بعد دیسی گھی میں تربتر پراٹھے اور آملیٹ کا نوالہ اس کے منہ میں ڈال دیتی تھی جسے عارف کو چاروناچار چبا کر نگلنا پڑتا تھا لیکن بار بار کی اس دخل اندازی سے ارتکاز میں جو خلل واقع ہورہا تھا اس نے اسے بالآخر جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کردیا تھا۔
"تم خود سے کھالیا کرو تو ہم کاہے کو یہ تکلیف اٹھائیں۔ نخرے خود چھوٹے بچوں والے کرتے ہو اور الزام ہمارے سر۔" شبو نہایت اطمینان سے جواب دے کر اگلا نوالہ بنانے میں مصروف ہوگئی۔
"اوہو بھئی، آپ دیکھ تو رہی ہیں کہ میں پڑھ رہا ہوں۔ پہلے پڑھائی مکمل کرلوں پھر کھالوں گا۔"
"پھر وقت ہی کہاں بچے گا؟ گھنٹا ڈیڑھ تو رہ گیا ہے تمہارا پرچہ شروع ہونے میں۔" شبو بھی سارے حساب کتاب لگائے بیٹھی تھی۔
"تو واپس آکر کرلوں گا ناشتا۔ تین گھنٹے کا ہی تو پرچہ ہے۔" عارف پر بس پڑھے گئے اسباق دہرانے کی دھن سوار تھی۔
"بالکل نہیں۔ خالی پیٹ دماغ کیا خاک کام کرے

گا، شرافت سے منہ کھولو ورنہ میں ڈالتی ہوں دروازے پر تالا۔" شبو نے دھمکی لگائی تو اپنے مخصوص تخت پر بیٹھی تاجی ہنس پڑی۔
"اماں! آپ بھی شبو باجی کا ساتھ دے رہی ہیں۔" عارف نے منہ بنایا۔
"مان لے شہزادے اس کی بات ورنہ تو، تو سکون سے سبق دہرا سکے گا، نہ ہی پرچہ دینے جاسکے گا۔ جانتا نہیں ہے کیا اپنی شبو باجی کو؟ تیرے معاملے میں یہ مجھ سے بھی بھڑ جاتی ہے۔" تاجی نے سمجھایا تو عارف منہ بسور کر خاموشی سے لقمے نگلنے لگا۔ اس سے قبل شبو اسے نہار منہ رات کو بھگو کر رکھے گئے بادام بھی کھلا چکی تھی بلکہ روزانہ ہی کھلاتی تھی کہ اس کے مطابق صبح نہار منہ بادام کھانے سے دماغ تیز ہوتا ہے اس لیے ہر طالب علم کو یہ ٹوٹکا ضرور استعمال کرنا چاہیے۔
اللہ اللہ کرکے ناشتا ختم ہوا تو شبو دودھ سے بھرا گلاس لے کر اس کے سر پر آکھڑی ہوئی۔
"اب یہ کیا ہے؟" وہ آہستہ سے چلایا۔
"دودھ ہے اور کیا۔ ہر وقت کتابیں رٹتا رہتا ہے، کبھی پڑھا نہیں ان کتابوں میں کہ دودھ پینے سے ہڈیوں کو مضبوطی اور دماغ کو سکون ملتا ہے۔" شبو کون سا اس سے دبنے والی تھی۔

"مجھے کون سا امتحان ہال میں کسی سے کشتی لڑنی ہے جو اب ہڈیاں مضبوط کر کے جاؤں۔"

"دماغی سکون کی تو ضرورت ہے نا۔" شبو کے پاس دلیل موجود تھی۔

"سمجھا کریں اماں! نہیں۔ اتنا حلق تک ٹھونس کر جاؤں گا تو پرچے کے دوران پرچہ حل کرنے سے زیادہ واش روم کے چکر کاٹ رہا ہوں گا۔" اس بار اس نے تاجی سے مدد مانگی۔

"بس شبو! اب چھوڑ دے بچے کا پیچھا، باقی جو کچھ کھلانا پلانا ہو، واپس آنے کے بعد کھلا پلا لینا۔" تاجی کو آخر اس کی مدد کے لیے دخل دینا ہی پڑا۔

"ٹھیک ہے بھئی، شبو کے خلوص کی تو کسی کو قدر ہی نہ ہوتی ہے۔" وہ منہ بناتے ہوئے دودھ کے گلاس سمیت واپس پلٹ گئی تو عارف نے سکون کا سانس لیا اور پوری توجہ سے پڑھنے لگا۔

آدھے پون گھنٹے میں دہرائی کا عمل مکمل ہو گیا تو وہ امتحانی سینٹر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ شبو نے اس کا یونیفارم اور اسکول شوز وغیرہ پہلے ہی تیار کر رکھے تھے۔ وہ تیار ہو کر باہر آیا تو تخت پر بیٹھی تاجی کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں۔ اجلی رنگت اور تیکھے نقوش والے عارف نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں ہی خوب قد کاٹھ نکال لیا تھا، اس کی مسیں بھیگنے لگی تھیں۔ رخصت ہوتے بچپن کی معصومیت اور دستک دیتی جوانی کے بانکپن کے امتزاج نے اس کی شخصیت کو بے حد پرکشش بنا دیا تھا اور جب وہ ذرا سے اہتمام سے تیار ہوتا تھا، ایسے ہی سج جاتا تھا۔

"چشم بددور! اللہ حاسدوں کی نظر سے بچائے میرے بچے کو۔" تاجی نے دل کھول کر اسے دعائیں دیں۔ وہ جو پیار لینے کے لیے اس کے سامنے جھکا تھا، تھوڑا سا شرما گیا۔

"شبو...... اری او شبو! کہاں رہ گئی۔ آ کر ذرا نظر تو اتار بچے کی۔"

"آ رہی ہوں گرو جی! ابھی یہ کون سا جانے دیتا ہے اسے بغیر نظر اتارے۔" شبو فوراً مٹھی میں لال ثابت مرچیں دبائے حاضر ہو گئی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں دہکتے ہوئے انگاروں سے بھری انگیٹھی بھی تھی۔ پہلے خوب ہاتھ گھما گھما کر سات مرتبہ مرچوں کو عارف کے اوپر سے وارا گیا، پھر وہ مرچیں انگیٹھی میں جلتے انگاروں میں جھونک دیں۔ مرچوں کی دھونی اٹھی تو عارف کو زور دار ٹھسکا لگ گیا۔

"اسے تو دور لے جا کر رکھ مرن جوگی!" تاجی نے شبو کو گھرکا تو اس نے جلدی سے انگیٹھی دور لے جا کر رکھی اور بھاگ کر عارف کے لیے پانی لے آئی۔ عارف نے تاجی کے تخت پر ٹک کر پانی کے چند گھونٹ بھرے اور حالت سنبھلنے پر اٹھ کھڑا ہوا، پھر بولا۔

"اچھا اماں! اجازت دیں، اب چلتا ہوں۔"

"ارے رکو تو سہی شہزادے! تمہیں امام ضامن بھی تو باندھنا باقی ہے ابھی۔" شبو نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"بس کر دو شبو باجی! میں پرچہ دینے جا رہا ہوں، کوئی جنگ پر نہیں۔" وہ چڑ گیا۔

"ہاں تو، بورڈ کا پہلا پہلا پرچہ کوئی جنگ سے کم تھوڑی ہوتا ہے۔ میں تو تمہیں امام ضامن ضرور باندھوں گی۔" شبو کے امام ضامن باندھنے کے لیے اٹھے ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گئے اور وہ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی اپنا جیومیٹری باکس اور امتحانی گتا سینے سے لگائے باہر نکل گیا۔

"چل جانے دے، اس عمر میں بچے ایسے ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں۔" تاجی نے شبو کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔

"یہ اچھا شگون نہیں ہے گرو جی!" شبو کا دل خواہ مخواہ ہی دہل گیا تھا۔

"وہم نہ پال، یہ پیسے رکھ لے۔ گلی میں کوئی فقیر آئے تو اسے عارف کے نام کا صدقہ دے دینا۔" تاجی نے زبردستی اس کے ہاتھوں میں چند نوٹ تھمائے۔ شبو وہ نوٹ مٹھی میں دبوچے گم صم سی اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے دماغ پر مسلسل یہ خیال دستک دے رہا تھا کہ کیا خیرات، زکوٰۃ اور ناچ گانے سے حاصل کی گئی اس رقم سے عارف کا صدقہ اتر سکتا ہے؟ وہ اور اس کے ساتھی خواجہ سرا سارا دن شہر کی سڑکوں اور چوراہوں پر بھیک مانگ کر، لوگوں سے شادی بیاہ، بچے کی پیدائش پر بدھائیاں لے کر اور بعض اوقات نجی محفلوں میں ناچ کر یہ ساری رقم کماتے تھے۔ کمائی ہوئی ساری رقم تاجی کے پاس جمع ہوتی تھی۔ تاجی اس رقم سے پولیس کو نذرانے بھی دیتی تھی، ان سب کا ہفتہ وار خرچ بھی اور بیماری آزاری میں علاج معالجے کی سہولت بھی۔ تاجی کے رعب و دبدبے کے آگے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ذرا بھی چوں چرا کر سکے لیکن یہ بات بھی سب بلا تفریق مانتے تھے کہ تاجی کے سینے میں ایک درد مند دل ہے۔ بے شک وہ کسی کو اپنے آگے چوں نہیں مارنے دیتی تھی لیکن دل میں ان کے لیے حقیقی محبت رکھتی تھی۔ ان کے دکھ، درد، مسائل اور ضروریات ہر شے کا خیال رکھتا تھا تاجی کو۔ اسی لیے تو جو ایک بار تاجی کو اپنا گرو مان لیتا تھا، پھر اسے

چھوڑ کر کہیں نہیں جاتا تھا۔

☆☆☆

"کتنی سوہنڑی لگ رہی ہے تو۔" صبوحی دلہن بنی مہرو کے صدقے جا رہی تھی۔

"سب تیرے ہاتھوں کے ہنر کا کمال ہے۔" مہرو نے آئینے میں لشکارے مارتے اپنے حسن کو دیکھا اور سارا کریڈٹ صبوحی کو دے دیا۔ صبوحی کو شروع سے آرائش حسن کا بہت شوق تھا۔ مواقع کم کم ہونے کے باوجود اس نے اپنے اس شوق کی آبیاری کی تھی اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اچھا خاصا کام سیکھ گئی تھی۔ مہندی کے خوبصورت نقش و نگار بنانا ہوں، بالوں کی آرائش کا کام ہو یا چہرے کا میک اپ، وہ ہر کام یکساں مہارت سے کرتی تھی اور مہرو کی تو بات ہی الگ تھی۔ ایک طرف وہ اس کی چچازاد اور بچپن کی سہیلی تھی تو دوسری طرف بھابی بننے جا رہی تھی۔ مہرو کو دلہن بنانے کے لیے اس نے اس پر اپنا پورا ہنر آزما ڈالا تھا، پھر کچھ بات مہرو کو قدرت کی طرف سے عطا کردہ حسن کی بھی تھی کہ وہ تو ہر روپ میں ہی چمکتی دکھائی دیتی تھی۔

"ادا تو پہلے ہی تجھ پر عاشق ہے، یہ روپ دیکھ کر تو ہوش ہی کھو بیٹھے گا۔" صبوحی کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کے حسن کی تعریف میں کوئی قصیدہ لکھ ڈالے۔

"ابھی تو، تو ہوش کر اور میری تیاری مکمل کر کے خود گھر جا کر تیار ہو۔ ایسا نہ ہو کہ دولہا کی بہن برات کے ساتھ ماہیوں والے حلیے میں آ رہی ہو۔" مہرو نے اسے ٹوکا۔ حقیقتاً وہ چاہتی تھی کہ اب صبوحی وہاں سے چلی جائے تاکہ اسے کچھ دیر کے لیے تنہائی میسر آ سکے۔ خود کو سرمد سے شادی کے لیے ذہنی طور پر مکمل آمادہ کر لینے کے باوجود وہ خود کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر اداس ہو گئی تھی اور مجبوری یہ تھی کہ صبوحی سے بے تکلف دوستی کے باوجود اس کے سامنے اداسی ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔

"میں کیوں آنے لگی ماہیوں والے حلیے میں برات لے کر۔ میں تو تیری فکر پر تیار ہوں گی اور اس وقت تک جنج (برات) نکلنے نہیں دوں گی جب تک میرے سولہ سنگھار پورے نہ ہو جائیں۔" قینچی کی طرح چلتی زبان کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور بڑی مہارت سے سرخ زرتار دوپٹے کو اس کے سر اور شانوں پر سیٹ کرتی جا رہی تھی۔

"ویسے کتنا مزہ آئے گا نا کہ ادا سرمد جنج لے جانے کے لیے بے قرار ہو گا اور میں دیر پر دیر کرواؤں گی۔"

اسے اس صورت حال کو سوچ کر اتنا مزہ آیا کہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

"پاگل پگلی ہے تو، تو۔" مہرو نے اسے ایک دھپ لگائی۔ اسی وقت بند دروازے پر دستک ہوئی اور مہرو کی ماں کی آواز سنائی دی۔

"نی صبو! توں ہنے وی ایتھی کھی کھی کریں، اتے تیری ماں تیری واٹ ڈیہی رہی ہوسی (تو یہاں بیٹھی قہقہے لگا رہی ہے، وہاں تیری ماں تیری راہ دیکھ رہی ہوگی)۔"

"آئی چاچی!" صبوحی نے آواز لگا کر تسلی دی پھر مہرو کو پیار کرتے ہوئے عجلت میں بولی۔

"میں یوں گئی اور یوں آئی جنج لے کر۔ ادا کی تو چھوڑ، میں تو خود بے تاب ہو گئی ہوں اتنی سوہنڑی بھابی کو گھر لے جانے کے لیے۔"

"تو سچ میں پاگل ہے۔" مہرو ہنسی، جواباً صبوحی بھی کھلکھلاتی ہوئی وہاں سے رخصت ہو گئی۔ دروازہ کھلا تو مہرو کی ماں اندر داخل ہوئیں۔

"ماشاءاللہ! منھنجی چندر جو ٹکرو لگی رہی آہے۔" بیٹی کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر اس نے فوراً اس کی بلائیں لیں۔ ماں کو سامنے پا کر مہرو کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"نہ نہ، روئنا نا ہی منھنجی دھی ورنہ تنھنجی سہیلی سجی محنت ضائع تھیندی تے ناراض تھی ویندی (رونا نہیں میری بچی ورنہ تیری سہیلی اپنی محنت ضائع ہونے پر ناراض ہو جائے گی)۔" اس نے مہرو کو سمجھایا بجھایا اور برات آنے سے قبل کچھ دیر آرام کرنے کا مشورہ دے کر باہر جانے لگی۔

"ہاں اماں! ابھی تھوڑی دیر کسی کو اندر مت آنے دینا۔ میں بھی تھک گئی ہوں، تھوڑا آرام کروں گی۔" اس نے ماں کے مشورے سے متفق ہونے کے ساتھ ساتھ ان سے درخواست بھی کی۔

"توں فکر نہ کرامیں، اندر کھاں کنڈی لگائی وٹھ (تو فکر نہ کر اور اندر سے کنڈی لگا لے)۔" ماں نے اسے بیک وقت تسلی اور مشورے سے نوازا اور خود باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی مہرو نے جلدی سے اٹھ کر اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو جانتی تھی کہ برادری کی عورتوں اور لڑکیوں نے موقع ملتے ہی دلہن دیکھنے کے شوق میں کمرے پر دھاوا بول دینا ہے۔

"اگر جو تم مجھے اس روپ میں دیکھ لو تو کیا تب بھی تمہارے دل میں مجھے پانے کی تمنا پیدا نہ ہوگی؟" اب وہ آئینے کے مقابل کھڑی تھی اور اپنے پور پور سجے وجود کو

urdunovels.com

دیکھتے ہوئے تصور میں اس دشمنِ جاں سے مخاطب تھی جسے بھولنے کے سارے عہد کرنے کے باوجود وہ دل سے نکال ہی نہیں تھا۔

"پر تم کہاں دیکھو گے میری طرف۔ تمہیں تو کبھی فرصت ہی نہیں ملی کہ اپنی کتابوں پر سے نظر اٹھا کر کسی کو دیکھ سکو۔" یہ وہ شکوہ تھا جو ہمیشہ اس کے دل میں رہا لیکن کبھی لبوں پر نہ لا سکی۔

"نہیں تو نہ سہی، میں بھی آج تمہیں آخری بار یاد کر رہی ہوں۔ سرمد کے نکاح میں بندھنے کے بعد تمہیں اپنے خیالوں میں بھٹکنے بھی نہ دوں گی۔ کردار کی ہلکی نہیں ہے مہرو۔ اپنے جذبات پر قابو رکھنا بہت اچھی طرح آتا ہے مجھے۔ اتنے برسوں میں تمہیں اپنی محبت کا پتا نہیں چلنے دیا تو اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ جانے کب تک خود سے ہی عہد و پیمان باندھتی رہی پھر تھک ہار کر پلنگ پر ٹک گئی۔ کئی راتوں سے ڈھنگ سے سو نہیں سکی تھی۔ سرہانے پر تکیے کھڑے کر کے سر اور پشت ٹکا کر خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کے دوران اس نے محسوس کیا کہ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ شادی بیاہ میں تاخیر ایک معمول کی بات تھی اس لیے زیادہ تشویش بھی محسوس نہیں ہوئی اور خود کو مزید پرسکون کرنے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ تھکے ہوئے جسم اور اعصاب نے موقع پا کر آرام کا فیصلہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پلکوں پر نیند نے دستک دے ڈالی۔ وہ بیٹھے ہی بیٹھے اس طرح سو گئی کہ اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔

☆☆☆

"عارف.....!" عارف امتحانی گتا اور جیومیٹری باکس سینے سے لگائے پیدل ہی امتحانی مرکز کی طرف رواں دواں تھا اور اس کا دل ہر اس بچے کی طرح جو پہلی بار بورڈ کا امتحان دینے جا رہا ہو، انجانے خدشات سے دھڑک رہا تھا۔ اپنے نام کی پکار پڑی تو اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ پکارنے والا نوید تھا اور اپنی سائیکل پر اسی جانب چلا آ رہا تھا۔

"پیپر دینے جا رہے ہو؟" نوید اس کے قریب چلا آیا اور مسکرا کر پوچھا۔

"اس وقت اور کہاں جاؤں گا، تم بھی تو وہیں جا رہے ہو؟" اس نے اپنی ہی طرح یونیفارم میں ملبوس نوید کو دیکھ کر اندازہ لگایا۔

"ہاں، آؤ ساتھ ہی چلتے ہیں۔" نوید نے اسے سائیکل کے کیریئر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تم جاؤ، میں پیدل ہی آ جاؤں گا۔" عارف کو بیٹھنے میں تامل ہوا۔

"لگتا ہے ابھی تک ناراض ہو۔"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" عارف نے تردید کی۔

"میں تو جب ہی مانوں گا جب تم میرے ساتھ میری سائیکل پر بیٹھو گے۔" نوید کی بات نے اسے سوچ میں ڈال دیا۔

"اچھا، تم اتنا اصرار کر رہے ہو تو بیٹھ جاتا ہوں۔" آخرکار اس نے نوید کی پیشکش قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"یہ ہوئی نا بات۔ اب دیکھنا میں کیسے ہوا کی طرح تمہیں سینٹر پہنچاتا ہوں۔" نوید نے جوش سے پیڈل پر پاؤں مارا۔ وہ واقعی سائیکل بہت اچھی چلاتا تھا۔

"پرچے کی تیاری کیسی ہے؟" پیڈل پر تیز تیز پاؤں مارتے نوید نے اس سے بلند آواز میں دریافت کیا۔

"تیاری تو بہت کی ہے، اب بس اللہ کرے پیپر میں وہ سب آ جائے جو میں نے یاد کیا ہے۔" عارف کا جواب وہی تھا جو عموماً اس کی عمر کا ہر بچہ دیتا ہے۔

"تم تو بڑے ڈرے ہوئے لگ رہے ہو یار! مجھے دیکھو، ذرا بھی ٹینشن نہیں ہے۔" نوید نے زور کا قہقہہ مارا اور سائیکل دائیں جانب جاتے راستے پر موڑ دی۔

"ادھر کدھر جا رہے ہو؟ سینٹر تک تو یہ سیدھا راستہ جائے گا نا۔" عارف نے اسے ٹوکا۔

"اس طرف گٹر بہہ رہا ہے۔ گندے پانی کے چھینٹوں سے کپڑے خراب کرنے سے بہتر ہے تھوڑا گھوم کر چلے جائیں۔" نوید کا جواب مدلل تھا اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ اب وہ جس راستے سے گزر رہے تھے، وہ کافی سنسان تھا۔ اصل میں یہ ایک ایسی لمبی گلی تھی جس کے ایک جانب انگریزوں کے زمانے کے بنے پرانے فلیٹس اور دوسری طرف کوئی سرکاری عمارت تھی اور یہ گلی دونوں ہی کے عقب میں آتی تھی۔ تنگ گلی ہونے کی وجہ سے یہاں سے لوگوں کا عام گزر نہیں ہوتا تھا اور بس کبھی کبھار ہی کوئی راہ گیر وہاں سے گزر جاتا تھا۔

"پرچے کی تیاری کیسی ہے؟" سائیکل کو گلی کے بیچوں بیچ چوکڑی مار کر بیٹھے کتے سے بچا کر نکالتے نوید نے اس سے پوچھا۔

"کیا ہو گیا ہے یار! ابھی تو تم نے مجھ سے یہ بات پوچھی تھی، اب پھر دوبارہ پوچھ رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں مجھ سے زیادہ ٹینشن ہے اور ٹینشن میں دماغ پوری طرح کام نہیں کر رہا ہے۔" عارف نے ہنس کر اسے ٹوکا۔ جواب میں

UrduNovels.com

نوید نے اچانک ہی سائیکل کو بریک لگا کر روک دیا اور غصے سے تیز لہجے میں بولا۔

"اتر نیچے۔"

"کیا ہو گیا یار؟" عارف رویّے کی اس اچانک تبدیلی پر پٹپٹا گیا۔

"تو مجھے پاگل کہہ رہا ہے؟" نوید غرایا۔

"میں نے ایسا کب کہا بھائی؟" عارف پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"تو نے کہا میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ دماغ تو پاگلوں کا ہی کام نہیں کرتا ہے۔"

"کیا اول فول بک رہے ہو یار! میں نے تو صرف مذاق میں ایک بات کہی تھی۔" عارف کو اس کا اس قدر بگڑنا سمجھ نہیں آرہا تھا۔

"اول فول بک رہا ہوں، یعنی تمہارے نزدیک میں سچ مچ پاگل ہوں جو اول فول بکتا ہوں۔" نوید نے سائیکل ایک طرف پھینکی اور اسے گھما کر ایک گھونسا دے مارا۔ عارف کے لیے اس کی یہ حرکت بالکل غیر متوقع تھی اس لیے خود کو بچا نہیں سکا۔ جب تک سنبھلتا اور جوابی وار کرتا، گلی میں دونوں طرف سے داخل ہونے والے لڑکوں نے اسے چھاپ لیا۔ وہ بہادر اور جی دار تھا اور اچھے خاصے ہاتھ پیر بھی چلا لیتا تھا لیکن ان لڑکوں نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ لاتیں، گھونسے، ڈنڈے...... وہ اسے مارنے کے لیے جانے کیا کیا استعمال کر رہے تھے۔ وہ ہر ضرب پر چیختا تھا۔

"مجھے جانے دو...... میرا پرچہ ہے، امتحان نہیں دیا تو فیل ہو جاؤں گا۔" لیکن وہاں کون تھا جو اس کی سنتا۔ وہ تو سوچ کر ہی آئے تھے کہ آج عارف کو امتحانی مرکز نہیں پہنچنے دینا ہے۔

"اماں...... شبو باجی!" ایک تنگ و سنسان گلی میں بے بس کیے جانے والا چودہ سالہ لڑکا کتنی برداشت کا مظاہرہ کر سکتا تھا، بے ساختہ ہی انہیں پکارنے لگا جو اس کی ہر مشکل کے ساتھی تھے لیکن آج اس کی ہر آواز صدا بہ صحرا تھی۔ اسے مارنے والے کانوں میں روئی ٹھونسے اس کی دردناک چیخوں سے بے نیاز اسے بے طرح مار رہے تھے، کتوں کی طرح بھنبھوڑ رہے تھے اور چار ٹانگوں والا کتا انسانوں کی اس سنگدلی پر دور کھڑا سہما سہما سا بھونک رہا تھا۔

☆☆☆

"یہ تم مجھے یہاں کیوں لے آئے ہو ادا افضل؟" وڈیرے سائیں کے ڈیرے کے باہر کھڑا مٹھو کھلے دروازے سے اندر داخل ہونے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ وڈیرے سائیں کا رعب ہی اتنا تھا کہ گاؤں کے کسی بڑے یا بچے کی ہمت نہیں تھی کہ حویلی اور ڈیرے سمیت کسی بھی مقام پر بلا اجازت قدم رکھ سکیں۔

"ادھر ہی تو ہے وہ میمنو۔" (بکری کا بچہ)۔ افضل نے جو اسے نئے پیدا ہونے والے بکری کے بچے کو دکھانے کے بہانے ہی یہاں لے کر آیا تھا، جواب دیا۔

"پر وڈے سائیں......" مٹھو کو میمنے کو دیکھنے کی خواہش تو تھی لیکن جھجک آگے بھی نہیں بڑھنے دے رہی تھی۔

"تو فکر نہ کر۔ وڈیرے سائیں کے خبر بھی نہ ہوندی۔" افضل نے جسے ہر حال میں مٹھو کو یہاں پہنچانے کی ذمے داری سونپی گئی تھی، اسے تسلی دی اور بازو سے دبوچ کر اندر لے گیا۔ مٹھو ابھی اس افتاد سے سنبھلا نہیں تھا کہ بالکل اچانک سامنے آجانے والے اس بڑی مونچھوں والے کو دیکھ کر مزید گھبرا گیا اور پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن افضل کی گرفت اس کے بازو پر مضبوط تھی۔

"کتھے وینیں تھو؟ ذرا ہکڑیں موں سان گالھاء کر۔" (کدھر بھاگتا ہے، پہلے مجھ سے تو بات کر لے)۔ بڑی مونچھوں والے نے ایک قدم آگے بڑھا کر اسے دبوچ لیا۔

"منھنجو کم ختم آ ہے شوکت بھاؤ، حانڑ تون پانڑئی اُھی کے سنبھال۔" (میرا کام ختم شوکت بھائی، اب تم خود اسے سنبھالو)۔ افضل ہاتھ جھاڑتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا اور پیچھے مٹھو اسے پکارتا ہی رہ گیا۔

"ھیڈے اکھین ڈس۔" (ادھر دیکھ)۔ شوکت نے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ "مان کیر آھیان...... خونی؟" (میں کون ہوں، خونی؟) اپنی آنکھیں مٹھو کی آنکھوں میں گاڑ کر اس نے سخت لہجے میں پوچھا تو مٹھو کا سر خود بخود اثبات میں ہلتا چلا گیا۔

"تون مون کے ڈسو خون کروی؟" (تو نے مجھے خون کرتے دیکھا تھا؟) شوکت کے مزید تیز لہجے میں کیے گئے سوال پر بھی مٹھو کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"کتھے؟" شوکت کے یک لفظی سوال میں خوف اور حیرت دونوں کی آمیزش تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ایک ایسے وقت میں جب آس پاس کوئی موجود نہیں تھا، ایک بچہ کیسے اس کے جرم کا چشم دید گواہ بن گیا تھا۔

"خواب میں۔" مٹھو نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

"خواب میں؟" اس کے جواب نے شوکت کو مزید الجھا دیا۔

"سہا سون خواب میں ڈٹھو ہو، توں اوا رفاقت جی چھاتی میں خنجر ماریو ہو۔" (ہاں میں نے خواب میں دیکھا تھا، تو نے اوا رفاقت کے سینے میں خنجر مارا تھا)۔ مٹھو کے ذہن میں دوبارہ وہ منظر تازہ ہو گیا تھا۔

"تو جے کمرے میں نہ ہیئن؟" (تو وہاں کمرے میں نہیں تھا؟) شوکت پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"نہ۔" مٹھو نے سر کو زور زور سے نفی میں ہلا دیا۔

"ڈرامو کرے رہیو آہے، ہا چپیڑ مارو، سبھ سچ بدھائی چھڈیندو۔" (ڈرامہ کر رہا ہے، دو چپیڑ مارو سب سچ بتا دے گا)۔ شوکت کا ایک ساتھی جواب تک وہاں خاموشی سے کھڑا ہوا تھا، جچے ہوئے انداز میں اسے مشورہ دینے لگا۔ اس سے پہلے کہ شوکت اس مشورے پر عمل کرتا، افضل گھبرایا ہوا اندر آیا۔

"وڈے سائیں ہتے اچی رہیا آہن (بڑے سائیں یہاں آ رہے ہیں)۔" اس کی دی اطلاع شوکت اور اس کے ساتھی کے لیے بھی خوفناک تھی۔ شوکت کا ساتھی لپک کر کھڑکی کی طرف گیا اور جھانک کر باہر دیکھا۔

"گاڑی تہ وڈے سائیں جی ای آ ہے، جلدی کریو، ان کے کوڈ ایو۔" (گاڑی تو بڑے سائیں کی ہی ہے، جلدی کرو، اسے کہیں چھپاؤ)۔ اس نے افضل کی خبر کی تصدیق کرنے کے ساتھ ساتھ گھبرائے ہوئے لہجے میں مشورہ بھی دیا جس پر عمل کرتے ہوئے شوکت نے تیزی سے مٹھو کا چیخنے کے لیے کھلا ہوا منہ اپنے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ مٹھو مچلا لیکن شوکت جیسے گرانڈیل جوان کے آگے اس کی مزاحمت کی اہمیت ہی کیا تھی۔ وہ اسے کسی میمنے ہی کی طرح اٹھا کر اندر لے گیا اور جلدی میں سر پر ایک زوردار ضرب لگا کر بیڈ کے نیچے دھکیل دیا۔ اسے امید تھی کہ وہ کچھ دیر بے ہوش پڑا رہے گا اور اس دوران بڑے سائیں واپس چلے جائیں گے۔ وہ وہاں لمبے وقت کے لیے صرف اس صورت میں ٹھہرتے تھے کہ ان کے ساتھ کوئی خاص مہمان ہو۔ عام دنوں میں اپنے موڈ کے حساب سے بس تھوڑی دیر کے لیے چکر لگا کر واپس چلے جاتے تھے۔

"گارڈ کتھے آ ہے ایں ہتے چھا تھی رہیو آ ہے؟" (گارڈ کہاں ہے اور یہاں کیا ہو رہا ہے؟) جب تک شوکت کمرے سے باہر نکلا، بڑے سائیں ڈیرے کے اندر پہنچ چکے تھے اور بارعب لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"ان کے ننڈی سائیں کنھن کم لاء موکلیو آ ہے ایں اسین ننڈی سائیں جی حکم تے ڈیرے جی صفائی کرے رہیا آ ہیون۔" (اس کو چھوٹے سائیں نے کسی کام سے بھیجا ہے اور ہم چھوٹے سائیں کے حکم پر ڈیرے کی صفائی کر رہے ہیں)۔ شوکت نے جلدی سے بہانہ بنایا اور باقی دونوں زور شور سے سر ہلاتے ہوئے اس کی تائید کرنے لگے۔

"ننڈھو سائیں کتھے آ ہے؟" (تمہارا چھوٹا سائیں کہاں ہے؟) بڑے سائیں کی عقابی نظریں ان تینوں کے چہروں کے ساتھ ساتھ اطراف کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔

"خبر ناآ ہے سائیں!" شوکت نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"توں نوں آ ہین نا؟ ننڈھو سائیں وڈی جلدی توں کھے متھے چڑھائی چھڈیو آ ہے۔" (تو نیا ہے نا؟ تیرے چھوٹے سائیں نے بڑی جلدی تجھے سر چڑھا لیا ہے)۔ وڈیرے کی تنقیدی نگاہیں اس بار شوکت پر آ کر مرکوز ہو گئیں۔

"جی سائیں جی...... مہربانی آ ہے سائیں!" شوکت نے انکساری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت مٹھو کی چیخ نے اس کا سارا کھیل خراب کر دیا۔

ذرا دیر میں وہ تینوں سارے حقائق کا اعتراف کر چکے تھے کہ کیسے ایک لڑکی کے چکر میں چھوٹے سائیں کے دل میں رفاقت کے لیے رقابت پیدا ہوئی اور اس نے شوکت کو رفاقت کو اپنے راستے سے ہٹانے کا حکم دیا۔ آگے مٹھو کا قصہ تھا۔ وڈیرے سائیں نے بھی مٹھو سے پوچھ گچھ کی۔ انہیں بھی اس نے یہی بتایا کہ اس نے شوکت کو خواب میں رفاقت کو قتل کرتے دیکھا تھا۔ سب کچھ سن کر بڑے سائیں نے کچھ دیر کے لیے سوچا پھر فیصلہ سنایا۔

"خون جو بدلو خون آ ہی...... جنھن خون کیو آ ہی، سو سزا پاسندو۔" بڑے سائیں کا یہ جملہ اس کے ساتھ آئے محافظوں کے لیے اشارہ تھا۔ انہوں نے فوراً ہی شوکت کو دبوچ لیا۔

"رحم سائیں رحم۔ سون کجھ بھی نہ کیو آ ہے سائیں! اسون صرف چھوٹے سائیں جی حکم تے عمل کیو آ ہے۔" شوکت دہائیاں دینے لگا لیکن وہاں کوئی کان دھرنے والا نہیں تھا۔

"ھن بار کے کتھے دور وٹھی وڃی چھڈی ڈیو۔ مان ھک بار جی خون سان پنھنجا ہتھ نہ رنگی سگھان تھو۔" (اس بچے کو کہیں دور لے جا کر چھوڑ دو۔ میں ایک بچے کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگ سکتا)۔ بڑا سائیں مٹھو پر بس اتنا ہی رحم کر سکتا تھا کہ اسے ماں باپ کی شفقت سے دور زمانے کی ٹھوکروں میں جینے کا حق دے دے۔

پر عزم نوجوان کی بہادری کی داستان

آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

urdunovels.com

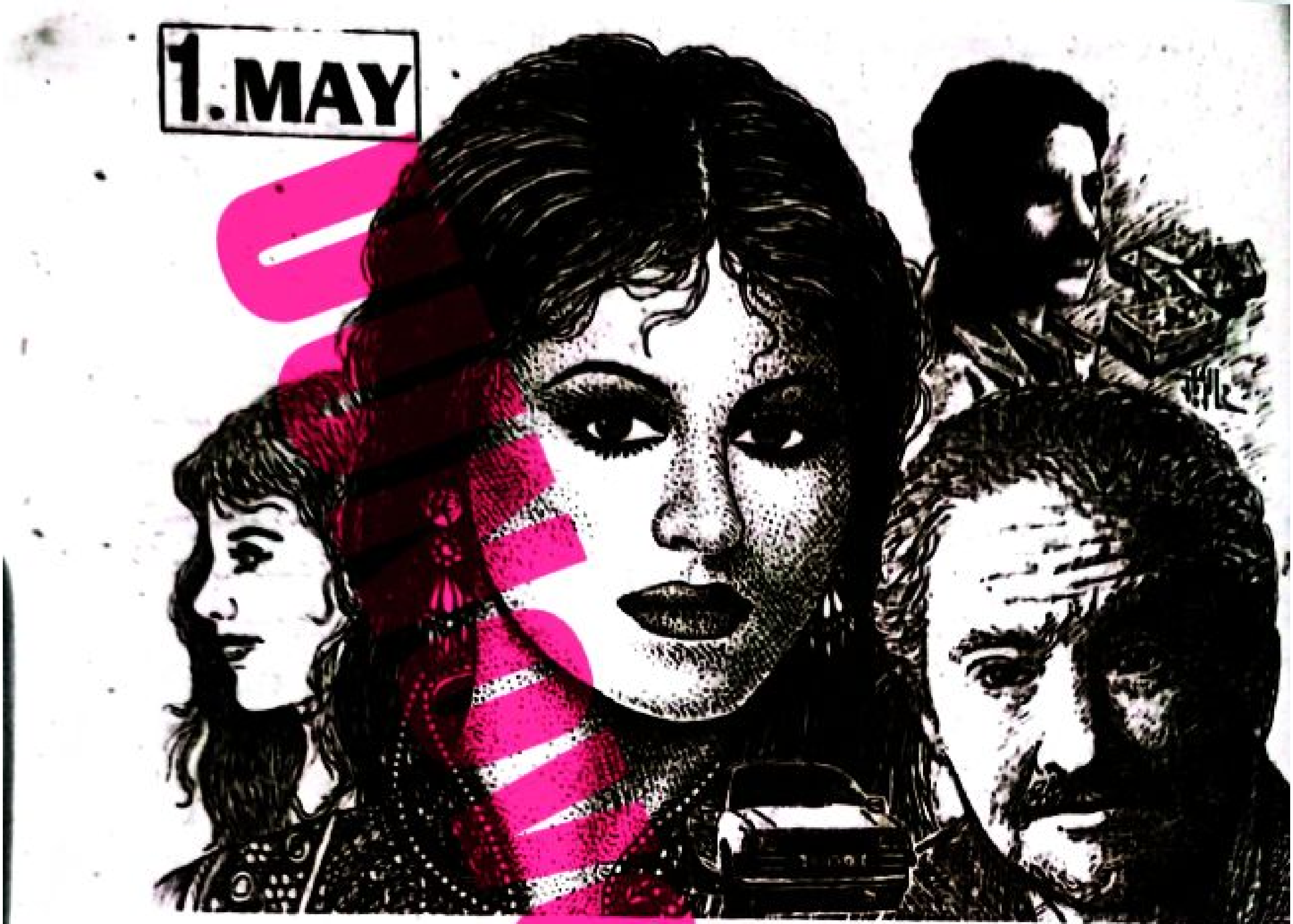

مزدور

عیوق بخاری

اللہ رب العزت نے تمام انسانوں کے لیے ایک تقسیم کی ہے... کسی کو مال و دولت سے نوازا تو کوئی آزمائشوں کے زیرِ اثر سادہ اور مالی طور پر کمزور زندگی گزار رہا ہے... مگر دونوں صورتوں میں انسان کے لیے آزمائش ہے... کیونکہ نظامِ قدرت ہے کہ وہ کسی کو دے کر آزماتا ہے تو کسی سے لے کر... تاہم محنت مزدوری کر کے رزقِ حلال کمانا بھی عبادت ہے... اور ہر شعبے میں مزدوروں کا کردار بہت اہم ہے۔

مزدور ڈے کے موقع پر ایک پُراثر تحریر

"کیا پکایا ہے آج؟" تھکے سے لہجے میں ارشاد نے ثناء سے پوچھا۔

"کھچڑی پکائی ہے۔" حنا نے جواب دیا۔

"وہ تو میرے لیے بنی ہوگی، باقی گھر والوں نے کیا کھایا ہے؟" ارشاد نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"سب وہی کھائیں گے۔ میں نے پہلے آلو کی بھجیا بنائی تھی لیکن جب آپ کے لیے کھچڑی بنانے لگی تو دال اور چاول ذرا بڑھا لیے، یہ سوچ کر کہ اگر میرے پیارے ابو جی پچھلے چار روز سے یہ کھانا کھا رہے ہیں تو ایک دو دن ہم کیوں نہیں کھا سکتے؟" حنا نے بڑے پیار سے کہا۔ وہ پاس بیٹھ کر ارشاد کا سر دبانے لگی۔

"ارے وہ کیوں، پاگل ہو گئے ہیں سب جو بیماروں

والا کھانا کہاں سے؟" ارشاد نے حیرانی سے کہا۔

"کیوں بھئی، کیوں نہیں کھا سکتے؟ آپ کے لیے ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟ ویسے بھی آپ کی بیٹی بہت مزے کی کھچڑی بناتی ہے۔ سب بڑے مزے سے کھا لیں گے۔" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ارشاد کی بیوی زینب نے کہا۔ اس نے کپڑوں کی ایک گٹھڑی سی اٹھا رکھی تھی، کمرے میں لا کر اسے ایک طرف پڑی لکڑی کی بڑی سی میز پر رکھ دیا۔ یہ کپڑوں کی کترنوں کی گٹھڑی تھی جسے وہ ارشاد کی بائیک سے اتار کر لائی تھی۔ اس میں وہ کپڑے تھے جن کی چھانٹی کا کام ارشاد نے کرنا تھا۔ اس کام میں سب گھر والے اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

"اچھا بھئی، جو بنا ہے لے آؤ، بھوک لگی ہے۔" ارشاد کے لہجے میں جو تھکن تھی، وہ یکدم دور ہو گئی تھی۔ حنا اور زینب کی باتوں، پیار اور توجہ نے اسے ہشاش بشاش کر دیا تھا۔ اسے اپنے کنبے کی ہر بات پسند تھی۔ وہ جتنا بھی تھکا ہوتا، پریشان ہوتا، گھر آ کر پرسکون ہو جاتا تھا۔

"ارسلان کدھر ہے؟" ارشاد نے اٹھتے ہوئے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔

"سائیکل ٹھیک کروانے گیا ہے، بس آتا ہی ہوگا۔ آپ منہ ہاتھ دھو لیں پھر کھانا کھاتے ہیں۔" زینب نے کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر کے چاروں افراد ارشاد، اس کی بیوی زینب اور دونوں بچے ارسلان اور حنا بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

"تمہارے ابو اب آرام کریں گے جب تک ہم تینوں جلدی سے یہ کام نمٹا لیں۔" زینب نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔ وہ چاروں برآمدے میں ایک چھوٹی سی چٹائی پر بیٹھے تھے۔ بات کرتے ہوئے زینب ان کپڑوں کو دیکھ رہی تھی جو برآمدے کے دوسرے حصے میں بڑے بڑے پیکٹوں میں پڑے تھے۔

"جی امی! میں جب تک برتن دھو لیتی ہوں، آپ اور ارسلان بھائی دوسری چٹائی بچھا کر پیکٹ کھولیں۔" حنا نے سعادت مندی سے کہا۔ اب برآمدے میں رنگ برنگے چھوٹے بڑے سائز کے کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ اس میں وہ کپڑے بھی شامل تھے جو ارشاد آج لایا تھا۔

ارشاد علی کپڑے کے ایک کارخانے میں مزدور تھا۔ کپڑوں کے چھوٹے پیس کی چھانٹی کرنا، الگ الگ رنگ و قسم کے کپڑوں کو ایک جگہ کرنا اس کے ذمے تھا۔ شادی کے بعد زینب نے شوہر کا ہاتھ بٹانے کی ٹھانی اور اس کے ساتھ کارخانے جانے لگی لیکن ایک دو ماہ میں ہی اسے احساس ہوا کہ اس طرح گھر کی صفائی اور کھانا پکانے کے وقت میں توازن نہیں رہ پا رہا۔ اس نے ارشاد علی کو مشورہ دیا کہ وہ گھر پر کام لے آیا کرے۔ گھر میں کام لانے کا کافی فائدہ ہوا۔ ایک تو زینب سارا گھریلو کام سکون سے وقت پر کر لیتی، دوسرا مقررہ وقت کے بجائے جب دل کرتا، وہ کپڑوں کی چھانٹی بھی کر لیتے۔ کبھی شام کو، کبھی ناشتے سے پہلے اور کبھی رات کے کھانے کے بعد کام نمٹا لیا جاتا۔

اسی دوران بچے پیدا ہوئے۔ حنا اور پھر ارسلان کے آنے کے بعد فیملی مکمل ہو گئی۔ وقت تیزی سے گزرا، مہنگائی بڑھی لیکن ملک کے دیگر غرباء کی طرح ارشاد علی کی آمدنی اخراجات سے کافی کم رہی۔ بچے اسکول جانے لگے۔ بڑی مشکل سے اس نے بیٹی کو میٹرک کروایا اور پھر حنا کو مالی مسائل کی وجہ سے تعلیم چھوڑ کر گھر بیٹھنا پڑا۔ یہی حال ارسلان کا بھی ہوا۔ کھانے پینے کو بمشکل میسر ہو تو پڑھائی کے اخراجات کوئی مزدور کیسے اٹھا سکتا ہے؟ اب دونوں بچے ماں باپ کے ساتھ مزدوری کر کے گھر چلانے میں ہاتھ بٹانے لگے۔ ان دونوں کے کام کرنے کی وجہ سے قدرے بہتری آنے لگی تھی۔ چاروں کماتے۔ زینب سلیقہ شعار، سمجھدار تو پہلے بھی تھی، حالات نے مزید عقل دے دی تھی۔ وہ شوہر اور بیٹے کے کمائے پیسوں سے گھر چلاتی اور اپنے اور اپنی بیٹی کے پیسے ایک طرف رکھتی رہتی۔ جب کچھ روپے جمع ہو گئے تو گھر کے صحن کے پچھلے حصے میں بڑے بڑے دڑبے بنا کر مرغیاں خرید کر رکھ لی گئیں۔ انڈے بیچنے اور گھر میں کھانے کا خوب اچھا بندوبست ہو گیا اور کبھی کبھار جی چاہتا تو دیسی مرغی کا تازہ گوشت بھی اسی گھریلو پولٹری فارم سے حاصل کیا جاتا۔

ارشاد علی کی مدد سے تین چار بکریاں خرید کر زینب نے گاؤں میں اپنے جیسی غریب اپنی ایک سہیلی کو دی ہوئی تھیں۔ وہ گاؤں والی سہیلی بکریوں کا خیال رکھتی، انہیں چارا دیتی اور جب بکریاں بچے دیتیں تو آدھے پہ زینب اور آدھے پہ اس کی سہیلی کا حق ہوتا۔ یہ سلسلہ سات آٹھ سال پہلے شروع ہوا تھا اور پہلی بار عید الاضحی پہ جب دو بکرے نہایت اچھی قیمت پہ ارشاد علی فروخت کر کے آیا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

"زینب! یہ تو نے بڑا اچھا کام کیا ہے۔ دیکھو تو کتنے زیادہ روپے ملے ہیں۔" ارشاد علی نے رقم بیوی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔ زینب، حنا اور ارسلان بھی خوش ہو گئے۔

"اس بار عید کی تیاری ان پیسوں سے ہوگی۔" حنا نے ماں کے قریب بیٹھ کر بڑے لاڈ سے کہا۔

"عید کی تیاری تو ہوگی، لیکن ان پیسوں سے بالکل نہیں۔" زینب نے صاف جواب دے دیا۔ حنا کا منہ لٹک گیا۔

"امی جی! میں نے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی، اب پیسے کما کر کہا ہے تو مان لیں نا۔" حنا نے کہا۔

"ٹھیک ہے، لیکن ان میں سے بس تھوڑے پیسے خرچ کریں گے، باقی سنبھال کر رکھیں گے۔ بیٹا! تھوڑی تھوڑی رقم بچا کر گھر کی حالت اچھی کرنی ہے اس لیے۔"

زینب کو بیٹی پر ترس اور پیار تو آیا لیکن پھر بھی اس نے کفایت شعاری سے ہی کام لیا۔ اس طرح زینب نے رقم پس انداز کرکے کمروں اور برآمدے کی حالت کافی اچھی کرلی تھی۔ گھر کی چادریں، پردے نئے بنالیے اور کچھ بستر اور کپڑے حنا کے جہیز کے بھی خرید کر اپنی بڑی سی پیٹی میں رکھ لیے تھے۔ دن اسی طرح محنت، بچت کرتے گزر رہے تھے، کافی چیزیں تھیں جو ارشاد علی کی فیملی کی پہنچ سے بہت دور تھیں لیکن آپس میں محبت اور قناعت کی دولت سے مالا مال یہ کنبہ پرسکون زندگی گزار رہا تھا۔

☆☆☆

"ناشتا کرلیا ہو تو ذرا چیک سائن کردیں۔" خالدہ نے شوہر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"چیک...... وہ کس لیے؟ ابھی ہفتہ پہلے ہی تو تم نے مجھ سے اچھی خاصی رقم لی تھی۔" فیاض نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میرے بڑے بھتیجے کی منگنی ہے، اس کی تیاری کرنا ہے۔ کپڑے، جیولری، میک اپ سب لینا ہوگا۔ علیمہ اور جمال کے لیے بھی شاپنگ کرنا ہوگی۔ اتنا کافی ہے یا اور تفصیل بیان کروں آپ سے خرچہ لینے کے لیے؟" خالدہ کا لہجہ ترش سا تھا۔

بریڈ کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے فیاض نے بیوی کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ جوس کے سپ لیتے ہوئے سیل فون پر مصروف تھی، اسے فکر ہی نہ تھی کہ شوہر ڈھنگ سے ناشتا کررہا ہے اور بچے دھیان سے کھا رہے ہیں یا نہیں۔

"ٹھیک ہے، کردیتا ہوں سائن، لیکن تم لوگ ذرا خیال کرو۔ پیسا پانی کی طرح بہاتے ہو۔" فیاض نے غصے ہوتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی! آپ کی کمائی ہمارے لیے ہی تو ہے، تو پھر کہاں کیوں دکھا رہے ہیں؟" فیاض کی بیٹی علیمہ نے کافی بدتمیزی سے کہا تھا۔ فیاض کچھ بولنے ہی والا تھا کہ اس کی کال آگئی۔ اس نے تیزی سے چیک بک نکالی، سائن کرکے بیوی کی طرف اچھالی اور تیزی سے باہر کی جانب چلا گیا۔ بڑی سی مہنگی ڈائننگ ٹیبل پر انواع و اقسام کا پرتکلف ناشتا رکھا تھا، قسم قسم کے آملیٹ، جوسز موجود تھے لیکن فیاض احمد بے دلی سے چند نوالے زہر مار کرکے گیا تھا۔ اس کی بیوی خالدہ، شوہر کے رویے پر نالاں، شوہر کی طرح کسی خاص رغبت کے بغیر ناشتا کررہی تھی۔ بیٹی علیمہ اور بیٹا جمال، ماں باپ کی ترش گفتگو سن کر بیزار سے نظر آرہے تھے۔

فیاض احمد اسی محلے میں رہتا تھا جہاں ارشاد علی اور زینب رہتے تھے۔ فیاض احمد انتہائی دولت مند شخص تھا۔ بظاہر پراپرٹی ڈیلر تھا لیکن اس کے مزید "کاروبار" بھی تھے، بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جن کے "کام" کرکے فیاض امیر ترین بنا تھا۔ محلے میں تین منزلہ کوٹھی کا مالک تھا اور اردگرد والوں پر رعب ڈالنے، شیخی بگھارنے کے لیے اکثر اپنے دوستوں کی بڑی بڑی دعوتیں کرتا اور لوگ بڑی بڑی گاڑیوں میں آتی ہوئی شخصیات کو دیکھ کر واقعی مرعوب ہوجاتے۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی، بیوی بچے من چاہی شاپنگ، ہوٹلنگ کرتے، فرینڈز کے لیے پارٹی کرتے۔ ان اخراجات کے لیے کبھی کوئی مسئلہ نہ بنا کیونکہ فیاض احمد دن رات اور حلال حرام کی پروا کیے بغیر "محنت" کیے جارہا تھا اور پیسا کما رہا تھا۔ اسے اس بات پر نظر ڈالنے کی بھی فرصت نہ ملی کہ اس کی خوب "کمائی" کے نتیجے میں ایک بے برکتی سی اس کے شاندار گھر میں آچکی ہے اور کھانے کے برتن تو بھرے ہوتے ہیں لیکن اکثر فیملی کے افراد لڑ جھگڑ کر کھائے پیے بغیر ہی اٹھ جاتے ہیں۔

☆☆☆

"آج ناشتا بہت مزے کا تھا، میں تو زیادہ ہی کھاچکا ہوں۔" ارشاد علی نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اس کے چہرے سے اطمینان ہی اطمینان جھلک رہا تھا۔ حنا نے رات کی بچی سبزی آٹے میں مکس کرکے پراٹھے بنائے تھے، ساتھ گھر کا بنا اچار اور چائے تھی۔ برآمدے میں بچھی چٹائی پر یہ ناشتا کرتے ہوئے کنبے کے چاروں افراد ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔ قسم قسم کے آملیٹ، ابلے انڈے، فریش جوسز، پھل کے بغیر یہ عام سا ناشتا ان چاروں کے پیٹ سکون سے بھر رہا تھا۔

"آپ ذرا دیر سے آئیں گے اس لیے دوپہر کا کھانا ٹفن میں ڈال دوں؟" زینب نے شوہر سے پوچھا۔

urdunovels.com

"ہاں ہاں، ہاں انکل اور یہ میری بیٹی کے ہاتھ کے پکے سبزی والے پراٹھے ہی رکھنا۔" ارشاد علی نے حنا کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر میں ایک چھوٹے سے ٹفن میں دو پراٹھے اور تھوڑا سا اچار لیے ارشاد علی مطمئن سا گھر سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی حنا، ارسلان اور زینب گھر کی صفائی کرنے کے کام میں جت گئے۔

☆☆☆

"دیکھ کر نہیں چل سکتے، ابھی ٹکرا جاتے۔" گاڑی جھٹکے سے روک کر فیاض احمد نے گاڑی سے منہ باہر نکال کر درشتی سے کہا۔

"سوری انکل! مجھے لگا تھا کہ آپ نے مجھے دیکھ لیا ہے، اس لیے گاڑی دوسری طرف کر لیں گے اس لیے.....!" ارسلان نے بڑی شائستگی سے معذرت کی۔

"کیوں، تمہاری ٹوٹی پھوٹی سائیکل اتنی شان والی ہے کہ کوئی اپنی مہنگی گاڑی کا رخ اس کی وجہ سے موڑے؟" گاڑی سے اتر کر انتہائی نخوت و تکبر سے کہتا ہوا فیاض احمد اپنی عالیشان رہائش گاہ کے گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے ارسلان کی پوری بات بھی سننا گوارا نہ کی۔ غلطی سراسر فیاض احمد کی تھی۔ گلی میں تیز رفتاری سے اور غلط سائیڈ پہ چلا رہا تھا، اسی دوران دوسری گلی سے ارسلان اپنی سائیکل پہ جیسے مڑا، ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ بجائے شرمندہ ہونے کے فیاض نے الٹا اسے ہی ڈانٹ دیا۔ ارسلان تمیزدار بچہ تھا، خاموش رہا اور گھر چل دیا۔

"کیا ہوا منہ کیوں اترا ہوا ہے؟" زینب نے بیٹے کو دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ کچھ ہوا ہے۔ جواب میں ارسلان نے باہر پیش آنے والا واقعہ سنا دیا۔ اسی دوران ارشاد علی بھی آ گیا، وہ بھی بیٹے کی بات سننے لگا۔

"سنا آپ نے، کیا غرور ہے اس شخص میں۔ میرے بیٹے کی سائیکل کو ٹوٹی پھوٹی کہہ رہا تھا، میرا تو جی چاہ رہا ہے جا کر بات کروں۔" زینب کو شدید غصہ آ رہا تھا۔ ایک تو وہ اس کے بیٹے کو زخمی کرنے کی کوشش کر چکا تھا، دوسرا باتیں بھی وہی سنا رہا تھا۔

"چھوڑو زینب! جانے دو، مغرور انسان کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس کو اس کا غرور خود ہی لے ڈوبے گا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھتا ہے، فی الحال وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں لیکن دیکھنا ایک دن اسے سب سمجھ آ جائے گا کہ حرام کی دولت پہ شیخی بگھارنا اور حلال میں گزارہ کرنے میں کیا فرق ہے۔" ارشاد علی نے تحمل سے کہا۔ زینب نے شوہر کی طرف غور سے دیکھا۔

"آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ آج کے اس واقعے کے علاوہ اور کوئی بات بھی ہے؟" اس نے شوہر سے کہا۔

"ہاں، دو چار مرتبہ میری اور اس شخص کی ناگوار سی ملاقات ہو چکی ہے۔" ارشاد علی نے کہا۔

"کیا کہا تھا اس نے آپ سے؟" سبزی کی ٹوکری اٹھائے حنا پاس ہی چلی آئی۔ اس کے ماتھے پہ بھی سوالیہ بل پڑ گئے تھے کہ فیاض نے پیارے ابو کے ساتھ کس لہجے میں بات کی ہے۔ ارسلان بھی سنجیدہ شکل بنائے باپ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ارشاد بتانے لگا۔

"ایک روز میں فیکٹری سے واپس آ رہا تھا کہ سامنے سے فیاض کی گاڑی آ گئی۔ ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا جبکہ فیاض پچھلی سیٹ پہ بیٹھا تھا۔ اس روز میری بائیک پہ ذرا بڑی گٹھڑی رکھی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی سائیڈ پہ کی تو فیاض کو ناگوار گزرا، فوراً مجھے اشارہ کر کے روکا اور بڑی بدتمیزی سے بولا۔

"یہ رنگ برنگا کاروبار جلدی ایک طرف کرو، کسی اور نے بھی گزرنا ہوتا ہے۔"

"اتنا تکبر، اتنی بدتمیزی اور گھٹیا پن؟" ارسلان نے سلگ کر کہا۔

زینب نے بیٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے پرسکون ہونے کا اشارہ دیا۔ ارشاد بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

"میں نے فوراً کہا، جناب! رنگ برنگا ہے یا جیسا بھی، میری روزی روٹی ہے۔" اس جواب پہ فیاض ہکا بکا سا ہنسا۔ اس کی ہنسی میں واضح طور پہ میرے لیے تمسخر تھا۔ اس کے بعد میں نے کوشش کی کہ اس سے آمنا سامنا نہ ہو لیکن نہ چاہتے ہوئے پھر ایک روز اس سے بات کرنا پڑ گئی۔ میری بائیک میں اس روز پیٹرول ختم ہو گیا تھا اور میں اسے پیدل گھسیٹتے ہوئے لا رہا تھا کہ فیاض کے گھر کے سامنے رکنا پڑا۔ وہاں بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں، شاید کوئی دعوت، پارٹی وغیرہ تھی۔ اتنے میں فیاض باہر آ نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں واضح طور پہ تمسخر و غرور نظر آیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"بھئی ارشاد ذرا رک جاؤ، میرے دوست جا رہے ہیں، ان کو گزرنے دو کیونکہ یہ میرے بزنس پارٹنرز ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں تمہاری زبان میں...... ہاں یاد آیا، یہ میری روزی روٹی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خوب زور سے ہنسا اور اپنے دوستوں کے ہاتھ پہ ہاتھ بھی مارا۔ اسکی ہی ایک دو

ملاقاتیں بھی ہیں۔ فیاض صرف میرے ساتھ ہی نہیں، کئی اور لوگوں کے ساتھ بھی تکبر سے پیش آتا ہے جو اس سے حیثیت میں کم ہیں۔" ارشاد علی نے تفصیل بتا دی۔

"ویسے ابو جی! اس شخص کو علاج کی ضرورت ہے۔ اس کا دماغ درست کرنا چاہیے۔" حنا نے غصے سے کہا۔

"ان جیسے پنچ ذہنیت لاعلاج ہوتے ہیں۔ لعنت بھیجو..... کھانے میں کیا بن رہا ہے، جلدی بتاؤ، بھوک لگ رہی ہے۔" ارشاد علی نے یکدم موضوع بدلا اور منہ دھونے کے لیے چل دیا۔ ارسلان، حنا اور زینب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"تم لوگ یوں چپ کیوں ہو گئے؟ یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے کہ یوں افسردہ ہو جاؤ۔" صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے ارشاد علی نے مسکرا کر کہا۔

"آپ ہمارے لیے اتنی محنت کرتے ہیں، صبح سے شام تک اس گھر کی روٹی کے لیے وزن اٹھاتے ہیں، بڑا دکھ ہو رہا ہے یہ سن کر کہ ان حالات میں کوئی آپ کا مذاق اڑاتا ہے، آپ کو تنگ کرتا ہے، بے سکون کرتا ہے۔" زینب کی آواز بھرا سی گئی۔ وہ ارشاد علی کو چائے پکڑا رہی تھی۔

"میں بے سکون نہیں ہوں۔" بیوی کے ہاتھ سے کپ پکڑتے ہوئے ارشاد علی تیز لہجے میں بولا۔ "میں بالکل بھی بے سکون نہیں ہوں۔ وہ حرام کمائی کمانے والا فیاض کیا سمجھتا ہے کہ اس کے گھر میں سب اچھا ہے۔ سب جانتے ہیں اس کا بیٹا جمال کتنا ضدی ہے، کیسے باپ اور ماں کے سامنے بدتمیزی کر کے رقم لیتا اور غلط کاموں میں اڑاتا ہے۔ پورا محلہ جانتا ہے کہ اس کی بیٹی منہ زور اور نافرمان ہے اور رات گئے پارٹیاں کر کے اپنی مرضی سے جب چاہے گھر آتی ہے اور روکنے ٹوکنے پر ماں باپ کے سامنے زبان چلاتی ہے۔ اس کی بیوی خالدہ سارا دن شاپنگ کرنے اپنے جیسی خواتین کے ساتھ ہوٹلنگ کرنے اور شوہر کے سامنے زبان درازی کرنے کے لیے مشہور ہے۔ کیا یہ ہے سکون؟ اس کے برعکس میرا بیٹا میرا فرمانبردار ہے، قناعت پسند ہے، ایک سیکنڈ ہینڈ سائیکل لے کر دینے پر بھی میرا شکریہ ادا کرتا ہے اور اس سائیکل پر جا کر کہیں غلط کام نہیں کرتا۔ میری بیٹی میرے کپڑے دھونے، استری کرنے سے لے کر میرا سر دبانے تک، ہر وقت میری اور گھر کی فکر میں رہتی ہے۔ عید پر ایک سوٹ اور کانچ کی چوڑیاں لے کر صبر شکر کرتی ہے۔ میری بیوی اپنے ضروری اخراجات میں سے بھی بچت کرتی ہے، میرے کام میں میرا ہاتھ بٹاتی ہے تاکہ میں آرام

ٹیکنی کلر کہانی

میری سرورق کی طویل کہانی واپس کرتے ہوئے متعلقہ ایڈیٹر نے کہا۔ "معاف کیجیے، میں آپ کی ٹیکنی کلر کہانی شائع نہیں کر سکتا۔"

"ٹیکنی کلر کہانی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں" پہلے صفحے پر ہیروئن شرم سے سرخ ہو گئی، دوسرے صفحے پر ہیرو غصے سے نیلا پڑ گیا، تیسرے صفحے پر رقیب رو سیاہ خوف کے باعث پیلا پڑ گیا، چوتھے پر نیلے آسمان پر سفید بادل تیرنے لگے، پانچویں پر ہیروئن کی بہن نے دھانی دوپٹا پہنا، چھٹے پر سبز رنگ کا طوطا ٹیں ٹیں کرنے لگا، ساتویں پر سیاہ رات کے اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیا اور آٹھویں پر لڑکی کے گالوں پر قوس قزح کے رنگ پھوٹ پڑے۔"

(مرسلہ: پرویز احمد، ملتان)

احتیاط

ایک صاحب ٹیکسی میں جا رہے تھے۔ ڈرائیور منچلا تھا اور کار خطرناک حد تک تیزی سے چلا رہا تھا۔ دو چار جگہ جب ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تو ان صاحب نے گھبرا کر ٹیکسی والے سے کہا۔ "بھائی! ذرا احتیاط کرو۔ میرا نہیں تو میرے بارہ بچوں کا خیال کرو۔"

ڈرائیور نے ہنستے ہوئے کہا۔ "صاحب! احتیاط برتنے کا جو مشورہ آپ مجھے دے رہے ہیں، اس پر خود آپ کو برسوں پہلے عمل کرنا چاہیے تھا۔"

وقفہ

دفتر کے ایک کلرک نے اپنے ساتھی کلرک سے پوچھا۔ "کیا بات ہے، تم دفتر میں چائے کا وقفہ کیوں نہیں کرتے؟"

اس کے ساتھی نے جواب دیا۔ "میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں۔ چائے پینے سے میری نیند میں خلل آتا ہے۔"

(مرسلہ: خالد بٹ، لاہور)

کر سکوں۔ میری بیوی نے بچوں کی ایسی تربیت کی ہے کہ وہ اتنی کم عمری میں ہی باپ اور ماں کا خیال رکھتے ہوئے ہر کام میں حصہ لیتے ہیں، نماز کی پابندی کرتے ہیں، ہمسایوں سے تمیز سے بات کرتے ہیں۔ مجھے لگا سارا کام ہو جائے، میری بیوی، بیٹی اور بیٹا میرے ارد گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ فیاض احمد کے نصیب میں یہ سب نہیں ہے۔ زینب! میں ہرگز بے سکون نہیں ہوں، میں بڑی مطمئن اور پُرسکون زندگی گزار رہا ہوں۔ میری فیملی حلال کھاتی ہے، میرا کہا مانتی ہے، میرے کنبے کے سارے افراد ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، اتفاق و پیار ہے۔ یقین کرو زینب! میں نے کبھی فیاض احمد کو ایسا پُرسکون نہیں دیکھا، جیسا میں ہوں۔ وہ اپنی دولت، حیثیت پر گھمنڈ کرتا ہے، غریبوں کا مذاق اڑاتا ہے، اپنے سے کم حیثیت والوں کو کمتر سمجھتا ہے لیکن اس کی زندگی میں یہ دولت، گھمنڈ، سکون اور اطمینان نہیں لا سکے۔ میں نے اسے ہمیشہ غیر مطمئن اور چڑچڑا دیکھا ہے۔'' ارشاد علی چائے پینا بھول کر مسلسل بولتا چلا گیا۔ زینب، حنا اور ارسلان کے چہروں کے تاثرات ارشاد علی کی تائید کرتے نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

''یہ کون سا وقت ہے گھر آنے کا؟ سارا دن شاپنگ کرنے کے لیے کافی نہیں جو تم نے رات کو بھی پیسا برباد کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج ملازمہ نے کھانا بھی ڈھنگ کا نہیں بنایا۔ سارا دن تھک ہار کر آؤ تو کھانے کو بھی اچھا نہیں ملتا۔ تم کچن کے لیے تھوڑا سا وقت بھی نہیں نکال سکتیں؟'' خالدہ کو کمرے میں داخل ہوتے اور بہت سے شاپنگ بیگز اٹھائے دیکھ کر فیاض نے غصے سے بولنا شروع کر دیا۔

''ہو گئے شروع پھر سے یوں فضول بولنا۔ توبہ ہے، کیسا شوہر ملا ہے مجھے۔'' بڑبڑاتے ہوئے خالدہ بیگز پٹخ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ کھولتے خون کے ساتھ فیاض سر تھامے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔

☆☆☆

''سب کو کپڑے پسند آ گئے؟'' ارشاد علی نے حنا کو پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا، جو اپنا سوٹ اٹھا کر غور سے دیکھ رہی تھی۔ ارشاد علی آج بیوی، بیٹی اور بیٹے کے لیے ایک ایک نیا سوٹ لایا تھا۔ تینوں کو ان کے پیکٹ تھماتے ہوئے اسے خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ آج وہ انھوں کے لیے کچھ نیا اور اچھا خرید کر لایا ہے۔

''ابو جی! آپ لائے ہی اچھا ہیں، پسند کیسے نہ آئے۔ بہت پیارے جوڑے ہیں۔'' حنا کی آنکھوں سے باپ کے لیے محبت چھلک رہی تھی۔

''اور کیا، اتنی محنت کر کے لائے ہیں، مجھے تو بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔'' زینب نے اپنے پرنٹڈ سوٹ کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شوہر کے لیے شکر گزاری کے تاثرات تھے۔

''ابو جی! آپ کا سوٹ کہاں ہے؟'' ارسلان نے اپنا پیکٹ ایک طرف رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''بیٹا! میرے کپڑے ابھی نئے ہیں اس لیے......''

ارشاد علی بولنے لگا کہ بیوی نے بات کاٹ دی۔

''پتا تھا مجھے کہ آپ اپنے لیے کپڑے نہیں خریدیں گے۔ اس لیے جب مجھے پتا چلا کہ آپ آج ہمارے لیے خریداری کریں گے تو میں نے آپ کے لیے خود سوٹ خرید لیا۔'' زینب اندر سے شوہر کے لیے خریدا گیا سوٹ لاتے ہوئے بولی۔ ارشاد علی نے اس سادہ سے سوٹ کو بڑے پیار اور عزت سے تھاما، جو اس کی شریکِ حیات اپنی بچت میں سے اس کے لیے لائی تھی۔

''ابو جی! آپ ہمارے لیے بہت کچھ کرتے ہیں، اللہ آپ کو اجر دے۔'' ارسلان نے جذباتی سا ہو کر کہا اور باپ کے پاس بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگا۔

''آمین بیٹا! ویسے اگر یہ دعا وقت پر دی جاتی تو اور بھی کچھ اچھا مل جاتا، اب تو جو مل گیا ہے اس پر صبر شکر کر رہے ہیں۔'' ارشاد علی نے زینب کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے دلچسپ سا شکوہ کیا۔

''ہاں ہاں، درست کہہ رہے ہیں...... صبر شکر تو ہو رہا ہے...... یہ شکر کر رہے ہیں اور میں صبر۔'' زینب نے کہیں سے سنی گئی بات کہتے ہوئے فوراً بدلہ لیا تو پورا گھر خوبصورت سی ہنسی سے گونج اٹھا۔ سارے دن کی تھکن اور سخت حالات کی تلخی ان مسکراہٹوں میں گم ہو رہی تھی۔

☆☆☆

ارشاد علی گلی میں داخل ہونے والا تھا کہ اسے یکدم رکنا پڑا۔ محلے میں کافی لوگ جمع تھے اور ایک جانب دیکھ کر باتیں کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے چہروں کے تاثرات دیکھ کر وہ تیزی سے بائیک سے اترا اور گلی کا جائزہ لیا۔ فیاض احمد کے گھر کے سامنے پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے، پولیس کیوں آئی ہے؟'' دوسرے محلے سے حالات دیکھنے آئی ایک عورت نے سوال کیا۔

''فیاض احمد کو پکڑنے آئی ہے۔ پتا چلا ہے کہ اس کے

کسی غیر قانونی کاروبار تھے اس لیے۔'' اسے کسی نے جواب دیا۔ فیاض نے گھر کی پچھلی طرف سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن پولیس نے یہ کوشش ناکام بنادی۔ جس محلے میں فیاض کا کروفر، غرور، شان، عالیشان گاڑیوں کا چرچا تھا...... وہاں کے مکین آج اسے ہتھکڑی میں سر جھکائے جاتا دیکھ رہے تھے۔ بھرا پرا گھر ویرانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ارشاد علی نے بڑے ''کاروباری'' کو جاتا دیکھا اور خاموشی سے اپنے ''زنگ بر گئے'' کاروبار کو بائیک پر سے اتار کر گھر میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

''فیاض کی بیوی بتا رہی تھی کہ میرا شوہر بے قصور ہے، اصل مجرم تو وہ ہیں جنہوں نے اسے استعمال کیا اور وہ اتنے طوطا چشم نکلے کہ اچھے حالات میں دوستی کا دم بھرنے والے یکدم غائب ہو گئے۔ کال تک ریسیو نہیں کر رہے۔ جن لوگوں کے لیے کام کیا، آج وہ کنی کترا گئے ہیں۔''

زینب، ارشاد علی کو بتا رہی تھی اور ارشاد علی کے سامنے وہ سارے منظر آ رہے تھے جب جب فیاض نے اسے کمتر سمجھ کر ذلیل کیا تھا۔

''کیا ملا بڑا کاروباری ہونے سے۔ اب تو سب جیل، وکیلوں میں ختم ہو جائے گا۔'' ارسلان بولا۔

''بیٹا! بڑے کاروبار کا ہونا رب کا کرم اور نعمت ہے۔ بڑے بڑے کاروبار پوری دنیا میں ہوتے ہیں۔ یوں کہو کیا ملا غیر قانونی کاروبار سے۔ ایک تو حرام کام، اوپر سے میاں بیوی کا غرور، ڈوبنا تو تھا ہی۔'' ارشاد علی نے کہا۔ وہ اپنے چھوٹے سے کام پر نازاں تھا۔

☆☆☆

آج یکم مئی تھا، مزدوروں کا عالمی دن زور و شور سے منایا جا رہا تھا۔ ارشاد علی نے ناشتا کیا اور چھٹی والے دن بھی اپنا کام گھر پر بیٹھ کر کرنے لگا۔ زینب بھی پاس بیٹھی تھی۔

''ابو جی! آج مزدوروں کا دن ہے یعنی آج آپ کا دن ہے۔'' حنا نے برتن دھوتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ارشاد علی قناعت پسند تو پہلے ہی تھا لیکن فیاض احمد کے واقعے کے بعد اسے اپنی محنت اور ہاتھ کی کمائی سے زیادہ ہی لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ بار بار شکر کرتا کہ اپنی حلال کمائی کی برکت سے وہ کبھی بھی یوں ذلیل نہیں ہو گا جس طرح فیاض احمد یا کوئی بھی حرام کام کرنے والا ہوتا ہے۔

''ہاں بیٹا! واقعی آج میرا دن ہے، بلکہ یوں کہو سارے ہی دن مزدور کے ہیں...... اور میری پاک کمائی کا بھی میں شکر ادا کرتا ہوں۔ فیاض احمد نے غلط لوگوں سے دوستیاں رکھیں جو پل میں ختم ہو گئیں۔ میں خوش نصیب ہوں کہ میں ہاتھ سے کمانے کی وجہ سے اللہ کا دوست ہوں اور میری دوستی اللہ سے ہے جو کبھی ختم نہیں ہو گی۔'' ارشاد علی نے کپڑوں کو الگ الگ کرتے ہوئے بڑے جذب سے کہا۔ حنا نے برآمدے میں پڑا ٹی وی آن کر دیا اور خود بھی ماں باپ کے پاس آ بیٹھی۔ ارسلان بھی مدد کرنے آ چکا تھا۔ ٹی وی پر کوئی شاعر بڑی خوبصورت حقیقت بیان کر رہا تھا۔

صرف یکم مئی ہی نہیں
صرف ایک دن ہی نہیں
ہر دن مزدور کا ہے
ہر پل مزدور کا ہے
لباس کے رنگ
دیواروں کے رنگ
عمارتوں کی اونچائی
دلہن کے لباس کی کڑھائی
سب میں مزدور ہے ساتھ...... سب میں مزدور کا ہاتھ
سنہری گندم میں...... کپاس کے پھولوں میں
گنے کے رس میں...... ہر اک کے نوالوں میں
مزدور کی مشقت ہے...... مزدور کی محنت ہے
عمارتوں کی اونچائی میں، مِیناروں محرابوں میں
مٹی سے سونا اگانے میں، خوش رنگ گلابوں میں
ہر جگہ مزدور ہے...... ہر جگہ مزدور ہے
سونا، موتی، ہیرا نکالا اس نے
پتھر کو نئی شکل میں ڈھالا اس نے
نہروں کی گہرائی میں
باغوں کی رعنائی میں
مزدور ہے...... ہاں صرف مزدور ہے
تنور کی روٹی کے نوالے میں،
نہاری، پائے کے پیالے میں
انسان کی خدمت میں...... محنت کی عظمت میں
مزدور ہے...... ہاں...... مزدور ہے
حلال کمایا جس نے کامیاب ہے واللہ
الکاسب حبیب اللہ، الکاسب حبیب اللہ

شاعر کہہ رہا تھا اور اپنے اعزاز پر نازاں ارشاد علی اپنے کنبے سمیت مزدوری کر رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ وہ حلال کمائی کما کر اللہ کا دوست ہونے کا رتبہ پا چکا ہے۔

✖✖✖

urdunovels.com

بر محل

ملک صفدر حیات

میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں... اگر ان میں دوریاں پیدا ہوجائیں تو بسا اوقات شرمناک واقعات جنم لیتے ہیں... وہ بھی اپنی بیوی سے دور پردیس میں کما رہا تھا... اسے نہیں پتا تھا کہ اس کے پیٹھ پیچھے کیا گل کھلائے جا رہے ہیں... مگر جب حقیقت سے کسی بھیانک راز کی طرح پردہ ہٹا تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا... اور وہ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

بیوی کی بے وفائی سے نالاں ایک شخص کے جرم کی کہانی

ان دنوں میری تعیناتی ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل وزیر آباد کے ایک تھانے میں تھی۔ ماہ مارچ کی ایک خوش گوار صبح میں حسبِ معمول تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک بری خبر میری منتظر تھی۔ میں جیسے ہی جا کر کمرے میں بیٹھا، حوالدار امیر خان نے میرے پاس آکر اطلاع دی۔

''ملک صاحب! ساتھ والے پنڈ میں قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے......!''

''اس ساتھ والے پنڈ کا کوئی نام تو ہوگا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے حوالدار کی طرف دیکھا۔

''جی ملک صاحب......!'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں موضع قلعہ خدا بخش کی بات کر رہا ہوں۔''

قلعہ خدا بخش میرے تھانے سے دو میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع تھا۔ یہ لگ بھگ ایک ہزار نفوس پر مشتمل ایک متوسط سائز کا گاؤں تھا جو دریائے چناب کے کنارے پر آباد تھا۔

''کون قتل ہوگیا ہے بھئی؟'' میں نے پوچھا۔

''مقتولہ کا نام زاہدہ پروین ہے ملک صاحب!'' امیر خان نے بتایا۔ ''اس کا گھر والا باہر بیٹھا ہے۔''

جب میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے برآمدے میں، چوبی بنچ پر ایک دراز قامت شخص کو سر جھکائے بیٹھے دیکھا تھا۔ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''مقتولہ کے خاوند کو اندر بلاؤ......''

ایک منٹ سے بھی پہلے مرد مذکور میرے سامنے حاضر تھا۔ اس کا نام جاوید بخش معلوم ہوا۔ جاوید کی عمر پینتیس کے آس پاس تھی۔ وہ گندمی رنگت کا مالک ایک مضبوط البدن دراز قد شخص تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ میز کی دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی وضع قطع اور حرکات و سکنات سے ایک سلجھا ہوا انسان دکھائی دیتا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے دیہاتی پن نہیں جھلکتا تھا۔

''مجھے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟'' میں نے جاوید سے

استفسار کیا۔

”تھانے دار صاحب! میں پچھلے پانچ سال سے برطانیہ میں مقیم ہوں۔“ وہ شائستہ مگر بوجھل لہجے میں گویا ہوا۔ ”میں نے وہاں دن رات محنت کی اور ایک سال پہلے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اور جوزفین مل کر اس ریسٹورنٹ کو سنبھالتے ہیں......!“

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”کون جوزفین؟ کیا وہ تمہاری بزنس پارٹنر ہے......؟“

”نہیں جناب......!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جوزفین میری لائف پارٹنر ہے۔ دو سال پہلے میں نے جوزفین سے شادی کی تھی۔ اس ریسٹورنٹ کو بنانے اور چلانے میں اس نے میری بہت مدد کی ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ جوزفین تمہاری دوسری بیوی ہے؟“

”جی تھانے دار صاحب......!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”یہی حقیقت ہے۔ اگر جوزفین کو پتا چل جاتا کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں تو وہ میری شریکِ سفر بننے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتی۔ ویسے میں نے سوچ لیا تھا کہ جوزفین کو حقائق سے آگاہ کر دوں گا مگر اس سے پہلے ہی مجھے ایمرجنسی میں پاکستان آنا پڑ گیا۔“

”کیا تمہاری پہلی بیوی مقتولہ زاہدہ پروین اس راز سے واقف تھی کہ تم نے ولایت میں کسی میم سے دوسری شادی کر لی ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔

اس نے نفی میں گردن ہلانے کو کافی سمجھا۔

”بخشی صاحب......!“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”تمہاری شادی کے معاملات پر بعد میں تفصیلی بات کریں گے۔ فی الوقت تم مجھے جائے وقوعہ پر لے چلو۔“

وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”جو حکم تھانے دار صاحب!“

میں نے فی الفور ایک تانگے کا بندوبست کیا اور کانسٹیبل عابد علی کی معیت میں، جاوید بخشی کے ساتھ موضع قلعہ خدا بخش کی سمت روانہ ہو گیا۔ راستے میں مقتولہ کے شوہر جاوید سے میں نے چند سوالات کیے جن کی روشنی میں، جاوید کے جوابات نے مجھے ایک خاص زاویے پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی تھی۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، قلعہ خدا بخش نامی وہ پنڈ میرے تھانے کی شرقی جانب، دو میل کے فاصلے پر، دریائے چناب کے کنارے واقع تھا۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ، بہتے ہوئے پانی کی مخالف سمت سفر کرتے ہوئے دوپہر میں موضع قلعہ خدا بخش پہنچ گئے۔

مارچ کی بارہ تاریخ تھی۔ موسم معتدل اور خوش گوار تھا۔ رواں دواں نہر یا دریا کے کنارے کے ساتھ سفر کرنا ویسے ہی دل و نظر کے لیے فرحت اور طراوت کا باعث ہوتا ہے تاہم ان لمحات میں ماحول کے حسن اور فضا کی تازگی سے کما حقہٗ استفادہ کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ میں ایک سوگوار انسان کے ہمراہ اس کی شریکِ حیات کے قتل کی تفتیش کرنے جا رہا تھا۔ ایسے میں میرا دھیان گرد و پیش کے بجائے اس اندوہ ناک واقعے پر لگا ہوا تھا۔

جاوید بخشی کا مکان گاؤں کے وسط میں واقع تھا۔ وہ تیرہ، چودہ مرلے کا ایک صاف ستھرا گھر تھا۔ کراچی کے رہنے والے اسے سوا چار سو گز پر تعمیر شدہ گھر سمجھ لیں۔ مذکورہ مکان میں صرف تین افراد رہتے تھے۔ جاوید بخشی، اس کی ماں غفوراں بی بی اور جاوید کی پہلی بیوی زاہدہ پروین جو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔ جاوید مجھے اس کمرے میں لے گیا جہاں زاہدہ کی لاش ایک چارپائی پر پڑی تھی۔

اس گھر کے عقبی حصے میں دو بڑے کمرے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے ایک لمبا برآمدہ تھا۔ اس کے بعد کشادہ صحن تھا۔ دو افراد یعنی غفوراں بی بی اور اس کی بہو زاہدہ پروین کی ضرورت کے حساب سے وہ کافی بڑا گھر تھا۔ موسمِ سرما رخصت ہو چکا تھا اور بہار کی آمد آمد تھی۔ تاہم ابھی رات میں اچھی خاصی خنکی ہو جاتی تھی۔ لہٰذا گاؤں والوں نے کھلی فضا میں سونا شروع نہیں کیا تھا۔

زاہدہ کی لاش ایک چارپائی پر پڑی تھی۔ اس کی شہ رگ پر کوئی تیز دھار چھری چلا کر اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کٹی ہوئی گردن سے خارج ہونے والے خون نے بستر کو بھگو دیا تھا۔ تاہم وہ خون جم چکا تھا۔ بادی النظر میں مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ بدنصیب زاہدہ کی موت رات کے آخری پہر میں کسی وقت واقع ہوئی تھی۔ تھوڑی سی تلاش کے نتیجے میں، میں آلۂ قتل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری توقع کے عین مطابق، وہ ایک تیز دھار چھری ہی تھی جس کے پھل پر لگا ہوا خون بھی پوری طرح جم چکا تھا۔ مذکورہ چھری مجھے مقتولہ کی چارپائی کے نیچے پڑی ملی تھی۔

میں نے جائے وقوعہ کی ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد زاہدہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کی غرض سے، کانسٹیبل عابد علی

کی نگرانی میں ضلعی اسپتال بھجوا دیا اور خود اہلِ خانہ سے سوال وجواب میں مصروف ہو گیا۔

منظوراں بی بی کی عمر ساٹھ سے تجاوز تھی اور صحت کے لحاظ سے وہ اسی کے پیٹے میں نظر آتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کی قوتِ سماعت اور بینائی بھی خاصی حد تک کمزور ہو چکی تھی۔ سو، میں نے اسے بعد کے لیے چھوڑا اور پہلے جاوید بھٹی کا انٹرویو شروع کر دیا۔ جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے سے پہلے میں نے اس گھر کا تفصیلی معائنہ بھی کر لیا تھا۔

"جاوید! زاہدہ والی چارپائی کے ساتھ ایک دوسری چارپائی بھی بچھی ہوئی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "گزشتہ رات اس چارپائی پر کون سویا تھا؟ دونوں چارپائیوں پر باقاعدہ گرم بستر بھی لگا ہوا ہے......!"

"تھانے دار صاحب! جیسا کہ آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے گھر میں صرف دو ہی کمرے ہیں۔" اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بوجھل آواز میں جواب دیا۔ "دونوں کمروں میں دو، دو چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں۔ جب میں یہاں نہیں ہوتا تو زاہدہ اور اماں ایک ہی کمرے میں سوتی ہیں۔ میں سال میں ایک بار چند دن کے لیے پاکستان آتا ہوں تو پھر میں اور زاہدہ الگ کمرے میں سوتے ہیں...... میرا مطلب ہے، سوتے تھے......!" وہ بات کو ادھورا چھوڑ کر اچانک خاموش ہو گیا۔

میں نے اس دوران میں اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ان لمحات میں وہ جذبات کی باڑ پر تھا۔ زاہدہ کی موت نے اسے اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ چند لمحات کے سکوت کے بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تھانے دار صاحب! مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ زاہدہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی۔ رات کے پہلے پہر ہم دونوں میاں بیوی ایک ہی بستر پر تھے۔ وہ مجھ سے جھگڑا کر رہی تھی۔ میں معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی ناراضی کم نہیں ہو رہی تھی اور......"

"ایک منٹ......!" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔ "زاہدہ کس بات پر تم سے خفا تھی؟ وہ تم سے جھگڑا کیوں کر رہی تھی۔ کیا اسے تمہاری دوسری شادی کی بھنک پڑ گئی تھی......؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے تھانے دار صاحب......!" وہ نڈھالی سے بولا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "تو پھر کیسا ہے؟"

"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہر سال چند روز کے لیے میں پاکستان آتا ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اور میرا یہ دورہ عموماً دسمبر یا جنوری میں ہوتا ہے لیکن اس سال مجھے مجبوراً مارچ میں دوبارہ یہاں آنا پڑا حالانکہ چار ماہ پہلے میں گھر سے ہو کر گیا ہوں......!"

"ایسی کیا مجبوری آن پڑی تھی کہ تمہیں دوبارہ پاکستان آنا پڑا؟" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے تیز آواز میں استفسار کیا۔

"آٹھ مارچ کو مجھے ایک تار (ٹیلی گرام) موصول ہوا تھا......!" وہ میرے سوال کے جواب میں گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ "اس تار میں میرے لیے ایک خوفناک اور دل دہلا دینے والا پیغام تھا جس کے مطابق میری اماں کی موت واقع ہو گئی تھی اور مجھے فوری طور پر گھر پہنچنے کے لیے کہا گیا تھا لہٰذا میں نے افراتفری میں فلائٹ پکڑی اور چلا آیا۔ گھر پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ اماں تو ٹھیک ٹھاک اور بقیدِ حیات ہیں۔"

زمانہ قدیم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ مختصر، موثر اور تیز رفتار پیغام رسانی کے لیے ٹیلی گراف سسٹم کے ذریعے ٹیلی گرام بھیجا جاتا تھا جسے عرفِ عام میں "تار" کہتے تھے۔ یہ دراصل ریڈیائی اور برقی سگنلز کی مدد سے، کاغذ پر تحریر شدہ ایک پیغام ہوتا تھا۔ ایسے پیغامات عموماً کسی بری اطلاع کے لیے بھیجے جاتے تھے۔

"وہ ٹیلی گرام تمہیں کس نے بھیجا تھا؟" میں نے ایک اہم سوال کیا۔

"اس تار پر بھیجنے والے کا نام زاہدہ پروین لکھا ہوا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا تم نے اس تار کے بارے میں زاہدہ سے پوچھ تاچھ کی تھی؟"

"ظاہر ہے...... سب سے پہلے تو میں نے اسی سے انکوائری کی تھی۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "لیکن وہ اس تار کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی بلکہ وہ تو میری آمد پر خاصی خوش نظر آ رہی تھی کہ اس بار میں چار ماہ کے بعد ہی گھر آ گیا ہوں۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر پچھلی رات وہ کس بات پر تم سے جھگڑا کر رہی تھی؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "ابھی تم نے ہی مجھے بتایا ہے کہ وہ کسی معاملے کو لے کر ناراض تھی اور تم اسے منانے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ غصہ تھوکنے کو تیار نہیں تھی اسی لیے تم الگ چارپائیوں پر سوئے تھے......!"

"اس کا مطالبہ تھا کہ میں اسے بھی اپنے ساتھ انگلینڈ لے جاؤں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ "میں نے کہا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے اور پھر اگر میں کسی طرح اسے یہاں سے لے بھی گیا تو پیچھے میری ضعیف ماں اکیلی رہ جائے گی۔ اس مسئلے کے حل کے طور پر زاہدہ نے مجھ سے کہا کہ میں ان دونوں کو اپنے پاس ولایت بلا لوں۔ آپ خاصے سمجھ دار انسان ہیں تھانے دار صاحب! آپ میری مشکل کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ماں اور بیوی کو اپنے ساتھ برطانیہ لے جا کر مستقل وہاں رکھنا ناممکن کی حد تک دشوار تو ہے ہی، اس پر سب سے خطرناک ایشو یہ تھا کہ جب جوزفین اور زاہدہ کو یہ پتا چلتا کہ وہ ایک دوسرے کی سوتن ہیں تو میرا بیڑا غرق ہو جاتا۔ یہ معاملہ کورٹ میں جاتا اور مجھے دھوکا دہی کے الزام میں جیل جانا پڑتا۔ برٹش قانون میرے مقابلے میں جوزفین کی سنتا اور برسوں کی محنت سے میں نے جو ریسٹورنٹ وہاں بنایا ہے، وہ میرے ہاتھ سے نکل کر جوزفین کی کسٹڈی میں چلا جاتا۔ آپ میری مجبوری کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں کسی بھی قیمت پر زاہدہ کو انگلینڈ لے کر نہیں جا سکتا تھا۔"

"میں تمہارے حالات کو سمجھ سکتا ہوں جاوید!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "دو گھوڑیوں کا سوار ہمیشہ منہ کے بل زمین پر گرتا ہے اور اگر ان میں سے ایک گھوڑی کوری بیم ہو تو گرنے کے بعد اس کا بچنا محال ہے۔ اگر تم زاہدہ کو وہاں لے جاتے یا جوزفین کو یہاں لے آتے تو ان دونوں کی ملاقات کسی ایٹمی دھماکے سے کم نہ ہوتی جس میں تمہارا حال وہی ہوتا جو دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی کا ہوا تھا۔ بہر حال......!" میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"کیا وہ ٹیلی گرام تمہارے پاس محفوظ ہے جس نے تمہاری دوڑیں لگوا دی تھیں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "جی، وہ میرے سامان میں رکھا ہوا ہے۔"

"کیا تم وہ تار مجھے دکھا سکتے ہو؟"

"جی ضرور......!" یہ کہتے ہوئے وہ میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

پولیس ڈیپارٹمنٹ بھی ایک ایسا سرکاری محکمہ ہے جس سے وابستہ افراد کو ہر پل ایک شک کی کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے، خصوصاً کسی کیس کی تفتیش کے دوران میں تو بعض اوقات اپنی ذات کو بھی شک کے دائرے میں رکھ کر پیش قدمی کرنا ہوتی ہے۔ مقتولہ زاہدہ پروین کے قتل کے معمے کو حل کرنے کی غرض سے، میں اس کے شوہر جاوید کو بھی کڑی شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ آپ اسے میری محکمہ جاتی مجبوری سمجھ لیں۔

جاوید کی واپسی کم و بیش دو منٹ کے بعد ہوئی اور میرے پاس آ کر اس نے ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تھانے دار صاحب! وہ تار اس لفافے میں ہے۔"

میں نے لفافہ کھول کر مذکورہ تار کے مختصر مضمون کو پڑھا جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ جاوید نے مجھ سے کسی نوعیت کی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ میں نے اس لفافے کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

"میں ضروری چیکنگ کے لیے اسے اپنے پاس رکھ رہا ہوں۔ بعد میں تمہیں واپس کر دوں گا، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو......؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جناب!" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھ تاچھ کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا اس ٹیلی گرام کے بارے میں تم نے اپنی ولایتی بیوی جوزفین کو بتایا تھا؟"

"جی ہاں!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "یہ تار میرے ریسٹورنٹ کے ایڈریس پر آیا تھا لہٰذا یہ معاملہ جوزفین سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ جب جوزفین کو پتا چلا کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے تو اس نے جلد از جلد مجھے پاکستان پہنچنے کو کہا تھا۔ وہ خود میرے ساتھ ائرپورٹ تک آئی تھی۔"

"کیا جوزفین نے تم سے تار بھیجنے والی زاہدہ پروین کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا؟" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔

"جی، اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ ٹیلی گرام بھیجنے والی زاہدہ پروین کون ہے؟" اس نے بتایا۔ "اور جواب میں، میں نے اس سے ایک بہانہ کر دیا تھا۔"

"کیسا بہانہ؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ زاہدہ پروین میری دور کی ایک رشتے دار ہے اور وہ بھی ہمارے گاؤں ہی میں رہتی ہے۔" جاوید نے جواب دیا۔ "ظاہر ہے میں جوزفین سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹیلی گرام بھیجنے والی میری پہلی بیوی ہے۔"

"ظاہر ہے!" میں نے تائیدی انداز میں گردن

ہلاتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب......!'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''ٹیلی گرام بھیجنے کے لیے ٹیلی گراف آفس تک جانا ضروری ہے اور یہ کام زاہدہ کے بس کا تو نہیں تھا۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ اپنے تعلقات استعمال کر کے آپ یہ پتا لگانے کی کوشش کریں کہ ٹیلی گرام بھیجنے والا کون ہے۔ اگر اس بندے کا سراغ مل گیا تو مجھے یقین ہے، آپ کا ہاتھ زاہدہ کے قاتل کی گردن تک بھی پہنچ جائے گا۔''

''جاوید بھٹی! تم بالکل میرے انداز ہی میں سوچ رہے ہو۔'' میں نے تعریفی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹیلی گرام اسی مقصد کی خاطر میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔''

اس نے دل سے میرا شکریہ ادا کیا۔

''تم دونوں میاں بیوی گزشتہ رات لڑ جھگڑ کر الگ، الگ چارپائی پر سو گئے تھے......!'' میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے مقتولہ کے شوہر سے پوچھا۔ ''اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، تمہیں زاہدہ کی موت کے بارے میں کب پتا چلا تھا؟''

''آج صبح جب میں سو کر اٹھا تو زاہدہ اپنے بستر پر مردہ پڑی تھی۔'' اس نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ''اس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور بستر پر ہر طرف خون ہی خون تھا۔''

''کیا تمہیں یاد ہے کہ پچھلی رات تم کتنے بجے سوئے تھے؟''

''میرا خیال ہے، گیارہ اور بارہ کے درمیان۔''

''اور اس وقت زاہدہ ٹھیک ٹھاک تھی......؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ ''رات کو سو جانے کے بعد سے آج صبح تک تم اپنے کمرے سے باہر نکلے تھے؟''

''جی ہاں......!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں جب بھی برطانیہ سے پاکستان آتا ہوں تو آب و ہوا کی تبدیلی کے باعث میرا پیٹ خراب ہو جاتا ہے جس کے لیے مجھے بار بار واش روم جانا پڑتا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ گاؤں کے ''واش روم'' فصلوں سے بھرے ہوئے کھیت ہی ہوتے ہیں۔ پچھلی رات کے مروڑ اور ''گڑبڑ'' کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی اور رفع حاجت کے لیے مجھے کھیتوں کا رخ کرنا پڑا تھا۔''

''یاد کر کے بتاؤ......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم رفع حاجت کی خاطر رات کتنے بجے گھر سے نکلے تھے؟''

''میں نے گھڑی میں وقت نہیں دیکھا تھا۔'' جاوید بھٹی نے جواب دیا۔ ''اس وقت میرے ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح جلد از جلد مجھے کھیتوں میں پہنچنا ہے۔''

''تم جب گھر سے نکلے تو زاہدہ ٹھیک تھی نا......؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھانے دار صاحب!''

''اور جب اپنے پیٹ کا بوجھ اتارنے کے بعد تم واپس آئے تو......؟''

''میں نے زاہدہ پر دھیان نہیں دیا تھا۔'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''میں واپس آیا اور چپ چاپ اپنے بستر پر سو گیا۔ پھر آج صبح ہی میری آنکھ کھلی تھی۔''

''جب تم رات کو سوئے تو زاہدہ زندہ اور سلامت تھی لیکن صبح وہ ایک خون چکاں لاش میں بدل چکی تھی۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں خودکلامی کی پھر جاوید بھٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ''جب تم رفع حاجت کے لیے گھر سے باہر گئے تو داخلی دروازہ اچھے سے بند کر دیا تھا......؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں جب واپس آیا تو دروازہ مجھے بند ہی ملا تھا۔''

''میں نے تمہارے مکان کا تفصیلی معائنہ کیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''گھر میں آمدورفت کا جائز راستہ صرف ایک ہی ہے......یعنی گھر کا داخلی دروازہ!''

''جائز راستہ......؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''میں سمجھا نہیں تھانے دار صاحب......!''

''جائز راستے سے میری مراد ہے گھر کے اندر آنے کا مہذب اور شریفانہ ذریعہ......!'' میں نے اس کی الجھن دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ''ورنہ ناجائز راستہ تو کوئی بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ چھت پر چڑھ کر گھر کے اندر اترنا یا پھر دیوار پھلانگ کر اندر آنا......!''

''اوہ......!'' وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''کیا تمہاری ماں کو اس بات کا علم ہے کہ تم رات کے آخری پہر رفع حاجت کے لیے گھر سے باہر گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے اماں کی نیند خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔''

''کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟'' میں نے سپاٹ آواز میں سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے، تمہارے خیال میں زاہدہ کو کس نے قتل کیا ہوگا؟''

''تھانے دار صاحب! میری تو کسی سے بھی دشمنی نہیں ہے اس لیے میں قاتل کے حوالے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ

urdunovels.com

بے بسی سے بولا۔ ”میں نے ساری تفصیلات آپ کے سامنے رکھ دی ہیں۔ اس کے آگے آپ کا کام ہے۔ مجھے امید ہے، آپ بہت جلد زاہدہ کے قاتل کو ڈھونڈ نکالیں گے۔“

”ان شاء اللہ......!“ میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ”جاوید بھٹی! میں تمہاری امید پہ پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“

”بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔

”زاہدہ کے ساتھ تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا تھا؟“ میں نے ایک ضمنی سوال کیا۔

”چھ سات یا اس سے کچھ زیادہ......!“ اس نے جواب دیا۔

”اس گھر میں مجھے بچے نظر نہیں آ رہے......؟“

”اولاد دینا یا نہ دینا تو اللہ کے اختیار میں ہے جناب!“ اس نے گول مول انداز میں کہا۔ ”جب سوہنے رب کی مرضی ہوگی تو میں بھی صاحب اولاد ہو جاؤں گا۔“

”جاوید! تمہارا آخری جملہ تو یہ بتا رہا ہے کہ جوزفین سے بھی ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی......!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔ ”حالانکہ تمہاری دوسری شادی کو بھی دو سال ہو گئے ہیں؟“

”یہی حقیقت یہی ہے کہ قدرت ابھی تک مجھ پہ مہربان نہیں ہوئی۔“ اس نے بوجھل آواز میں جواب دیا۔

”انگلینڈ میڈیکل ریسرچ کے حوالے سے دنیا کا نمبر ون ملک ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”تم نے اپنا اور جوزفین کا چیک اپ وغیرہ تو کرایا ہوگا۔ میرا مطلب ہے، ضروری لیبارٹری ٹیسٹ......!“

”سب ہو چکا تھانے دار صاحب......!“ وہ مردہ دلی سے بولا۔ ”زاہدہ میں کوئی نقص تھا اور نہ ہی جوزفین میں کسی نوعیت کی کوئی کمی ہے۔ میرے ہی نصیب میں اولاد نہیں ہے یا...... یوں سمجھ لیں کہ......!“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ”کھل کر بتاؤ...... میں کیا سمجھ لوں؟“

”جوزفین نے اپنے میڈیکل چیک اپ کے علاوہ میرے مردانہ جوہر کا لیبارٹری ٹیسٹ بھی کرایا تھا۔“ وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔

”پھر......؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم دونوں کی رپورٹس کیا کہتی ہیں؟“

”جوزفین کے سارے ٹیسٹ کلیئر ہیں تھانے دار صاحب!“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ بانجھ نہیں ہے۔“

”اور تمہاری طرف کیا حالات ہیں......؟“

”میرے مردانہ جوہر کی رپورٹ تسلی بخش نہیں ہے، بلکہ وہ مایوس کن ہے۔“ اس نے ندامت بھرے لہجے میں بتایا۔ ”اولاد پیدا کرنے کے لیے مردانہ جوہر میں متحرک جرثوموں کا تناسب ساٹھ فیصد یا اس سے اوپر ہونا چاہیے جبکہ میری رپورٹ کے مطابق متحرک جرثومے چالیس فیصد سے بھی نیچے ہیں۔“

اس کے بعد مزید کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے جاوید بھٹی کو یقین دلایا کہ زاہدہ کا قاتل مجھ سے بچ نہیں سکے گا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں واپس تھانے آ گیا۔

☆☆☆

زاہدہ مرڈر کیس نے مجھے ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، اس کیس کی زنجیر میں کئی ایک کڑیاں موجود نہیں ہیں۔ کیس سے متعلق کئی ایک معاملات اپنی جگہ فٹ نہیں بیٹھ رہے تھے جیسا کہ...... جاوید بھٹی کو اس کی ماں کے انتقال کا ٹیلی گرام بھیج کر یہاں بلایا گیا تھا جبکہ وہ زندہ تھی۔ مزے کی بات یہ کہ مذکورہ ٹیلی گرام مقتولہ زاہدہ کی جانب سے بھیجا گیا تھا اور زاہدہ کو اس کی خبر تک نہیں تھی۔ جاوید نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا کوئی دشمن نہیں لیکن زاہدہ کو جس بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور وہ بھی اس کے گھر میں گھس کر۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل کو اس گھر کے حالات اور معاملات کی پکی خبر تھی بلکہ قاتل گھات لگائے بیٹھا تھا۔ جاوید جیسے ہی رفع حاجت کے لیے کھیتوں کی طرف گیا قاتل نے اس کی سوئی ہوئی بیوی کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

سوچنے کی حد تک تو یہ ٹھیک لگتا تھا مگر منطقی طور پر ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے جائے وقوعہ کو چھوڑنے سے پہلے مقتولہ کی ساس غفوراں بی بی سے بھی مختصر پوچھ تاچھ کی تھی لیکن اس کی زبان سے میں کوئی اہم بات اگلوا نہیں سکا تھا۔ غفوراں کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی اور وہ خاصا اونچا سنتی تھی۔ اس کی بینائی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ بہرکیف، غفوراں سے مغزماری کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ خیر، مجھے کہیں نہ کہیں سے تو اپنی تفتیش کا آغاز کرنا تھا۔ سو، میں نے حوالدار امیر خان کو اپنے پاس بلا لیا۔

میں نے امیر خان کو مختصر الفاظ میں صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم کھوجی

urdunovels.com

رسول بخش کو ساتھ لے کر فوراً موضع قلعہ خدا بخش روانہ ہو جائے۔ مقتولہ زاہدہ پروین کے کمرے کے علاوہ بھی گھر کے ایک ایک چپے کا پورا جائزہ لینا ہے حتیٰ کہ مکان کی چھت کو بھی اچھی طرح چیک کرنا ہے۔ اسی طرح گھر کے گردو پیش کا جائزہ بھی ضروری ہے۔ جاوید، اس کی ماں منظوراں بی بی اور مقتولہ زاہدہ پروین کے علاوہ جو بھی کھرا ملے، اسے ساتھ ساتھ محفوظ بھی کرتے جانا ہے۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا......؟"

ان ہدایات کے خاتمے پر میں نے سوالیہ نظر سے حوالدار کی طرف دیکھا تو وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔

"میں چنگی طراں سمجھ گیا ملک صاحب! آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں شام سے پہلے آپ کو رپورٹ پیش کر دوں گا۔"

مجھے تسلی دینے کے بعد حوالدار نے کانسٹیبل فیض احمد اور کھوجی رسول بخش کو اپنے ساتھ لیا اور جائے واردات کی جانب روانہ ہو گیا۔ امیر خان نے کہا تھا کہ میں بے فکر ہو جاؤں مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ زاہدہ کا قتل ایسے پراسرار انداز میں ہوا تھا کہ میری بے فکری یا اطمینان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں مسلسل، اس کیس کی پیچیدگی کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

سہ پہر، شام میں ڈھل گئی مگر میں کسی نتیجے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ غروبِ آفتاب کے ساتھ کانسٹیبل عابد علی ضلعی اسپتال سے واپس آگیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔

"ہاں بھئی۔" میں نے پوچھا۔ "وہاں کیا رہا؟"

"سب ٹھیک سے نمٹ گیا ملک صاحب......!" اس نے جواب دیا۔ "کل دوپہر کے بعد کسی وقت مقتولہ کی لاش کو اسپتال سے تھانے پہنچا دیا جائے گا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی ساتھ ہی آئے گی۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ مزید دو چار باتوں کے بعد کانسٹیبل میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے مغرب کی نماز ادا کی اور دوبارہ اپنے کمرے میں آگیا۔

عام طور پر میں نمازِ مغرب کے بعد تھانے سے نکل کر اپنے کوارٹر میں چلا جاتا تھا، پھر میری واپسی اگلی صبح ہی ہوتی تھی۔ میرا وہ کوارٹر تھانے کے عقبی حصے میں، چار دیواری کے اندر بنا ہوا تھا۔ اس سرکاری رہائش گاہ میں صرف میں اکیلا رہتا تھا لیکن جب حالات معمول کے مطابق نہ ہوں تو مجھے دیر تک تھانے میں موجود رہنا پڑتا تھا۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا اور...... آج بالکل ویسا ہی تھا۔

حوالدار امیر خان کی واپسی سے پہلے میں اپنے کمرے کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بردست، اس کیس کے حوالے سے میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ تفتیش کا باقاعدہ آغاز کرنے کے لیے مجھے دو چیزوں کا انتظار تھا۔ نمبر ایک...... کھوجی رسول بخش کی ماہرانہ رائے۔ نمبر دو...... پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ!

پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے میں تو اچھا خاصا وقت پڑا تھا لیکن کھوجی بابا اندھیرا ہونے کے فوراً بعد لوٹ آیا۔ حوالدار اس کے ساتھ ہی میرے پاس آگیا۔ میں نے رسول بخش سے استفسار کیا۔

"چاچا! پچھلے چار، پانچ گھنٹے میں تم نے کون سا تیر مارا ہے؟"

"ملک صاحب! جوانی میں، میں ایک اچھا تیر انداز ہوا کرتا تھا مگر اب بڑھاپے میں تیر مارنے یا تیر چلانے کی مجھ میں ہمت نہیں رہی۔" رسول بخش نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "آج کل کھوج کھرے کا کام کر کے گزارہ ہو جاتا ہے۔ میں اسی میں خوش ہوں۔"

"میرا اشارہ بھی تمہارے اسی پیشے کی جانب تھا چاچا......!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ "تم خوامخواہ میرے سوال کو گھڑ سواری اور تیر اندازی کی طرف لے گئے......!"

"معافی چاہتا ہوں ملک صاحب!" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "میں نے اس دوران میں حوالدار صاحب کی ہدایات کے مطابق مقتولہ کے گھر کے اندر باہر، اوپر نیچے اور آس پاس کا تفصیلی جائزہ لے لیا ہے۔"

"پھر......؟" میں نے زیرِ لب تبسم کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم کس نتیجے پر پہنچے ہو؟"

"سرکار! گھر کے دونوں کمروں میں اور چھت پر صرف تین افراد کے پاؤں کا کھرا ملا ہے۔" اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "البتہ صحن میں اور مکان کے گردو پیش میں متعدد افراد کے پاؤں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ سورج غروب ہو جانے کے باعث میں اپنے کام کو جاری نہیں رکھ سکا۔ کل صبح میں اس مشن کو آگے بڑھاؤں گا۔ مجھے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس مکان کے آس پاس اور گھر کے صحن میں جن لوگوں کے قدموں کے نشانات میں نے ڈھونڈے ہیں، ان میں سے کون آپ کے کام کا ہے۔ کسی حتمی نتیجے پر پہنچے

کے لیے مجھے ایک دن کا مزید وقت چاہیے ہوگا۔“
رسول بخش کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ”ٹھیک ہے، کل کا دن بھی تمہارا ہے۔“ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا اور پوچھا۔ ”چاچا! تم نے دونوں کمروں کے اندر اور چھت پر جن تین افراد کا کھرا پکڑا ہے، وہ کون لوگ ہیں؟“

”جاوید بھٹی، اس کی ماں غفوراں بی بی اور مقتولہ زاہدہ پروین......!“ کھوجی نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”مقتولہ کے کھرے کی شناخت کے لیے میں نے اس کی چپل اور دوسرے جوتوں سے مدد لی تھی۔“

”ٹھیک ہو گیا......!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا ان تین افراد کا کھرا گھر کے صحن میں بھی موجود ہے؟“

رسول بخش نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”تمہیں اس بات کا یقین ہے نا کہ مکان کی چھت پر ان تین افراد کے سوا کسی چوتھے انسان کے قدموں کے نشانات موجود نہیں ہیں؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

”مدھم اور غیر واضح نشانات تو کہیں کہیں دیکھے گئے ہیں مگر میرے تجربے کے مطابق وہ ہفتہ دس دن پہلے کا کھرا ہے۔“ اس نے پُروثوق انداز میں بتایا۔ ”تازہ نشانات گھر کے مکینوں کے قدموں ہی کے ہیں۔“

کھوجی رسول بخش کے بیان کی روشنی میں، اس بات کا امکان دم توڑ گیا تھا کہ زاہدہ پروین کا قاتل چھت پر سے ہوتے ہوئے مکان کے اندر اترا تھا۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”گھر کے وسنیکوں کے علاوہ کیا صحن میں کچھ ایسے افراد کا کھرا بھی ملا ہے جن کے قدموں کے نشانات مکان کے قرب وجوار میں بھی پائے گئے ہوں؟“

”[illegible]“ [illegible] چار سے چھ افراد ایسے بھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، زاہدہ کے قتل کی خبر سن کر گاؤں والوں نے ادھر کا رخ کیا ہوگا۔ یہ انھی کے پاؤں کا کھرا ہو سکتا ہے۔“

”ہاں، یہ ممکن ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کھوجی سے کہا پھر اپنے آپ [illegible] خاموشی بھی اطلاع دی۔ ”اور ابھی نشانات میں قاتل کے پاؤں کا کھرا بھی موجود ہوگا۔“

”میرے لائق کوئی اور خدمت......؟“ کھوجی نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا پھر فوراً ہی وضاحت بھی کر دی۔ ”میرا مطلب ہے، آج کی تاریخ میں......!

”چاچا! لگتا ہے، تمہیں گھر جانے کی بہت جلدی پڑی ہوئی ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”بہت تھک گیا ہوں سرکار!“ اس نے مضمحل انداز میں جواب دیا۔ ”گھر جا کر آرام کروں گا۔“

”تمہاری ریٹائرمنٹ کی عمر ہو گئی ہے رسول بخش......!“ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”میرے ایک سوال کا جواب دے دو، پھر چلے جانا۔“

”حکم کریں تھانے دار صاحب!“ وہ کراری آواز میں بولا۔ ”میں ابھی تک آپ ہی کے سوالوں کے جواب تو دے رہا ہوں۔“

”جس کمرے میں زاہدہ پروین کو موت کے گھاٹ اتارا گیا......!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ ”وہاں پر تمہیں گھر کے مکینوں کے علاوہ کسی اور انسان کا کھرا بھی ملا یا نہیں؟“

”نہیں!“ اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ”اس کمرے میں مقتولہ اور اس کے خاوند کے قدموں کے نشانات بہت واضح ہیں اور اکا دکا مقام پر غفوراں بی بی کا مدھم سا کھرا بھی موجود ہے مگر اس کے علاوہ کچھ نہیں اور میں......!“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ”اور میں کے بعد کیا چاچا؟“

”اور میں اس بات پر حیران بھی ہوں کہ جائے وقوعہ پر قاتل کے قدموں کے نشانات موجود کیوں نہیں ہیں۔“ اس نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”زاہدہ پروین کو کسی گولی یا تیر سے ہلاک نہیں کیا گیا جو یہ سوچ لیا جائے کہ قاتل کو مقتولہ کے کمرے میں داخل ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی ہوگی۔ تیز دھار چھری کی مدد سے، گردن کاٹ کر اس عورت کو فنا کے گھاٹ [illegible] انجام دینے کے لیے قاتل کا مقتولہ کے انتہائی نزدیک آنا ایک لازمی امر ہے۔ کیا کہتے ہیں ملک صاحب......؟“

بات کے اختتام پر رسول بخش نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم نے ایک اہم نکتہ اٹھایا ہے چاچا! میں اس پر ضرور غور کروں گا۔“

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر سرکاری کوارٹر کی سمت بڑھ گیا۔

اس رات جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو کھوجی رسول بخش کے سنسنی خیز الفاظ میرے دماغ میں گونج

رہے تھے۔ میں نے کھوجی کے سامنے خود کو بے چین یا مضطرب ظاہر نہیں کیا تھا مگر ماننا پڑے گا کہ رسول بخش کی بات میں وزن تھا۔ جائے وقوعہ پر قاتل کے قدموں کے نشانات کا پایا جانا عین فطری تقاضا تھا لیکن کھوجی نے اس اہم کھرے ہی کی نفی کر دی تھی۔

میں اس رخ پر جتنا زیادہ سوچ رہا تھا، میری ذہنی الجھن اتنی ہی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ قاتل نے جوتوں کے بجائے اپنے پاؤں پر پلاسٹک کی تھیلیاں چڑھا رکھی ہوں۔ بعض ہوشیار ڈنگر چور عموماً یہ ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ وہ مسروقہ مویشیوں اور اپنے پاؤں پر موٹی تھیلیاں چڑھا لیتے ہیں تاکہ کوئی کھوجی چوری کے جانوروں کا کھرا نہ نکال سکے۔

اسی ذہنی کشمکش کے دوران میں میرے دماغ میں ایک خطرناک سوال نے سر اٹھایا۔ ”اگر قاتل باہر سے نہیں آیا تو کیا گھر کے مکینوں پر شک کیا جا سکتا ہے؟“

اس گھر میں تین افراد رہتے تھے جن میں سے ایک یعنی زاہدہ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ باقی بچے دو انسان...... ایک مقتولہ کا شوہر جاوید بھٹی اور دوسری اس کی ماں غفوراں بی بی۔ جاوید کے بیان کے مطابق، رات کے آخری پہر وہ رفع حاجت کے لیے کھیتوں کی طرف گیا تھا جہاں سے لگ بھگ آدھے گھنٹے کے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اسے اپنی بیوی کی موت کے بارے میں اگلی صبح پتا چلا تھا اور جہاں تک غفوراں بی بی کی عمر اور صحت کے معاملات تھے، ان کی روشنی میں اس سے ایسی ظالمانہ کارروائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

میں نے اپنے دماغ کو قاتل کی کسی شاطرانہ چال کے حوالے سے سوچنے پر مائل کیا اور خود کو گہری نیند کے سپرد کر دیا۔

☆☆☆

تیرہ مارچ کی صبح کا آغاز ہلکی پھلکی بوندا باندی سے ہوا۔

[illegible]

...میں نے جلدی سے ناشتا کیا اور یونیفارم پہن کر تھانے آ گیا۔ میں نے رات میں امیر خان کو اپنے آج کے پروگرام کے بارے میں بتا دیا تھا لہٰذا میری آمد سے پہلے اس نے میرے لیے ایک تانگے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ میری منزل ”تار گھر“ یعنی ٹیلی گراف آفس تھی۔

آج کل تو بچے بچے کے ہاتھ میں اسمارٹ سیل فونز ہیں اور انٹرنیٹ کی برکت سے دنیا کی ہر شے انسان کی ایک ”کلک“ کے فاصلے پر ہے مگر یہ واقعہ کم و بیش چھیاسٹھ سال پہلے کا ہے جب پیغامات کی ترسیل اور رابطے کا ذریعہ ہر کسی کی رسائی میں نہیں تھا۔ گاؤں کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا، اس وقت شہروں میں بھی ٹیلی فون کی سہولت خال خال ہی دکھائی دیتی تھی۔ جس گھر کے اندر فون موجود ہوتا، اس کے مکینوں کو خاندانی رئیس سمجھا جاتا تھا۔

ہلکی پھلکی ”ٹپ ٹپ“ سے شروع ہونے والا سلسلہ اب باقاعدہ بارش کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں طبعاً فطری مناظر اور مظاہر کو بہت انجوائے کرتا ہوں اور موسم برسات تو مجھے دل سے پسند ہے اگرچہ اس کی آمد میں ابھی چار ماہ باقی تھے۔ آج والی بارش بے موسمی تھی اور میرا ذہن یہ سوچ کر بھی پریشان تھا کہ کھوجی کا کام ادھورا ہی رہ جائے گا۔ اس بارش نے ہر خاص و عام کے کھرے کو پیوند گرد...... در یا برد کر دیا تھا۔

”تار گھر“ پہنچ کر میں نے وہاں کے انچارج صاحب سے بات کی۔ وہ مجھے پولیس کی وردی میں دیکھ کر ایٹن شین ہو گیا۔ اس نے بڑے احترام کے ساتھ مجھے کرسی پیش کی اور مؤدب لہجے میں پوچھا۔

”سر! حکم کریں...... میں آپ کی کیا خدمت کروں؟“

”میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں وزیر آباد کے ایک تھانے کا انچارج ہوں۔“ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ ”قتل کے ایک کیس کے حوالے سے مجھے آپ کے محکمے کی مدد درکار ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھ سے بھرپور تعاون کریں گے......!“

”کیوں نہیں...... ضرور!“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھے مکمل کر بتائیں کہ معاملہ کیا ہے۔ میں ہر ممکن آپ کی مدد کروں گا ملک صاحب......!“

میں نے جاوید بھٹی والا ٹیلی گرام اپنی جیب سے نکال کر اس کی میز پر رکھ دیا اور کہا۔ ”اس تار میں، بھیجنے

[illegible]

...والے کا نام زاہدہ پروین لکھا ہوا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا زاہدہ پروین خود یہ تار بک کرانے کے لیے یہاں آئی تھی......؟“

”اس ٹیلی گرام پر بکنگ کی تاریخ چھ مارچ درج ہے۔“ وہ کاغذ کے اس پرزے کو دیکھنے کے بعد بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں، میں بکنگ کلرک کو یہاں بلا لیتا ہوں۔ آپ خود اس سے سوال جواب کر لیجیے گا۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"بتائیں، آپ کی خاطر تواضع کے لیے کیا منگواؤں؟"

"کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میں خاصا تگڑا ناشتا کر کے تھانے سے نکلا تھا۔"

"ملک صاحب! اب تو دوپہر ہو چکی ہے۔ صبح کا ناشتا تگڑا تھا یا کچھ، وہ پیٹ میں کہیں موجود نہیں ہوگا۔" تار گھر کے انچارج امتیاز احمد نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔ "زیادہ نہیں، میں گرما گرم پکوڑے اور دودھ پتی منگوالیتا ہوں۔"

برساتی موسم کے پیش نظر میں نے امتیاز احمد کی پُرخلوص دعوت کو قبول کرلیا۔ اس نے چپراسی کو اپنے کمرے میں بلا کر چائے اور پکوڑے کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔ "محمد بشیر کو میرے پاس بھیج دو......!"

محمد بشیر وہی کلرک تھا جس نے جاوید بھٹی کو زاہدہ پروین کی جانب سے مذکورہ ٹیلی گرام بھیجا تھا۔ دو منٹ کے بعد محمد بشیر، انچارج کے کمرے میں موجود تھا۔ وہاں ایک باوردی پولیس آفیسر کو دیکھ کر اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ کبھی مجھے اور کبھی امتیاز احمد کو فکرمندی سے دیکھنے لگا۔

"بشیر! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......!" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ میں تمہاری پیشہ ورانہ ذمے داری کے حوالے سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ بس...... اتنی سی بات ہے۔"

اس کی جان میں جان آئی اور وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ کر میری جانب متوجہ ہوگیا۔

میں نے جاوید والا ٹیلی گرام اسے تھمانے کے بعد اپنی آمد کی غرض وغایت بیان کر دی۔ اس نے تار کو دیکھا اور چونک اٹھا۔ اس دوران میں، میں مسلسل اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں [illegible] شناسائی کی چمک نمودار ہوئی تو میں نے استفسار کیا۔

"کیا ہوا محمد بشیر......؟"

"یہ بندہ ایک ہفتہ پہلے یہاں آیا تھا......" اس نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔ "یہ ٹیلی گرام میں نے ہی انگلینڈ کے ایک ایڈریس پر بھیجا تھا۔"

"کیا اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی تھانے دار صاحب......!" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے بڑی تفصیل سے مقتولہ زاہدہ پروین کا معائنہ کیا تھا لہٰذا اس کی شکل وصورت، جسامت اور قد کاٹھ میرے حافظے میں محفوظ تھے۔ میں نے سوال کیا۔

"بشیر! وہ عورت دیکھنے میں کیسی لگتی تھی؟"

"میں اس عورت کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا......!" اس نے بتایا۔ "کیونکہ وہ ٹوپی والا، بڑے گھیر کا مخمل کا کالا برقع پہنے ہوئے تھی۔"

"اوہ اچھا......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "مرد کا حلیہ اور وضع قطع تو تمہیں یاد ہوگی؟"

"جی...... آہو!" اس نے سر کو اثباتی جنبش دینے کے بعد بتایا۔ "وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کی رنگت گندمی اور سر کے بال گھنگرالے تھے۔ سب سے خاص بات یہ کہ اس کی دائیں آنکھ کے نیچے کٹ کا ایک پرانا نشان تھا۔"

"اس لم ڈھینگ نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟"

"مقصود......!" بشیر نے جواب دیا۔ "اس نے مجھے بتایا کہ برقع پوش عورت اس کی بہن زاہدہ پروین ہے۔ وہ ٹیلی گرام اسی عورت کی طرف سے جائے گا۔ زاہدہ کی ساس یعنی انگلینڈ میں رہنے والے جاوید بھٹی کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ ہنگامی ٹیلی گرام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

"اگر مقصود دوبارہ تمہارے سامنے آجائے تو کیا تم اسے پہچان لوگے؟" میں نے محمد بشیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے مثبت جواب دیا۔ "جی ہاں...... بالکل پہچان لوں گا۔"

"محمد بشیر! تمہیں میرے ساتھ ہیڈ کوارٹر جانا ہوگا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔

"کیوں......!" وہ بکھری ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں لے کر جانا چاہتے ہیں؟"

"بشیر! [illegible] ہونے کی ضرورت نہیں......!" میں نے تسلی بخش انداز میں کہا۔ "میں پولیس ہیڈ کوارٹر میں موجود سرکاری آرٹسٹ سے مقصود کا خاکہ بنوانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں تم سے زیادہ مددگار اور کوئی بندہ ہو نہیں سکتا۔"

اس کے بعد میں نے بشیر کو گزشتہ روز قلعہ خدا بخش میں پیش آنے والے اندوہ ناک واقعے کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔

"بشیر! کل اتوار ہے اور ہفتہ وار چھٹی کا دن

بھی......!" اس کے انچارج امتیاز احمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم ملک صاحب کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہاں کے معاملات میں اچھے سے سنبھال لوں گا۔ جب تم فارغ ہو جاؤ تو ہیڈ کوارٹر سے سیدھا اپنے گھر چلے جانا۔"

امتیاز احمد کی بات محمد بشیر کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے انچارج صاحب کا شکریہ ادا کیا اور "تار گھر" سے باہر نکل آیا۔ اس شکریہ کے اندر انچارج کے بے لوث تعاون اور گرما گرم پکوڑوں اور دودھ پتی کے معاملات بھی شامل تھے۔

پولیس ہیڈ کوارٹر، ٹیلی گراف آفس کے قریب ہی واقع تھا۔ آئندہ ایک گھنٹے میں بشیر کی راہنمائی میں، میں نے سرکاری آرٹسٹ سے مقصود کا اسکیچ تیار کرالیا اور بشیر سے پوچھا۔

"کیا تم اس خاکے سے مطمئن ہو؟"

"جی، پوری طرح مطمئن ہوں......!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "آپ کے آرٹسٹ نے تو کمال کر دیا ہے تھانے دار صاحب! یہ ہو بہو مقصود ہی کا خاکہ ہے......!"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "اب تم میری طرف سے فارغ ہو۔ جب میں مقصود کو ڈھونڈ لوں گا تو اس کی شناخت کے لیے تمہیں ضرور بلاؤں گا۔"

وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی۔ بشیر کے جانے کے بعد میں نے ایک فوٹوگرافر کا رخ کیا اور مقصود والے اسکیچ کے آٹھ دس پرنٹس بنوا لیے۔ اب میں مقصود کی تلاش کے حوالے سے ضروری "لوازمات" سے لیس ہو چکا تھا۔

شہر سے اپنے تھانے کی طرف آتے ہوئے میں مستقل مقصود کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ مقصود نام کے اس قد آور بندے کے ساتھ قتل کا کوئی بھی تعلق ہے اور کسی بھی قیمت پر زاہدہ پروین نہیں تھی۔ زاہدہ نے اپنے کسی ٹیلی گرام سے صاف انکار کر دیا تھا اور جاوید بھٹی کے بیان کے مطابق، اس کا کوئی سالا نہیں تھا۔ اس سے یہ تو صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ مقصود نے نصوراں بی بی کی فرضی موت کی آڑ میں جاوید بھٹی کو انگلینڈ سے پاکستان آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب یہاں سوال یہ اٹھتا تھا کہ مقصود نے یہ گہری سازش کس مقصد کے حصول کی خاطر کی تھی......؟

دیانت

ٹرین کے رکتے ہی ایک موٹا مسافر اترا اور ایک لڑکے کو پانچ روپے کا نوٹ تھما کر بولا۔

"میرے لیے ڈھائی روپے کا ایک بن کباب لے آؤ۔ ایک بن کباب تم اپنے لیے لے لینا۔"

لڑکا نوٹ لے کر بھیڑ میں گم ہو گیا۔ دس منٹ گزر گئے۔ گارڈ نے ٹرین کی روانگی کی وسل بجائی، اسی لمحے لڑکا ہانپتا کانپتا آ پہنچا اور موٹے مسافر کو ڈھائی روپے واپس کرتے ہوئے بولا۔

"اپنے باقی پیسے رکھ لیں جناب! اسٹال والے کے پاس ایک ہی بن کباب بچا تھا اور وہ میں نے لے کر کھا لیا ہے۔"

بیوی

مجاز، فراق کے گھر گئے اور گھنٹی بجائی تو ایک کالی کلوٹی سی عورت نے دروازہ کھولا اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلی گئی۔ فراق کی آمد پر مجاز نے سوال کیا۔ "یار! یہ تمہاری بیوی تھی یا نوکرانی؟"

"بیوی۔" فراق نے تنک کر کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، میں ایسی بدشکل نوکرانی رکھ سکتا ہوں۔"

(مرسلہ: عمار علی، ملتان)

میں اس کیس کے مختلف زاویوں پر غور و فکر کرتے ہوئے سہ پہر کے بعد اپنے تھانے پہنچ گیا۔

☆☆☆

مغرب سے پہلے، اسپتال سے زاہدہ پروین کی لاش آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی تھی اور اس رپورٹ نے میرے دماغ میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق زاہدہ پروین کو رات کے آخری پہر دو اور چار بجے کے درمیان موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مجھے اس کمرے میں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، جو چھری ملی تھی، آلۂ قتل کے حوالے سے اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اس چھری پر زاہدہ ہی کا خون لگا ہوا تھا۔ رپورٹ کی سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ موت کے وقت زاہدہ ڈیڑھ سے دو ماہ کی حاملہ تھی......!

جاوید بھٹی چار ماہ پہلے ماہ دسمبر میں گاؤں آیا تھا اور

مرے کی بات یہ کہ لیبارٹری ٹیسٹ کے مطابق، وہ باپ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے خود مجھے اپنے اس عیب کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ اگر جاوید کے بیان کو غلط بھی سمجھ لیا جائے تو اس صورت میں مقتولہ کا ڈیڑھ سے دو ماہ کا حاملہ ہونا کسی خانے میں فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔ اسپتال کی میڈیکل رپورٹ غلط نہیں ہوسکتی تھی۔ میرے ذہن میں ایک خطرناک سوال نے سر اٹھایا تھا۔

''کیا جاوید نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی؟''

یہ سوال اپنے اندر بہت سی حیرتیں اور الجھنیں سمیٹے ہوئے تھا۔ میں نے تین چار بار اس رپورٹ کو گہری توجہ سے پڑھا مگر ہر مرتبہ نتیجہ ایک جیسا ہی رہا۔

میں نے قلعہ خدا بخش کی طرف ایک بندے کو روانہ کیا اور جاوید بھٹی کو تھانے بلا لیا۔ میں نے زاہدہ پروین کی لاش کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''جاوید! تم اپنی بیوی کی تدفین کے بعد کل کسی وقت میرے پاس آنا۔ میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے اس کے سامنے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی اسے مقصود کے اسکیچ کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اداس لہجے میں مستفسر ہوا۔

''تھانے دار صاحب! کیا آپ نے زاہدہ کے قاتل کا پتا لگا لیا ہے؟''

میں نے گول مول جواب دیا۔ ''میں قاتل کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔''

''آپ اس شیطان کو چھوڑنا نہیں تھانے دار صاحب......!'' وہ خاصا جذباتی ہوگیا۔ ''میں اس شخص کو عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں جس نے میری زاہدہ کی جان لی ہے۔''

''جاوید! تم فکر نہ کرو......!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں زاہدہ کے قاتل کو کسی بھی قیمت پر بخشوں گا نہیں۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنی بیوی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش کے ساتھ تھانے سے رخصت ہوگیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں، مقتولہ کے حوالے سے جو چونکا دینے والا انکشاف کیا گیا تھا، میں نے دانستہ جاوید سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں اس موضوع پر تسلی سے بات کرنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے آئندہ روز اسے تھانے آکر ملنے کو کہا تھا۔

جاوید کے جانے کے بعد میں نے حوالدار امیر خان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جب وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گیا تو میں نے اسے اپنی دن بھر کی کارگزاری سے آگاہ کیا پھر مقصود کے اسکیچ کی چار پانچ کاپیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''یہ بندہ مجھے اپنے تھانے کی حوالات میں چاہیے امیر خان......!''

حوالدار نے اس اسکیچ کو بہ غور دیکھنے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! یہ کون ہے؟''

''یہ وہی شخص ہے جس نے جاوید بھٹی کو، اس کی ماں کے انتقال کا تار بھیج کر یہاں بلایا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ خود کو جاوید کا سالا اور مقتولہ زاہدہ کا بھائی کہتا ہے۔''

''اوہ......تو یہ بات ہے۔'' امیر خان نے ناسفانہ انداز میں کہا۔ ''اگر یہ بندہ ہمارے ہتھے چڑھ گیا تو زاہدہ کے قاتل تک رسائی آسان ہوجائے گی کیونکہ ہمارے ریکارڈ کے مطابق، مقتولہ کا کوئی بھائی نہیں ہے۔''

''یہی نکتہ میرے ذہن میں بھی ہے امیر خان!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس شخص کا مبینہ نام مقصود ہے جو کہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے جھوٹ کا سہارا لے کر ایک ٹیلی گرام کے ذریعے جاوید کو یہاں بلایا ہے تو اس گھناؤنی سازش کے پیچھے یقیناً اس کا کوئی مقصد چھپا ہوا ہے۔ اگر ہم اس مقصد تک پہنچ جائیں تو زاہدہ کا قاتل خود بہ خود ہمارے قابو میں آجائے گا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' حوالدار تائیدی انداز میں بولا۔ ''غفوراں، جاوید اور زاہدہ کا تعلق قلعہ خدا بخش سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقصود بھی اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ میں صبح ہی اس کی تلاش کا کام شروع کراتا ہوں۔''

''قلعہ خدا بخش کی آبادی نو سو سے ایک ہزار افراد کے درمیان ہے......!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''وہاں مقصود کو ڈھونڈنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ اس کے چہرے پر زخم کے نشان کی وجہ سے وہ جلد ہی پکڑ میں آجائے گا۔''

''آپ نے جاوید کو کل تھانے بلایا ہے۔'' حوالدار نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس سے بھی مقصود کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے کا ارادہ ہے ملک صاحب؟''

''ہاں، ایک مقصد یہ بھی ہے۔'' میں نے رسان بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر مقصود قلعہ خدا بخش ہی کا رہنے والا ہے تو جاوید ضرور اسے جانتا ہوگا۔ اس کے

urdunovels.com

''لمحاتی توقف ...۔'' میں نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پر بھی جاوید بھٹی سے چند اہم باتیں کرنا ہیں۔ اس نے مجھے جو بیان دیا ہے، یہ رپورٹ اس سے لگا نہیں کھاتی۔ چونکہ رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی اس لیے یا تو جاوید نے مجھ سے غلط بیانی کی ہے اور یا پھر یہ معاملہ مقتولہ کے کردار پر انگلی اٹھاتا نظر آتا ہے۔''

حوالدار نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ کا اشارہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے کس حصے کی جانب ہے؟''

میں نے امیر خان کو جاوید کے ''ناکارہ'' ہونے سے لے کر زاہدہ کے حاملہ ہونے تک کی کہانی سنا دی۔ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔

☆☆☆

اتوار چودہ مارچ کی دوپہر جاوید بھٹی مجھ سے ملنے تھانے آ گیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اس وقت ہم دونوں کے سوا کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں اس حساس موضوع پر جاوید سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اس حوالے سے میں نے اپنے تھانے کے عملے کو خاص طور پر ہدایت کر دی تھی کہ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے معتدل انداز میں اس سے پوچھا۔ ''جاوید! تمہاری رات کیسی گزری؟''

میرے اس سوال کے کئی پہلو تھے۔ اس نے جواب دیا۔ ''تھانے دار صاحب! میں نے پوری رات جاگتے ہوئے گزار دی۔ میں آنکھ بند کرتا تھا تو تصور میں زاہدہ کا چہرہ روشن ہو جاتا تھا۔ وہ مجھ سے سوال کرتی تھی کہ اس کا قاتل ابھی تک آزاد کیوں گھوم رہا ہے اور...... میں ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتا تھا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر دل گرفتہ لہجے میں بات مکمل کر دی۔

''تھانے دار صاحب! زاہدہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے جوزفین سے دوسری شادی اولاد کے حصول کے لیے کی تھی۔ اس وقت تک مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ خرابی میرے اندر ہے۔ اگر میں دس بار بھی شادی کر لوں تو کوئی عورت میرے بچوں کی ماں نہیں بن سکتی کیونکہ میں ایک سوکھا ہوا بے پھل پیڑ ہوں۔''

بات کے اختتام پر وہ خاصا جذباتی ہو گیا تھا اور اس کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جاوید! کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں تھانے کیوں بلایا ہے؟''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شاید آپ مجھے زاہدہ کے قاتل کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے ہیں۔''

''زاہدہ منوں مٹی اوڑھ کر سو چکی ہے جاوید!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سپاٹ آواز میں کہا۔ ''ہم اس کے بارے میں مہینوں اور سالوں بھی بات کرتے رہیں، اس سے وہ زندہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں البتہ، اس کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچایا جا سکتا ہے۔''

''تھانے دار صاحب! میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔'' وہ زور دے کر بولا۔ ''زاہدہ واپس نہیں آ سکتی مگر اس کے قاتل کو بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اسے اس کے کیے کی سزا ضرور ملنا چاہیے۔''

''اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ تمہارے تعاون کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔''

''میں آپ سے تعاون کر تو رہا ہوں تھانے دار صاحب......!'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''کیا آپ کو میرے خلوص پر کوئی شک ہے؟''

''بات شک یا اعتماد کرنے کی نہیں ہے جاوید......!'' میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''اگر اس کیس کو حل کرنا ہے تو مجھے تم سے اور زیادہ تعاون چاہیے ہوگا۔''

''بتائیں، میں کیا کروں؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھ سے اور کیا چاہتے ہیں تھانے دار صاحب......؟''

''تمہارے اس سوال کا جواب دینے کے لیے مجھے تمہاری ذات کے حوالے سے بات کرنا ہوگی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے مردانہ جوہر کی رپورٹ خاصی مخدوش ہے۔ انگلینڈ کے ڈاکٹروں نے تمہیں بتایا ہے کہ تم کبھی باپ نہیں بن سکتے۔''

''ہاں، میں نے ایسا کہا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور حقیقت بھی یہی ہے۔''

''کیا تم انگلش پڑھنا جانتے ہو......!'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، کیا تم نے اپنی میڈیکل رپورٹ خود پڑھی تھی؟''

''میں پچھلے پانچ سال سے یو کے میں مقیم ہوں تھانے دار صاحب!'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''میں انگلش پڑھنا، لکھنا، بولنا اور سمجھنا اچھے سے جانتا ہوں۔ میں نے وہ رپورٹ دیکھی تھی جس کے مطابق میرے

صحت مند متحرک جرثومے چالیس فیصد سے بہت نیچے تھے یعنی میں کبھی باپ نہیں بن سکتا......!"

"جاوید! ایک میڈیکل رپورٹ میرے پاس بھی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ تم باپ بننے والے تھے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "لیکن اس منحوس گھڑی سے پہلے ہی سب کچھ برباد ہوگیا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب......!" وہ الجھن بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "آپ کس رپورٹ کا ذکر کررہے ہیں؟"

"تو خود دیکھ لو......!" میں نے اپنی میز کی دراز میں سے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بھی معنی خیز انداز میں کہا۔ "تم انگلش پڑھنا اور سمجھنا جانتے ہو......!"

جاوید بھٹی نے مذکورہ رپورٹ پر نگاہ ڈالی تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "یہ نہیں ہوسکتا......!"

"کیا نہیں ہوسکتا؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"اس رپورٹ کے مطابق، زاہدہ ڈیڑھ سے دو ماہ کے حمل سے تھی۔" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اول تو میں باپ بننے کے قابل ہی نہیں ہوں اور دوسرے میں تو چار ماہ پہلے پاکستان آیا تھا۔ اس کا مطلب تو...... یہ ہوا کہ...... زاہدہ مجھ سے...... بےوفائی کررہی تھی......!"

"اس دنیا سے رخصت ہوجانے والوں کے کردار پر کیچڑ اچھالنا ٹھیک نہیں ہے جاوید بھٹی!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "زاہدہ اچھی تھی یا بری، اس پر بات کرنا بے معنی ہے۔ ہمیں زاہدہ کے قاتل پر توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔ سمجھ رہے ہونا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"جی تھانے دار صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"اگر تم واقعی مجھ سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہو تو پھر یہ کام بہت آسان ہوجائے گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ "کیا تم مقصود نامی کسی بندے کو جانتے ہو؟"

"مقصود......!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "یہ کون ہے جناب؟"

"مقصود کا دعویٰ ہے کہ وہ مقتولہ زاہدہ پروین کا بڑا بھائی ہے۔" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اس کا دعویٰ ایک دم غلط ہے تھانے دار صاحب......!" جاوید نے زور دے کر کہا۔ "زاہدہ کا کوئی بھائی تھا ہی نہیں۔"

میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "پھر وہ جھوٹ بول رہا ہوگا۔"

"یہ مقصود آپ کو ملا کہاں تھا تھانے دار صاحب؟" وہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"تمہارے گھر میں......!" میں نے سادہ انداز میں جواب دیا۔

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں جناب......؟"

"تم نے مجھے جو ٹیلی گرام دیا تھا، میں اسی کی انکوائری کے لیے کل تمہارے گھر گیا تھا۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ "بس، وہیں پر مقصود سے میری ملاقات ہوگئی تھی......"

"میں تو کسی مقصود کو نہیں جانتا۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "پتا نہیں، اس بندے نے آپ سے ایسی باتیں کیوں کی ہیں۔"

میں نے گزشتہ روز پولیس ہیڈکوارٹر میں محمد بشیر کی مدد سے مقصود کا جو اسکیچ بنوایا تھا، اس کی ایک کاپی جاوید بھٹی کے سامنے رکھتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔ "یہ دیکھو...... مقصود نے مجھے اپنی تصویر بھی دی ہے۔"

"یہ تو قدیر ہے......!" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"کون قدیر؟" میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

"یہ ہمارے گاؤں کا ایک وسنیک ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھانے دار صاحب!"

"لیکن میں اس بندے کے حوالے سے بہت کچھ جانتا ہوں جاوید بھٹی!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ک...... کیا......؟" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

"یہ تمہارا کھلا دشمن ہے حالانکہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری کسی سے دشمنی نہیں ہے۔"

"اس نے...... میرا مطلب ہے، قدیر نے مجھ سے کوئی دشمنی کی ہے تھانے دار صاحب؟" اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"قدیر تو اسے تم کہہ رہے ہونا......!" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "میرے لیے یہ مقصود ہے۔"

"آپ کی بات رکھ لیتے ہیں کہ یہ بندہ مقصود ہی ہے۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ "اب

کس حوالے سے میرا دشمن ہے؟"

بتایا۔ "چھ مارچ بدھ کے دن، مقصود نامی یہ بندہ ایک برقع پوش عورت کے ساتھ ٹیلی گراف آفس پہنچا تھا......!" میں نے جاوید بھٹی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وضاحتی انداز میں بتایا۔ "اس نے مذکورہ برقع پوش عورت کو اپنی چھوٹی بہن زاہدہ پروین بتایا اور تمہارے نام ایک تار بھجوا دیا جس میں تمہاری والدہ کے انتقال کی اطلاع دی گئی تھی۔ اسی بنا پر میں نے اسے تمہارا دشمن کہا ہے۔"

"مگر قدیر ایسی گھٹیا حرکت کیوں کرے گا۔ وہ تو!"

"قدیر نہیں، مقصود!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"وہ قدیر ہے یا مقصود......!" جاوید نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ وہ مجھ سے دشمنی کیوں کرے گا......!"

"آج شام تک اس دشمنی کی وجہ بھی سامنے آجائے گی جاوید بھٹی!" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ "میں زاہدہ کے قاتل کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔ کل میں تمہیں کوئی خوش خبری سنانے والا ہوں۔"

اس کے چہرے اور آنکھوں میں ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے جنہیں میں واضح معنی نہ دے سکا۔ وہ چند لمحات تک خالی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے تھانے دار صاحب؟"

"میں جو کہوں گا، وہ کرو گے......؟"

"ہاں، کروں گا!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

"تم اپنے گاؤں کا رخ کرنے کے بجائے شہر چلے جاؤ......!"

"میں سمجھا نہیں جناب!" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے شہر جانے کو کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"میں تمہیں ایک لفافہ دوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم یہ لفافہ شہر میں ایک بندے تک پہنچانا ہے۔ یہ کوئی [illegible] مشکل کام نہیں ہے۔ [illegible] کے لیے تم واپس لوٹ آؤ گے......!"

"ٹھیک ہے جناب......!" وہ اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ڈیوٹی کرنے والے ایک بندے کے نام ایک رقعہ لکھ کر اسے لفافے میں بند کیا اور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔

"اب تم روانہ ہو جاؤ......!"

اس نے مجھے سلام کیا اور چپ چاپ رخصت ہو گیا۔

دراصل، وہ رقعہ ایک بہانہ تھا، جاوید کو چار پانچ گھنٹے گاؤں سے دور رکھنے کا۔ حوالدار امیر خان نے اپنی مہم کا آغاز قلعہ خدا بخش سے کیا تھا۔ وہ مقصود نامی ایک شخص کی تلاش میں وہاں گیا تھا۔ جاوید نے اسکیچ دیکھ کر مقصود کو قدیر کے نام سے شناخت کر لیا تھا۔ وہ شرپسند انسان قدیر تھا یا مقصود، ایک بات تو طے تھی کہ امیر خان کسی بھی وقت اسے گرفتار کر کے یہاں لانے والا تھا اور میں چاہتا تھا یہ ساری کارروائی جاوید کی غیر موجودگی میں ہو۔ زاہدہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد اس کیس میں ایک ڈرامائی موڑ آ گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں کامیابی کے انتہائی قریب پہنچ چکا ہوں۔

میری توقع کے عین مطابق، جاوید بھٹی کے جانے کے ایک گھنٹے بعد حوالدار امیر خان تھانے میں موجود تھا اور وہ قلعہ خدا بخش سے خالی ہاتھ نہیں لوٹا تھا۔

☆☆☆

شام دھیرے دھیرے رات میں بدل رہی تھی۔

محمد بشیر نے بڑی محنت اور خلوص کے ساتھ سرکاری آرٹسٹ کی مدد کی جس کے نتیجے میں آرٹسٹ نے ایک ایسا اسکیچ تیار کیا تھا جسے دیکھتے ہی جاوید نے اسے قدیر کی حیثیت سے شناخت کر لیا تھا۔ حوالدار کو بھی اپنے مشن میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس اسکیچ میں موجود شخص کو قلعہ خدا بخش کے دیہاتی "قدیر" کے نام سے جانتے تھے اسی لیے اسکیچ پر نگاہ پڑتے ہی جاوید بھٹی کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ "یہ تو قدیر ہے......!"

وہی قدیر اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ جب کوئی مجرم پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو اس کی زبان کھلوانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ قدیر کوئی عادی مجرم نہیں تھا لہٰذا وہ حوالدار کے تفتیشی حربوں کو چند منٹ سے زیادہ نہ جھیل سکا اور اس نے سب کچھ بتانے کا اعلان کر دیا۔

اس وقت قدیر سر جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔

[illegible] لہجے میں استفسار کیا۔ "جاوید نے تمہارا کیا [illegible] [illegible] بگاڑا تھا...... تم نے اس سے [illegible] کیا...... اس سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"دشمنی نہیں تھانے دار صاحب......!" اس نے ندامت آمیز لہجے کے بجائے بڑے فخر سے جواب دیا۔ [illegible] "میں جاوید کا سچا دوست ہوں۔ میں نے وہ سب جاوید کی دوستی میں، اسی کے کہنے پر کیا تھا......!"

urdunovels.com

"کیا تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ جاوید نے تمہیں منوراں کے انتقال کا ٹیلی گرام بھیجنے کو کہا تھا؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"نہیں......!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس نے مجھے منوراں کی بیماری کی اطلاع دینے کے لیے کہا تھا مگر میں نے اسے منوراں کی موت میں بدل دیا تا کہ جوزفین اسے پاکستان آنے سے روک نہ سکے۔"

"اوہ، تو یہ بات ہے......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "تو تم جانتے ہو کہ جاوید نے انگلینڈ میں کسی میم سے دوسری شادی کر رکھی ہے؟"

"جی ہاں......!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "جاوید میرا دوست ہے۔ وہ مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپاتا۔"

"جاوید چار ماہ پہلے ہی یہاں سے ہو کر گیا تھا......!" میں نے کہا۔ "اسے ہنگامی بنیادوں پر دوبارہ آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟"

قدیر نے فوری طور پر میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور متذبذب نظر سے کبھی مجھے اور کبھی حوالدار کو دیکھنے لگا۔ میں نے تحکمانہ انداز میں حوالدار سے کہا۔

"امیر خان! لگتا ہے، تم نے سرکاری مہمان کی ٹھیک طرح خاطرداری نہیں کی۔ اسے یہاں سے لے جاؤ اور خوب اچھی طرح کھلا پلا کر واپس لاؤ......!"

قبل اس کے کہ حوالدار اس پر جھپٹتا، وہ جلدی سے بولا۔ "میں بتاتا ہوں تھانے دار صاحب......!"

آئندہ پندرہ منٹ میں قدیر نے مجھے جو کہانی سنائی، اس کے خلاصے سے پوسٹ مارٹم رپورٹ کی تصدیق ہو جاتی تھی۔ لگ بھگ ایک سال پہلے زاہدہ نے گاؤں کے ایک وسیک بے تکل ملاپ شروع کر دیا تھا۔ اس نوجوان کا نام وہاب علی تھا۔ جاوید کو وہاب علی پر شک تو تھا مگر اس کے پاس زاہدہ کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ اس نے اپنے دوست قدیر کو زاہدہ اور وہاب کی نگرانی کرنے کے لیے کہا۔ تھوڑے ہی عرصے میں قدیر کو اس مشن میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو گئی۔ [illegible]

[illegible] ذریعے جاوید کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ جاوید نے قدیر سے کہا کہ وہ منوراں کی بیماری کے حوالے سے اسے ٹیلی گرام کر دے۔ یہاں پر قدیر نے اپنا دماغ چلایا اور بیماری کے بجائے موت کا تار بھیج دیا۔

"اگر میں تمہاری سنائی ہوئی کہانی کو سچ بھی مان لوں تو پھر زاہدہ کے قتل کو کس کھاتے میں ڈالا جائے گا۔" قدیر کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔ "کیا تم مجھے زاہدہ کے قاتل کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو ضرور بتا دیتا تھانے دار صاحب!" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "زاہدہ کی موت کا سبب میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا......!"

"ٹھیک ہے، جب تک تمہاری سمجھ کام کرنا شروع نہیں کرتی، تم سرکاری مہمان کی حیثیت سے میرے تھانے میں رہو گے۔" میں نے بے رخی سے کہا۔ "جلد ہی تمہارا دوست بھی یہاں آنے والا ہے۔"

وہ سہمی ہوئی نظر سے امیر خان کو دیکھنے لگا۔

میں نے اسی رات جاوید بھٹی کو بھی گرفتار کر لیا۔ اپنے دوست قدیر کو پولیس کسٹڈی میں دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

"اگر تم نے شرافت سے زبان نہ کھولی تو میں تمہاری چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔ مجھے صرف ایک سوال کا جواب چاہیے...... وقوعہ کی رات زاہدہ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ میں سچ سننا چاہتا ہوں......!"

جاوید بھٹی "پائے رفتن، نہ جائے ماندن" ایسی صورت حال کا شکار ہو چکا تھا۔ میں نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ قدیر نے ان کے ہر راز سے پردہ اٹھا دیا ہے لہٰذا جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

"تھانے دار صاحب! جب وقوعہ کی رات زاہدہ نے بتایا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے تو مجھے اپنی سوچ پر اختیار نہ رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں کبھی باپ نہیں بن سکتا۔ زاہدہ کی بے وفائی کے بارے میں، میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ میں دوبارہ اس لیے یہاں آیا تھا کہ اسے اپنی زندگی سے نکال دوں لیکن جب اس نے مجھے باپ بننے کی نوید سنائی تو میرا دماغ خراب ہو گیا اور انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اس بدکردار عورت کو موت کے گھاٹ اتار دیا......!"

جاوید بھٹی کے اقبال جرم نے اس کیس کو اختتامی موڑ دے دیا تھا۔ انسان [illegible] وضاحت سے ساتھ نظر آتی ہیں۔ اگر دیانت داری سے سوچا جائے تو جاوید بھٹی نے بھی خفیہ طور پر جوزفین سے شادی کر کے زاہدہ سے بے وفائی کی تھی۔ بہر کیف، میاں بیوی کا ایک دوسرے سے دور رہ کر زندگی گزارنا بسا اوقات ایسے ہی شرمناک واقعات کو جنم دیتا ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

رئیل اسٹیٹ ایجنٹ نے مجھے آدھا گھنٹا گھر دکھانے میں لگا دیا۔ وہ کوئی پچیس برس کا نوخیز سا لڑکا، نہایت شاطر اور چرب زبان تھا۔ اپنے پیشے کے سارے گھسے پٹے جملے اس نے بلا جھجک استعمال کیے۔ خاندان کے لیے بہترین، ایئر بی این بی کے لیے تیار اور اس قبیل کی دوسری فضولیات۔

جب اس نے یہ کارڈ کھیلا کہ سمندر بس ایک پتھر کی دوری پر ہے، تو بڑی مشکل سے میں نے خود کو یہ پوچھنے سے روکے رکھا کہ آخر کوئی گھر سے سمندر کی طرف پتھر پھینکنا کیوں چاہے گا؟ گو میں پچپن برس کی ایک شائستہ عورت ہوں، ایسی عورت جو آرٹ گیلریوں کی افتتاحی تقریبات میں جاتی ہے اور چرچ میں کلاسک موسیقی کے کنسرٹس سنتی ہے۔ اس لیے میں بس اسے ناگواری سے گھور کر رہ گئی جو کہ ظاہر ہے اس نے دیکھا ہی نہیں کیونکہ وہ اپنے فون پر انگلی

ایک ہی دن میں تین افراد کی حادثاتی موت کا معما

کچھ حادثے اپنے پیچھے ان گنت سوال چھوڑ جاتے ہیں... بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ سب بس اچانک ہو گیا... مگر اس کے پیچھے کئی عوامل چھپے ہوتے ہیں جن تک صرف صاحب عقل افراد ہی پہنچ سکتے ہیں... لیکن تب تک شک کی آگ ٹھنڈی ہو چکی ہوتی ہے اور انہیں بھولی بسری کہانی سمجھ کر ایک یادِ کے طور پر ہی زندہ رکھا جاتا ہے۔

برائے فروخت

صائمہ دانش

ملاقات طے کرنے میں مصروف تھا۔

''مسز ہیولیوا تو آپ کا کہنا ہے کہ یہ جگہ آپ کے لیے موزوں نہیں؟''

''ہیولیو۔'' میں نے لاشعوری طور پر تصحیح کی۔ ویسے بھی مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ تصحیح اس کے ذہن میں تین سیکنڈ سے زیادہ ٹھہرے گی۔ وہ آدمی تو چلتا پھرتا اسٹیپ چیف تھا، جو کچھ میں کہتی، اگلے ہی لمحے غائب ہو جاتا۔

میں نے اسے بنیادی باتیں بتادی تھیں۔ میں اکیلی ہوں، لکھنے والی ہوں، بچپن میں کچھ عرصہ یہاں رہی ہوں اور بخوبی جانتی ہوں کہ ساحل کہاں ہے۔

شاید وہ ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لیتا کہ مجھے خاندانی سہولتوں کی ضرورت نہیں اور یہ بھی کہ میں جانتی ہوں جونیپر روڈ سے سمندر تک بہتر پہنچانے کے لیے گنجائش درکار ہوگی۔

''مجھے اس پر غور سوچنے دو۔'' میں نے کہا۔ اکثر رئیل اسٹیٹ ایجنٹ اس جملے سے چڑتے ہیں۔

''کچھ اور لوگ بھی اس گھر میں دلچسپی لے رہے ہیں۔'' اس نے مجھے آگاہ کرنا چاہا۔

''میں لان میں تھوڑا ٹہلنا چاہوں گی۔'' میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

مائیکل نامی رئیل اسٹیٹ ایجنٹ نے بازو پھیلا کر دوستی انداز میں راستہ دے دیا۔

''اکیلے۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اوہ..... ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا، مجھے واقعی اکیلا چھوڑ کر۔

[illegible] لکڑی جلانے والا چولہا تھا، [illegible] ایک ڈرائنگ روم جہاں میں سکون سے بیٹھ سکتی تھی اور ایک چھوٹے کا کمرا جہاں میں اپنے زیر تکمیل مسودے کے اوراق پھیلا سکتی تھی۔ گھر سٹر کی دہائی کے وسط میں تعمیر ہوا تھا مگر پچھلے مالک نے نارنجی اور بھورے رنگ کی لکڑی کو ایک بے ضرر جھری دار سفید رنگ میں دوبارہ رنگ دیا تھا۔ گھر میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے مجھے ایسے ہی گھر کی تلاش تھی۔

میں پچھلی جانب باغ میں ٹہلنے لگی۔ وہاں گلاب تھے، بلیک بیری کی جھاڑیاں، پرانے برچ کے درخت۔ ان کے ساتھ وہ نئے پودے بھی تھے جو پچھلے مالک نے بڑی احتیاط سے لگائے تھے۔ انگور کا درخت، سیب کے درخت، ایلڈر۔ بس ایک بات تھی جو مجھے کھٹک رہی تھی۔

جونیپر اسٹریٹ پر اتنے زیادہ گھر فروخت کے لیے کیوں تھے؟ ایک چھوٹی سی گاڑی میں آتے ہوئے میں نے گنا تھا، کم از کم سات گھروں کے سامنے ''فروخت کے لیے'' کے بورڈ لگے تھے۔ ایک بورڈ پر تو آئیوی اتنی اوپر چڑھ آئی تھی کہ رئیل اسٹیٹ ایجنٹ کا نام اور فون نمبر آدھے چھپ گئے تھے۔

میں نے اس بارے میں اسٹیپ چیف مائیکل سے پوچھا تھا، جس پر اس نے تقریباً بڑبڑاتے ہوئے معاشی مندی اور بلدیاتی منصوبہ بندی کا کوئی بہانہ بنایا تھا مگر بات میرے پلے نہیں پڑی۔ فاریسٹ وے پر تو ایک بھی بورڈ نہیں تھا اور ایسپروس روڈ پر بس ایک۔ پھر جونیپر اسٹریٹ ہی کیوں اتنی بری طرح متاثر ہوئی؟

جب میں باغ کے آخری کونے میں ایک کیاری کا جائزہ لے رہی تھی تو برابر والے گھر میں ایک خوش شکل آدمی نظر آیا۔ گہرے نیلے رنگ کی فلیس جیکٹ پہنے، بڑے بڑے پتے سمیٹتے ہوئے انہیں ریڑھی میں ڈال رہا تھا۔

اس نے مجھے دیکھا تو سر ہلایا۔ ''نمبر پانچ خرید لیا؟''

''سوچ رہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہاں اچھے پڑوسی آجائیں تو ماحول بدل جائے گا۔''

''اس سڑک پر اتنے گھر فروخت کے لیے کیوں ہیں؟'' میں نے اس خوش شکل بوڑھے سے پوچھا۔

اس نے کندھے اچکائے اور وہی وضاحت پیش کی جو مائیکل نے کی تھی۔ بلدیہ نے فلوڈن کے آس پاس کی زمین خرید کر اسے سرکا نیچر کے لیے مخصوص کر دیا تھا، یہ ایک اچھا فیصلہ تھا۔ اس علاقے میں جو جنگل اور ساحل کے قریب تھا، اس سے بلدیہ کے خزانے کو خوب فائدہ ہوتا۔ برسوں سے [illegible] منصوبہ تب تک بہترین لگتا تھا جب تک مالی بحران نہیں آدھمکا تھا۔

''یہ سب میں سمجھتی ہوں مگر خاص طور پر جونیپر روڈ ہی کیوں؟'' میں نے تاک سیکڑی۔

میرے ممکنہ ہمسائے نے ریڑھی الٹ کر پتے ایک ڈھیر پر ڈالے اور سیدھا میری طرف دیکھا۔

''کیا آپ کافی پئیں گی؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ ہم ایک ٹائلوں والی چھت پر آبیٹھے جو سڑک سے بائیں کے درختوں کی وجہ سے چھپی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دھوپ میں ایک قدرے اکھڑی ہوئی گہرے سبز رنگ کی میز پر بٹھایا اور خود کچن میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹرے لے آیا۔ دو کپ، جو ایک طشتریوں سے ہلکی سی جھنکار کے ساتھ لگا رہے تھے اور ایک پلیٹ میں دو فرانسیسی وافلز۔

urdunovels.com

واقعی میرے ذوق کے مطابق کچھ زیادہ عام سے تھے مگر وہ آدمی خاصا دلکش تھا، سو یہ کمی پوری ہو گئی۔ گہری نیلی آنکھیں، تازہ شیو، اب بھی گھنے بالوں میں ہلکی سی سفیدی۔ میں نے اندازہ لگایا، وہ میری ہی عمر کا ہوگا، شاید ایک دو برس بڑا۔

"میرا نام ایلسن بوکسن ہے۔" اس نے کہا۔

"ریٹائرڈ فارماسسٹ...... دودھ یا چینی؟"

"دودھ...... پلیز!"

وہ دوبارہ اندر گیا اور ایک چھوٹے سے سفید کریمر کے ساتھ واپس آیا۔ میں نے اپنا تعارف کروانا چاہا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"میں جانتا ہوں آپ کون ہیں۔ میری بیوی نے آپ کے ناول بڑے شوق سے پڑھے تھے۔"

"اب نہیں پڑھتیں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

چودہ ناول لکھنے کے بعد، ناروے اور ایسٹونیا تک قارئین ہونے کے باوجود یہ عدم تحفظ کبھی پوری طرح ساتھ نہیں چھوڑتا۔ شاید اس کی بیوی میرے پرائیویٹ سراغ رساں کرٹ اینی وولڈ سے اکتا چکی ہو۔

ریٹائرڈ فارماسسٹ نے سر ہلایا۔ "نہیں...... وہ انتقال کر گئی، تین ماہ ہو گئے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ کیا وہ بیمار تھیں؟" میں نے تاسف کا اظہار کیا۔

میں روز موت کے بارے میں لکھتی ہوں مگر حقیقت میں اس کا سامنا کیسے کیا جائے، یہ ہنر مجھے آج تک نہیں آیا۔

"نہیں، یہ سب اچانک ہوا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹریفک حادثہ؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

اس نے پہلے میرے لیے، پھر اپنے لیے کافی انڈیلی، اس کے بعد ایک فرانسیسی وافل اٹھایا اور نہایت احتیاط سے اس کا ایک کونا توڑا۔

"اصل میں...... زہر۔"

"زہر......؟" میری آواز بلند ہوئی۔

"جی ہاں۔ ایک جان لیوا حادثہ۔"

"کیا ہوا تھا؟"

"آپ کے پاس کچھ وقت ہے؟" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

"جی، بالکل۔"

ایلسن بوکسن اپنی چرچراتی کرسی پر پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور کہانی سنانا شروع کی۔

"سب سے پہلے ہیرٹ ہیلسن مری تھی۔ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ وہ باغات سے پودے چوری کرنے کی عادی تھی اور وہ تقریباً اپنی ایک ایسی ہی واردات کے دوران جان سے گئی۔"

"آگے بتایئے۔"

"دیکھیں، جو پیر اسٹریٹ پر اس کا سامنے کا باغ سب سے حسین تھا۔ نہیں جانتا آپ مل روڈ سے آئی ہیں یا نہیں، مگر شاید آپ نے ایک بھورا سا گھر دیکھا ہوگا، جس کے آگے بے تحاشا پھول کھلے ہوئے رہتے ہیں؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا مگر جواب کا انتظار نہیں کیا۔

"اس کا باغ ہمیشہ نایاب اور دلکش پودوں سے بھرا رہتا تھا، مگر کسی نے اسے کبھی کسی نرسری میں نہیں دیکھا۔ وہ پودے کریڈٹ کارڈ سے نہیں، کھرپے سے خریدتی تھی۔"

وہ لمحہ بھر رکا، وافل کا ایک اور نوالہ لیا، پھر بولا۔

"ایلین پاک، جو پیشے سے ویٹرنری ڈاکٹر ہے، اسی گھر کے سامنے رہتی تھی جسے آپ خریدنے پر غور کر رہی ہیں۔ اس کے لان میں وادی کی کنولوں کی ایک شاندار کیاری تھی، جو ہر بہار میں برف کے چمکتے ذروں کی طرح کھل اٹھتی تھی۔ ایک ویک اینڈ پر وہ اور اس کا شوہر روس سے واپس آئے تو دیکھا کہ کیاری کے عین وسط میں ایک بڑا سا سیاہ چوکور بن گیا ہے، جیسے کسی کی قبر۔ اس نے پڑوسیوں سے پوچھا، مگر کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ ہیرٹ نے بھی نہیں حالانکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی اپنی چھت کے ایک طرف اچانک کنولوں کی نئی کیاری نمودار ہوئی تھی۔"

"اوہ۔" میں نے اپنے اور میزبان کے لیے کافی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے، ہیرٹ پر براہ راست الزام لگانے کے لیے ثبوت کافی نہ تھے، مگر ہم میں سے کئی لوگوں نے...... کیا کہوں، ایک خاص سا پیٹرن محسوس کرنا شروع کر دیا۔" اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔

"نمبر چھ روڈ پر رہنے والی کرسٹین برگ ایک دن اچانک سفر سے لوٹی تو اپنی پچھلی باڑ میں ہیرٹ کو دیکھ لیا۔ بلیو بیری کی جھاڑیوں پر جھکی، ہاتھ میں کھرپا لیے ہوئے۔ اس پر ہیرٹ نے وضاحت کی کہ وہ اپنے باغ میں گوڈی کر رہی تھی کہ اسے کرسٹین کے گھر میں ایک آوارہ کتا دوڑتا دکھائی دیا تو وہ اسے بھگانے آ گئی۔"

"کیا کرسٹین نے یہ کہانی مان لی؟" میں نے پوچھا۔

"خاص نہیں، سب جانتے تھے کہ ہیرٹ لوگوں کی غیر موجودگی میں ان کے باغیچوں سے پودے چرا لیتی تھی۔

بات بالکل واضح تھی مگر ایسی چیز ثابت کرنا آسان نہیں ہوتا اور ظاہر ہے، ہم سب پڑوسیوں سے خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے کی کوشش بھی تو کرتے ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا؟"

"ہم میں سے اکثر نے خاموشی سے اذیت سہی، البتہ نمبر گیارہ پر رہنے والا میڈز برون اس وقت بہت چپ گیا جب اس نے اس کے زیادہ تر ٹیولپس اڑا لیے، مگر ایک ویک اینڈ پر جب ہیرٹ کہیں باہر گئی ہوئی تھی تو اس نے موقع دیکھ کر اپنے پھول واپس نکال لیے۔"

"کیا اس کے بعد ہیرٹ نے چوری چھوڑ دی؟"

"نہیں۔ وہ یوں پیش آئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔"

"کیا اس نے آپ سے بھی کچھ لیا تھا؟"

ایسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، ریتا اور میں نے ہالینڈ سے خاص قسم کے بلب خریدے تھے، گہرے جامنی رنگ کے ٹیولپس، جو ہم نے اس سے پہلے ڈنمارک میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ ہمارے باغ میں ٹھیک سے لگ نہیں پائے یا کم از کم ہمیں یہی لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن ہم نے ہیرٹ کے ہاں سات آٹھ کا جھنڈ دیکھا۔"

"کیا آپ نے اس سے بات کی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں کرنا تو چاہتا تھا مگر ریتا نے پڑوسیوں کے درمیان اچھے تعلقات کے نام پر مجھے روک لیا۔"

"تو پھر کیا وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"کرسٹین، ہیرٹ کے سامنے والے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے ایک پرانے درخت کا ٹھونٹھ کھود کر دروازے کے پاس رکھا اور اس پر وہ ننھے ننھے سلاد والے پتے اگا دیے۔ آپ جانتی ہیں وہ کہیں بھی اگ جاتے ہیں؟"

"ریمنز؟"

"ہاں وہی۔ غالباً ہیرٹ کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش تھی اور ایک ہفتے کی صبح کرسٹین کے شوہر فلیمنگ نے ہیرٹ کو برآمدے کی سیڑھیوں کے ساتھ ٹیک لگائے پایا۔"

وہ کافی کا ایک اور گھونٹ لے کر بولا۔ "مرا ہوا۔"

"وہ ریمنز چرا رہی تھی؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

ایسن نے کندھے اچکائے۔ "اس نے ٹھونٹھ کو بالکل صاف کر دیا تھا، بالکل ایسے جیسے بچے بڑوں کی غیر موجودگی میں کیک سے کریم نوچ لیتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں پتوں سے بھرا پلاسٹک بیگ تھا۔"

"یہ منظر دیکھنا یقیناً خوفناک ہوگا۔" میں نے کہا۔

"فلیمنگ ریٹائرڈ ٹیچر ہے، ہر بات کو آرام سے لیتا ہے۔ اس نے نبض دیکھی پھر اندر جا کر نائن ون ون پر فون کیا۔ رینڈرز سے ایمبولینس آئی اور لاش لے گئی۔"

"پڑوسی یقیناً ہل گئے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"جی بالکل۔ یہاں روز روز اموات نہیں ہوتیں، مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ دوپہر کے وقت میں نے اپنے پڑوسی مالین فالک پولسن کے ہاں سے ایک دل دہلا دینے والی چیخ سنی۔"

وہ اچھا قصہ گو تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

"وہ کیوں چیخی؟"

مگر ایک اچھے فارماسسٹ کی طرح ایسن پولسن اپنی کہانی ناپ تول کر قسطوں میں سنا رہا تھا تاکہ اثر اپنی انتہا کو پہنچے۔

"اس سے پہلے بہتر ہے میں آپ کو مالین کے شوہر موگنز فالک پولسن کے بارے میں کچھ بتا دوں۔" وہ بولا۔ "وہ وکیل تھا اور ہماری ہوم اونرز ایسوسی ایشن کا چیئرمین۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا فرض سیاحوں کو فیلروپ سے دور رکھنا اور ہم سب کو اس تکبر سے تنگ کرنا ہے جس سے کچھ وکیل جان نہیں چھڑا پاتے۔ آپ یہ انداز جانتی ہوں گی۔"

"وہ کچھ خاص خوشگوار نہیں لگتا۔" میں نے کہا اور وافل کا ایک نوالہ لیا۔ دو پرتوں کے بیچ سفید کریم کا ذائقہ مصنوعی سا تھا اور منہ میں چکنا پن چھوڑ گیا۔

"نہیں، ترقی کے خلاف لڑنے میں اس نے بہت توانائی صرف کی۔ اسے یہ سمجھ ہی نہ آئی کہ یہ علاقہ ہم چند سمر ہاؤس والوں کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی اہم ہو سکتا ہے۔ جونہی بلدیہ نے ساحل کے پاس مزید پارکنگ یا کیمپ سائٹ کے نزدیک عوامی بیت الخلا بنانے کی تجویز دی، تو فوراً ہی ہائی کورٹ کے وکیل فالک پولسن جیسے وہ خود کو کہلوانا پسند کرتا تھا، اس کی طرف سے خطوط کا ایک پورا غول ہم پر ٹوٹ پڑتا تھا۔ میرے خیال میں اس کے دفتر میں ایک مکمل فائلنگ کیبنٹ ہوگی، جو ان غضبناک مراسلوں سے بھری پڑی ہے جن میں وہ چیخ چلاتا تھا کہ بلدیہ علاقے کے حسن کو پامال کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔"

"کیا اس ساری تگ و دو کا کوئی نتیجہ نکلا؟" میں نے پوچھا۔

ریٹائرڈ فارماسسٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔

urdunovels.com

چنانچہ اس نے اپنا غصہ ہم پر اتارنا شروع کر دیا۔ ایک بار، ہاؤس اونرز ایسوسی ایشن کے اجلاس میں جب میں نے محض اتنا کہا کہ ساحل پر ہوا کی بہت افراط نہ ہونے سے شاید ہماری ہمساؤں کی کھیتیں گر جائیں، تو اس نے سب کے سامنے مجھے زوردار تھپڑ رسید کیا۔ ''منحوس اردوا کیں بیچنے والے۔'' وہ غرایا تھا۔

''یہ تو کچھ کچھ میری بہن کے سابق شوہر جیسا لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں آپ کی بہن کے سابق شوہر سے تو نہیں ملا، مگر فالک پولسن کم از کم ایک خود پسند احمق ضرور تھا۔'' السبن نے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

وہ اپنا واقعہ ختم کر کے اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد میری پسندیدہ ٹافیوں کا ایک پیالہ لے آیا۔ میں نے ایک منہ میں ڈالی اور سونف جیسی ہلکی، خوشگوار مہک کو ذائقے میں گھلتے محسوس کیا۔ اس کے دوبارہ بیٹھتے ہی میں نے کہا۔

''آپ فالک پولسن کے بارے میں بتا رہے تھے۔''

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''یہاں اس کے دوست بہت کم تھے اور وقت بھی کہاں تھا دوستی کا؟ وہ اپنے لان کا اسیر تھا۔ وہی اس کی شان، وہی اس کی پہچان تھا۔ موسم میں ہر ہفتے ایک بڑی سواری والی گھاس کاٹنے کی مشین چلاتا اور لان کو گولف گرین کی طرح چمکاتا۔ ہم میں سے کوئی اگر اپنے کتے کو بھی اس کے لان پر پنجہ رکھنے دیتا تو وہ ہمیں دوزخ، لعنت اور مقدمے کی دھمکیاں دیتا۔''

''اور اسی ہفتے کی صبح آپ نے مالین کی چیخ سنی، کیا ہوا تھا؟''

''میں اس جرمن جوڑے کو رخصت کر رہا تھا جو سٹگارٹ سے آیا تھا اور سڑک کے اوپر والے بڑے سفید مکان میں ٹھہرا تھا۔ واپسی پر وہ جنگل سے قابلِ خوردنی کھمبیاں چننے کے مشورے چاہتے تھے۔ میں کچھ برس ہمبرگ میں رہا ہوں، اس لیے اس علاقے کے اکثر لوگوں کے برعکس میں روانی سے جرمن بول لیتا ہوں۔

''مگر پھر مالین چیخی۔'' میں نے اسے اصل بات پر واپس لانے کی کوشش کی۔

''ہاں۔ پہلے تو مجھے یہی لگا کہ موگنز نے اسے مارا ہوگا۔ وہ ایسا آدمی تھا جو یہ حرکت کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں فوراً وہاں دوڑا۔''

''کیا اس نے واقعی مارا تھا؟''

''نہیں۔ جو منظر میں نے اس دوپہر دیکھا، وہ بھی نہیں بھول سکوں گا۔ غالباً وہ لان موور چلاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا تھا اور سیدھا اپنے صحن کے بیچوں بیچ کھڑے بڑے برچ کے درخت سے جا ٹکرایا۔ مشین وہیں چلتی رہ گئی تھی، گھاس میں گہرے نشانات بناتی ہوئی۔ مالین نے انجن کی گرج سنی، باہر بھاگی اور جو دیکھا تو چیخ نکل گئی۔''

''آپ نے کیا کیا؟''

''میں نے فوراً مشین بند کی۔ وہ ان دیو ہیکل پہیے والی ماڈلز میں سے ایک تھی۔ موگنز زمین پر ڈھیر تھا، اس کا سر ایک غیر فطری زاویے پر لٹک رہا تھا۔ قاری بالسست کے طور پر میں نے اپنی زندگی میں بہت سی لاشیں دیکھی ہیں۔ قریب جاتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ اب زندہ نہیں رہا۔''

''آپ کو کیسے یقین ہوا؟''

''اس کی آنکھیں آدھی کھلی تھیں، سانس نہیں چل رہی تھی، نبض غائب تھی۔ مالین رو رہی تھی، اس کی خاطر میں نے مصنوعی سانس دینے کی کوشش بھی کی مگر سب بیکار رہا۔ ریسکیورز سے ایک اور ایمبولینس آئی، اس بار ڈاکٹر بھی ساتھ تھا۔ اس نے وہیں موقع پر اسے مردہ قرار دے دیا۔''

''ایک ہی دن میں دو اموات؟'' میں نے کہا۔ ''یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔''

السبن پولسن نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

''تین۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''میری بیوی کو بھی شامل کیجیے۔''

''اوہ......!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''جی...... بالکل۔ مجھے بے حد افسوس ہے۔''

وہ آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''میں مالین کے ساتھ وہیں کھڑا رہا۔ ہم نے اندر سے ایک کمبل لا کر اس پر ڈال دیا اور ایمبولینس کا انتظار کرنے لگے، مگر وہ انتظار جیسے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ مالین اس قدر غمزدہ تھی کہ اسے سنبھالنا ممکن نہ تھا اور اس سب کے بیچ مجھے رہ رہ کر ہلکی سی جھنجلاہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جیسے جھولے پر بیٹھی ہوئی، ایک جرم کی کہانی پڑھ رہی تھی...... آپ ہی کا ناول تھا وہ...... وہ اس سارے ہنگامے پر ذرا بھی متوجہ نہیں ہوئی۔''

''آپ اسے بلانے نہیں گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں مالین کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا، مگر جب ایک اور پڑوسن اپنے کتے کے ساتھ وہاں سے گزری تو میں نے اس سے کہا کہ میری بیوی کو بلا لائے تاکہ وہ مالین کو سنبھال لے۔ عورتیں دلاسا دینے اور ایسے معاملات میں کہیں بہتر ہوتی ہیں۔''

وہ آنکھیں سکیڑ کر اپنے باغ پر نظر ڈالنے لگا، پھر لان کے آخری سرے پر درختوں کے جھنڈ میں کھڑے سب سے اونچے صنوبر کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ وہیں پڑی تھی۔ اس سے کچھ دیر پہلے جب میں سامنے کی طرف گھاس اکھاڑ رہا تھا، اس نے کہا تھا کہ وہ تھک گئی ہے۔ میں سمجھا شاید کل رات کی پارٹی کی وجہ سے ہو۔"

"کون سی پارٹی؟"

"ہم نے پچھلی رات محلے کی ایک مشترکہ پارٹی رکھی تھی۔" وہ سر ہلا کر بولا۔

"آپ لوگ بہت دیر سے لوٹے تھے؟"

"نہیں، خاص نہیں۔ مجھے تو یہی لگا کہ وہ باغبانی میں ہاتھ بٹانے سے جی چرا رہی ہے۔ ریتا کو باغبانی سے کبھی خاص رغبت نہیں تھی، یہ شعبہ ہمیشہ سے میرا رہا تھا۔"

"اور جب سوکو فالک پولسن کے ساتھ یہ سب ہوا، تب بھی وہ شور سن کر نہیں جاگی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

جیسے جیسے بات اس کی بیوی کی موت کے قریب آ رہی تھی، اس کے لیے بولنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے دیکھا، ایک ننھی سی سرخ گلہری شاخوں پر پھدکتی پھر رہی تھی۔

فارماسسٹ کی باڑ کے اس پار وہ سیاہ، خشتی چھت والا مکان دکھائی دے رہا تھا، جسے میں خریدنے پر غور کر رہی تھی۔ دور سے بھی وہ بڑا مانوس اور پرسکون لگ رہا تھا۔ میں نے تصور کیا، چولہے میں جلتی آگ، کھڑکیوں میں جلتی موم بتیاں۔

"الویرا دو منٹ میں واپس آ گئی۔" وہ بولا۔ "اس کا رنگ بالکل فق تھا۔ وہ ریتا کو جگا نہیں پائی تھی۔"

میں کرسی پر ذرا آگے کو جھکی۔ "پھر آپ نے کیا کیا؟"

"میں دوڑتا ہوا گھر پہنچا۔ وہ وہیں تھی، میری شریک حیات، پرانے باغبانی کے شارٹس اور شرٹ میں۔ اس کا منہ آدھا کھلا تھا اور آپ کی کتاب گھاس پر گری ہوئی تھی۔ وہی جس کے سرورق پر بڑا سا سرخ گھر بنا تھا۔"

"سر!" میں بے اختیار بول اٹھی اور فوراً خود کو کوسنے لگی کہ بیچ میں بول پڑی۔

ہیسن نے سر ہلایا، خاص توجہ دیے بغیر۔

"میں ابھی اسے ہوش میں لانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایمبولینس آ پہنچی۔ میں فوراً سڑک کی طرف بھاگا تاکہ طبی عملے کو اندر لا سکوں۔ شروع میں مجھے الجھن ہوئی، وہ مجھے شاید بتا فلط دیا گیا ہے۔ انہیں یہ بات کھلنے میں وقت ہو رہی

تھی کہ ایک ہی وقت میں، سڑک کے دونوں طرف، دو گھروں میں لوگ اچانک گر پڑے ہیں۔"

ہماری کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی، میں نے ایک گھونٹ لیا اور منہ بنا لیا۔

"یہ تصور کرنا ہی کتنا مشکل ہوگا؟" میں نے کہا۔

"واقعی۔" فارماسسٹ نے جواب دیا۔

"پولیس کو بھی یہ سب عجیب لگا۔ وہ تفتیش کے لیے آئے اور صرف کوئی گشتی سی اہلکار نہیں، بلکہ ایک باقاعدہ تفتیشی افسر بھی۔ اس نے نتیجہ نکالا کہ شاید انہوں نے کوئی زہریلی چیز کھا لی تھی۔"

"تینوں نے...... ایک ہی وقت میں...... یہ کیسے ممکن تھا؟"

وہ کندھے اچکا کر بولا۔ "ہاں، اصل سوال یہی تھا۔ تب تک خوف پھیلنے لگا تھا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ شاید...... مچھلی فروش پر شک گیا، پھر توجہ ڈیون روڈ پر واقع وافل بیکری کی طرف مبذول ہو گئی کیونکہ فالک پولسن اور بیرٹ دونوں موت سے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں وہاں اپنے ویفل آئس کریم وافل کھا چکے تھے، مگر مجھے پورا یقین تھا کہ میری بیوی ریتا نے کم از کم پندرہ دن سے آئس کریم کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ چند کلو وزن گھٹانے کے چکر میں وہ ڈائٹ پر تھی، یوں وافل والی تھیوری خود ہی بکھر گئی۔"

"تو پھر انہوں نے کیا کھایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے معدے کے مواد کی جانچ کی گئی، چند دن بعد رپورٹ آئی۔ تینوں نے کونوالیریا ماجالس کے پتے کھائے تھے۔"

"کونوالیریا...... کیا؟"

"للی آف دی ویلی۔ ایک بالکل عام سا پھول دار پودا۔"

"کیا اس کے پتے زہریلے ہوتے ہیں؟"

"تحقیقات کرنے والے نیلسن کا یہی کہنا تھا۔"

"کیا وہ یہ جان سکا کہ تینوں نے ایک ہی دن وہ زہریلے پتے کیسے کھا لیے؟"

"اس نے اپنی ساری تھیوریاں میرے ساتھ شیئر نہیں کیں، مگر بظاہر کئی امکانات تھے۔" ہیسن نے ہلکا سا کندھا اچکایا۔

"مثلاً؟"

"ایک امکان یہ تھا کہ تینوں نے کسی خودکشی کے معاہدے کے تحت ایک ساتھ للی آف دی ویلی کے پتے کھائے ہوں اور موت کے وقت کا فرق محض جسمانی وزن اور کھائے گئے پتوں کی مقدار کی وجہ سے ہو۔"

UrduPDFs.com

"لیکن یہ نظریہ رد کر دیا گیا؟"

"ہاں۔ یہ سوچ ہی مضحکہ خیز تھی کہ وہ تینوں ایسا کوئی معاہدہ کریں گے۔ ان میں کوئی قدر مشترک نہ تھی، سوائے اس کے کہ ان کے گھر ایک ہی سڑک پر تھے۔"

"ضرور کچھ اور بھی رہا ہوگا۔" میں نے اعتراض کیا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "وہ سب پچھلی رات ہونے والی محلے کی دعوت میں شریک تھے۔ یہ دعوت ایلن ہاک اور اس کے شوہر نے دی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ ویٹرنری ڈاکٹر اس بات پر بضد تھی کہ ہم سب کو دوستوں کی طرح رہنا چاہیے۔ ہر سال اپنی سالگرہ پر وہ جوپیٹر اسٹریٹ کے رہائشیوں کو بلا لیتے۔ کچھ لوگ شوق سے آتے، کچھ مفت شراب اور بیئر کے لیے اور کچھ محض گپ شپ کے لالچ میں۔"

"اور آپ ریٹا کے ساتھ وہاں موجود تھے؟"

"ہاں۔ جو لوگ اس ویک اینڈ پر یہاں تھے، سب آئے تھے، وہ جرمن جوڑا بھی۔ البتہ ان سے زیادہ تر بات میں ہی کرتا تھا۔ شراب اور بیئر ایلن کی طرف سے ہوتی تھی اور ہم میں سے ہر ایک اپنے حصے کا گوشت یا سلاد لے آتا، جتنی جس کی استطاعت ہوتی۔"

"تو پولیس کو لگا کہ زہر وہیں، اسی دعوت میں دیا گیا ہوگا؟"

ایسن نے کوئی واضح جواب نہ دیا۔

اگست کا گرم دن تھا، مگر اب سورج لمبے درختوں کی اوٹ میں جا چکا تھا، ہوا میں خنکی اترنے لگی تھی۔

"کیا آپ غروب آفتاب دیکھنے چلیں گی؟" اس نے پوچھا۔

"منظر واقعی دیکھنے لائق ہوتا ہے۔" میں نے ہاں کر دی۔ یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ میں اس علاقے سے خوب واقف ہوں۔

ہم اس چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھے، جہاں نمبر پانچ واقع تھا، پھر ہیورلین کی طرف مڑے، بوئن کے پاس سے گزرتے ہوئے سیدھے اس چھوٹے، ہموار ساحل پر جا نکلے۔ دور افق پر ہوا سے چلنے والی چکیاں سنہری روشنی میں دھندلی سی جھلک دکھلا رہی تھیں۔

میں نے سینڈل اتار دیے اور پاؤں شکر کے مانند نرم، سفید ریت میں دبا دیے۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا بچپن میں انکل کاج اور آنٹ ایلس کے ساتھ سمندر کنارے پر تھا۔ وہ وقت یاد آ گیا۔

کھلا افق اور تازہ ہوا ایسن میں جیسے نئی جان ڈال رہے تھے۔ مجھے لگا اس سارے قصے کو زبان دینا اس کے لیے مفید ثابت ہوا ہے۔ شاید یہ پہلی بار تھا کہ اس نے اپنی بیوی کی موت کا واقعہ یوں کسی کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔

"کیا پولیس کبھی معلوم کر پائی کہ یہ سب کیسے ہوا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب انہوں نے تفتیش شروع کیں، ایلن نے اپنا گرل صاف کر دیا تھا اور جو برتن اور باؤل لوگ استعمال کر چکے تھے، وہ دھو کر رکھ دیے گئے تھے۔ کوئی بھی واقعی یاد نہیں کر سکتا تھا کہ کس نے کب کیا کھایا یا پیا، یا یہ کہ ریٹا، ہیرٹ اور موگنز فالک پیکسن نے ایک ہی چیز کھائی یا پی تھی یا نہیں۔"

"تو معاملہ کبھی حل نہ ہوا؟"

"بالکل۔ ڈیٹیکٹو نیلسن نے جو صرف ایک بات یقینی طور پر معلوم کی، وہ یہ تھی کہ للی آف دی ویلی کے پتے ایلن ہیک کے اپنے باغ سے آئے تھے لیکن کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ پتے تینوں مقتولین تک کیسے پہنچے۔"

ہم تھوڑا اور آگے بڑھے۔

"کیا آپ اسے یاد کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کس کو..... ریٹا کو؟"

وہ کنارے سے ہٹ کر ایک لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گیا جو ڈوبتے سورج کے بالکل سامنے تھی۔

"درحقیقت نہیں۔ ایمانداری سے کہوں تو ہم دونوں کے درمیان زیادہ بات چیت یا کوئی مشترکہ دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ اگرچہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی لیکن ہم ویسے بھی الگ ہو جاتے۔ وہ کسی اور کے ساتھ خوش تھی اور مجھ سے طلاق لینے والی تھی۔"

میں اس کے پہلو میں بینچ پر بیٹھ گئی، کچھ دیر خاموشی چھا گئی۔ آسمان ہلکے گلابی سے گہرے نارنجی میں بدل رہا تھا۔

"ایسین! آپ کی اپنی رائے کیا ہے؟ آپ کے خیال میں تینوں نے وہ زہریلے پتے کیسے کھا لیے؟"

اس نے گہری سانسیں لیں، مگر لب بھینچے رکھے۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ کے پاس کوئی نظریہ ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ جرمن جوڑا.....!" اس نے آخرکار کہا۔

"وہ جرمن جوڑا کیا؟"

"ہاں۔ وہ نئے نئے کھانوں کے دیوانے تھے۔ ہم نے اس بارے میں کافی بات کی تھی۔ ان کے پاس ایک کتابچہ تھا، جس کے مطابق وہ جنگل سے سبزیاں اور [illegible] اکٹھے کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس شام وہ سلاد کے لیے ایک خاص قسم کے پتے لائے تھے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے ان

کے باغیچے میں موجود تھی آف دی ویلی کے پیچھے ریسٹو کے پتے بچھے ہوئے ہیں۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔"

"اور اب وہ واپس بھی جا چکے؟ یہ جانے بغیر کہ وہ تین لوگوں کی موت کا سبب بن گئے؟"

ایسمن نے سر ہلایا۔

"کیا آپ نے پولیس کو اس بارے میں بتایا؟"

وہ آسمان کی طرف دیکھ کر سوچ میں گم ہو گیا۔

"کیا فائدہ ہوگا؟ جو مر گئے، سو مر گئے۔ اب وہ واپس آنے سے تو رہے۔"

میں نے کندھے اُچکائے۔ "مقتولین کے اہلِ خانہ حقیقت جاننا چاہتے ہوں تو؟ تاکہ انہیں صبر آ سکے۔ پولیس کو بھی یہ ایک حادثہ لگے گا، کیا یہ درست نہیں؟"

وہ میرے سوال کا جواب دیے بغیر بینچ سے اٹھ گیا۔

"ویسے......!" اس نے کہا۔ "اب آپ جان گئیں کہ جونیپر اسٹریٹ کے گھر اتنی تعداد میں برائے فروخت کیوں ہیں۔ وہ بھیانک حادثہ، بہت سی تلخ یادیں، مشکوک نظریں، مشکوک سوالات...... زیادہ تر مالکان بس سب کچھ چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔"

ہم منظر بدلنے کے لیے اوشن روڈ سے واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ ہوا میں اسپروس کے درخت، باربی کیو اور گرم مٹی کی خوشبو تھی۔ ایک فرنٹ یارڈ میں دو بچے گیند ایک دوسرے کی طرف پھینک رہے تھے۔

کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ "ایسمن! ایک بات جو میں سوچ رہی تھی۔"

"کیا؟" وہ چونکا۔

"ان تینوں افراد میں اور بھی باتیں مشترک تھیں، سوائے اس کے کہ ان کے گھر ایک ہی سڑک پر واقع تھے۔"

وہ مجھ سے رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا اور دور افق کی طرف دیکھنے لگا، جہاں سورج کا سرخ گولہ آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوب رہا تھا۔

"یہی کہ وہ تینوں لوگ تمہیں بالکل پسند نہیں تھے، ہے نا؟" میں نے کہا۔

اس نے ذرا سا سر ہلایا مگر کچھ نہیں بولا۔

میں نے کہا۔ "ایک بات مجھے اب تک سمجھ نہیں آرہی۔ جرمن لوگ اصولوں کے بہت پابند ہوتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ جرمن جوڑا کسی کے گھر کے سامنے والے باغ میں چپکے سے داخل ہو گیا اور بغیر اجازت جنگلی لہسن (ریمسنو) توڑ لایا۔"

"ممکن ہے کسی نے انہیں یہ بتایا ہو کہ ایلن بیک اپنے پڑوسیوں کو اپنے باغ سے یہ پتے توڑنے کی اجازت دیتی ہے۔" ایسمن نے گلا صاف کیا اور آہستہ سے کہا۔

"جرمن زبان میں ریمسنو کو کیا کہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بیئرلادخ۔" وہ فوراً بولا۔

اس نے جواب کچھ زیادہ جلدی دے دیا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا، مگر وہ نظریں جھکائے زمین کو دیکھ رہا تھا۔

"تو پھر صرف وہی تین لوگ زہر سے کیوں مرے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"مجھے یاد ہے کہ جرمن عورت ایک بڑے سے پیالے میں ریمسنو کا سلاد لائی تھی۔ وہ پیالہ میں نے لوگوں میں بانٹنا شروع کیا تھا۔ ریتا اور فالک کو دینے کے بعد بدقسمتی سے ایک جگہ میرا پاؤں درخت کے ٹھونٹھ سے ٹکرا گیا اور سارا سلاد لان میں گر گیا۔" وہ بولا۔

"اور بیرٹ؟" میں نے کہا۔

"نہیں، بیرٹ کو نہیں۔ وہ اتنی لالچی تھی کہ میرے پیالہ اٹھانے سے پہلے وہ اپنے لیے خود سلاد نکال چکی تھی۔"

ہم اس وقت جونیپر اسٹریٹ میں داخل ہو چکے تھے۔ شام کی مدھم روشنی میں سفید "برائے فروخت" کے بورڈ چمک رہے تھے۔ میں نمبر پانچ کے سامنے رک گئی۔

"ویسے یہ ضروری نہیں کہ واقعی ایسا ہی ہوا ہو۔ یہ صرف ایک نظریہ ہے۔" ایسمن یونسن کچھ ہچکچایا اور بولا۔

"ہاں، بالکل...... صرف ایک نظریہ۔" میں نے نظریں چرا کر کہا۔

پھر وہ مڑ کر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ دروازہ بند کرنے سے ذرا پہلے اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے الوداع کہا۔

میں کچھ دیر تک ڈرائیو وے میں کھڑے بڑے بلوط کے درخت کے نیچے کھڑی رہی۔ وہ ایک بہت خوبصورت گھر تھا اور اس کی قیمت بھی مناسب تھی۔

میں نے جیب سے موبائل نکالا اور مائیکل کو کال کی۔ میری کال سیدھی اس کے وائس میل پر چلی گئی۔ شاید وہ اس وقت کینڈی کرش کھیل رہا ہوگا یا ٹنڈر پر لوگوں کی پروفائلز دیکھ رہا ہوگا، اس لیے میں نے اس کے لیے پیغام چھوڑ دیا۔

"مائیکل! مسز ہوور سلیو بول رہی ہوں۔ میں یہ گھر خرید رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں رہ کر میں بہت زبردست جرائم پر مبنی کہانیاں لکھ سکوں گی۔"

❋❋❋

urdunovels.com

محفلِ شعر و سخن

❁ ناہید یوسف، اسلام آباد

خموش رہ کے مجھے اور سوگوار نہ کر
وہ جھوٹ ہی ہو فسانہ کوئی سنا تو سہی

❁ حرا اطہر، کراچی

ایک تھا موسم وفا جس کی ہمیں تلاش تھی
اپنے نصیب میں مگر اور ہی کچھ عذاب تھے

❁ یوسف قادری، کراچی

ماہ ناز ہیں وہ پیکرِ اخلاص نوجوان
ہیں جو سرگرمِ عمل تن کی نہ دھن کی خاطر
ہم فقط جان چھڑکتے ہیں وطن پہ بھائی
اور وہ جان لٹاتے ہیں وطن کی خاطر

❁ اُمِ حبیبہ، ملتان

جانے کس صحرائے غم میں کھو گیا
ہائے وہ آنسو کہ جو دریا بھی تھا!

❁ نازیہ ملک، سوات

مجھے راستے میں پڑا ہوا کسی بدنصیب کا خط ملا
کہیں آنسوؤں نے مٹا ہوا کہیں خونِ دل سے لکھا ہوا

❁ فائزہ خالد، سرگودھا

اتنے چپ چاپ کہ رستے بھی رہیں گے لاعلم
چھوڑ جائیں گے کسی دن یہ شہر شام کے بعد

❁ احسان اللہ، ملتان

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا
پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی میری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ، کیا ہوا کیونکر ہوا

❁ حسن نواز، لاہور

حیات درد کو آلودۂ نشاط نہ کر
یہ کاروبار اگر کوئی کاروبار بھی ہے

❁ ریاض خان، اٹک

اے راہ روانِ راہِ وفا ہم تم سے بہت شرمندہ ہیں
تم جان پہ اپنی کھیل گئے اور ہم سے ہوئی تاخیر بہت
اے شمعِ یقیں کے پروانو اس دور سے تم کو کیا نسبت
یہ دور نمائش کا اس میں اخلاص ہے کم تشہیر بہت

❁ آمنہ حبیب، فیصل آباد

جیسے ساحل سے چھڑا لیتی ہیں موجیں دامن
کتنا سادہ ہے تیرا مجھ سے گریزاں ہونا

❁ رشید خاں، پشاور

دل دکھ سے آباد ہمیشہ رہتا ہے
پہلا پتھر یاد ہمیشہ رہتا ہے

❁ مہتاب احمد، حیدر آباد

دل کے دورے سے ایک ہی پل میں
مرگ سرمایہ دار ہوتی ہے
اور غربت گزیدہ لوگوں کی
موت بھی قسط وار ہوتی ہے

❁ کاوش خان، کوئٹہ

جس کے چہرے پہ رقم ہو بے بسی کی داستان
کیا کرے گا تذکرہ وہ گردشِ ایام کا

❁ زرین نواب، نواب شاہ

...یا حادثہ ہوا ہے جہاں میں کہ آج پھر
...ہر ایک شخص کا اترا ہوا سا ہے

❁ شازیہ علی، کوٹری

...یوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے نگینے
...یک روز میرے شہر میں آجائیں گے ہم بھی

❁ مقصود میمن، کراچی

...جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
...م اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں

❁ اقبال خان، شاہ پور

...زرہوں ہوئے جس شخص کی صورت نہیں دیکھی
...ر آج اسی شخص کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں

❁ فراز احمد، سیالکوٹ

...ون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
...یں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی

❁ امتیاز علی، گجرات

...ہ میں اب یہ ہنر اختیار کرتا ہے
...ہ سچ کہے نہ کبھے اعتبار کرتا ہے
...جھ کو جاگتے رہنے کا شوق کب سے ہوا
...جھے تو خیمہ تیرا انتظار کرتا ہے

❁ مسرت جعفری، ڈھڈیال

...ل تو اپنا اداس ہے ناصر
...ر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

❁ محمد عباس، کاموکے

...ساتی یوں عجب گھاؤ لگا ہے میرے دل پر
...ٹنے بھی نہیں پاتا مٹتا بھی نہیں ہے

❁ نبیلہ ایاز، لیہ

...ھم میں بے گری ہے جو دیکھا اہلِ عالم کو
...کوئی کافر کوئی فاسق کوئی صدیق اکبر تھا
...ر جب ہوگیا دل احتساب نفس پہ مائل
...ہوا ثابت کہ ہر فردِ آدم مجھ سے بہتر تھا

❁ شاہدہ جنید، گھوگھٹی

...نے کیا توڑا گلستان سے وفا کا ایک پھول
...ہر کلی ہے غیر محرم، ہر شگوفہ اجنبی

❁ امجد ریاض، ساہیوال

...کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کیسا
...جو تمہیں بھلا چکا ہے اسے تم بھی بھول جاؤ

❁ مدثر حسین، کمالیہ

تم سے جدا ہوئے تو کسی کو خبر نہ تھی
مڑ مڑ کے دیکھنا مجھے بدنام کر گیا

❁ رابعہ خان، گوجرانوالہ

موم کی سیڑھی پہ چڑھ کر چھو رہے تھے آفتاب
پھول سے چہروں کو یہ کوشش بہت مہنگی پڑی

❁ غلام حسین، ساہیوال

دامن چاک لیے بیٹھا ہوں
آنکھ نمناک لیے بیٹھا ہوں
کل مجھے جتنی ضرورت ہوگی
اتنی ہی خاک لیے بیٹھا ہوں

❁ ندا نایاب، میرپور خاص

اٹھا کبھی دھواں تو کبھی روشنی ہوئی
جلتی رہی حیات بڑی خامشی کے ساتھ

❁ الیاس صہیب، اوکاڑہ

بھلا دو، رنج کی باتوں میں کیا ہے
ادھر دیکھو میری آنکھوں میں کیا ہے

❁ جہانزیب احمد، کراچی

ایک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
ایک عرضِ تمنا ہے وہ ہم کرتے رہیں گے

❁ کفایت خٹک، خیبر پختونخواہ

ڈرا رہے ہیں مجھے میرے گھر کے سناٹے
ترس گئی میری تنہائی ہم سفر کے لیے

❁ کامران خان...... بہاولپور

خوشبو تیری باتوں کی بس ہے گلاب میں
تیری الفت کا نشہ نہیں ملتا شراب میں
ساری عمر نہ جاگیں گے ہم نیند سے
اگر تو وعدہ کر آنے کا خواب میں

❁ ظفر مرزا، میانوالی

کوئی خواہش نہیں تجھ سے میری اے عمرِ رواں
میرا بچپن، میرے جگنو، میری گڑیا لادے

❁ سعدیہ شیخ، خوشاب

سوزِ دل ہے آنسوؤں کے اک قیامت ہے قمر
اس سے پوچھو، جس کا گھر جلتا ہو اور پانی نہ ہو

❁ اویس کمال، کراچی

تیری مخمور نگاہوں کے تصور میں کبھی
سو بھی جائیں تو ترے خواب جگا دیتے ہیں

UrduNovels.com

❁ یاسمین علی...... ہری پور
بہت دنوں سے نہیں اپنے درمیان وہ شخص
اداس کر کے ہمیں چل دیا کہاں وہ شخص

❁ مہر شفیق الرحمٰن...... منڈی ڈھاباں سنگھ
بھڑک رہی ہے مگر شام سے یہ چنگاری
جلا کے راکھ نہ کر دے یہ انتظار کی آگ

❁ زیب شاہ...... ٹنڈو الہ یار
بیر لیتے ہیں نظر، دل سے بھلا دیتے ہیں
کیا یہی لوگ وفاؤں کا صلہ دیتے ہیں

❁ سکندر کلیم احمد، منڈی ککھیکی
مانا کہ غم کے بعد مسرت ضرور ہے
لیکن جئے گا کون تیری بے رخی کے بعد

❁ زینت اللہ خان...... راولپنڈی
بے خبر کہ مری روح کے دریچوں میں
تم حیات کے کتنے چراغ جلتے ہیں

❁ جمشید علی خان...... نوشہرہ
اک خواب ہو گئی ہے وہ رہ و رسم دوستی
اک وہم سا ہے اب کہ میرے ساتھ تم بھی تھے

❁ زیب النساء...... لیہ
زندگی بھر کی مسافت کاٹ کر بھی کیا ملا
اجنبی دیوار و در، سنسان گھر، تنہائیاں

❁ محمد ظریف...... حیدرآباد
آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے
جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی

❁ رانا اعجاز الحسن...... کراچی
گیلی لکڑی کی طرح جلنے کی عادت دے گیا
جانے والا جاتے جاتے کیا امانت دے گیا

❁ چوہدری عابد الرحمٰن...... کہروڑ پکا
میں نے ڈوبتی دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاج دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

❁ محمد عاشق...... کراچی
خود پیاس کا صحرا ہوں مگر دل کی یہ ضد ہے
ہر دشت پہ ساون کی طرح ٹوٹ کے برسوں

❁ احسن علی خان...... روہڑی
اے دیکھنے والو! مجھے مڑ مڑ کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

❁ فرح خان، مانسہرہ
زنداں میں ہوائیں بھی جہاں نوحہ کناں ہوں
پنچھی وہاں آزادی کے نغمے نہیں گاتے

❁ تبسم، لاڑکانہ
نامرادی کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں
تو بھی شامل تھا کبھی میری تمناؤں میں

❁ شہزاد احمد، منڈی بہاؤالدین
ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ ایک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

❁ محمود نوید، ڈی جی خان
گو ترک تعلق تھا مگر جاں پہ بنی تھی
مرتے تجھے یاد نہ کرتے کوئی دن اور

❁ جمیل احمد، لاہور
کل کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزردہ نہ کر
دیکھ یہ ہنستا ہوا موسم یہ خوشبو کا سفر

❁ نعیم خان، بہاولپور
افسردگی ہے مگر وجہ غم نہیں معلوم
کہ دل پہ بوجھ سا ہے رنج بے سبب کی طرح

❁ تصور ندیم، شیخوپورہ
رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

❁ ایوب احمد، مظفر آباد
زلف جب اس دوش پہ لہرا گئی
میکدے پر اک گھٹا سی چھا گئی

❁ حنا خان، مری
قسمت کے ستاروں کو نہ ہم دھیان میں لائے
ہاتھوں کی لکیروں کے تجسس میں پڑے ہیں

❁ محمد یونس، چکوال
"رنج حیات کو رنگ خوشی ہی رہنے دو"
"جو آگ دل میں لگی ہے دبی ہی رہنے دو"

کوپن
برائے شمارہ
جون 2026

محفلِ شعر و سخن
نام: ------------------------
پتا: ------------------------

urdunovels.com

انسان روزِ اول سے قدرتی معاملات پر قابو پانے کے لیے کوشاں ہے۔ اس کی فطرت میں موجود بے چینی اور اضطراب اسے مسلسل کچھ ایسا کرنے پر اکساتا رہتا ہے، جس سے وہ کسی قدرتی نظام پر حاوی ہو سکے۔ وہ اس کے لیے سائنس کا سہارا لے کر مختلف چیزیں ایجاد کرتا رہا تو کبھی عملیات کے ذریعے مظاہرِ فطرت کو اپنے ماتحت کرنے کی کوشش میں اپنی اور دوسروں کی زندگیاں خراب کرتا رہا ہے۔

آخرکار صدیاں بیت گئیں اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ ہاں وہ سب کچھ بہترین اور کامل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے نہ صرف غربت پر قابو پالیا بلکہ بیماریوں کو بھی شکست سے دوچار کر دیا۔ اب موت صرف حادثے کی صورت میں وارد ہو سکتی تھی یا طبعی طور پر حملہ آور ہو سکتی ہے کیونکہ عرصہ قبل سے نہ کوئی جنگ رہی تھی اور نہ کوئی مجرم۔

یہ ایک روشن اور چمکدار صبح کی بات ہے جب ایڈورڈ ویلنگ جونیئر شکاگو کے ایک اسپتال میں راہداری کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بے چینی و بے قراری سے چکر لگا رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں اس کی بیوی ماں اور وہ باپ بننے والا تھا۔ ویسے بھی وہ واحد انسان تھا جو آج باپ بننے والا تھا۔ اب پہلے کی طرح روزانہ درجنوں بچے پیدا نہیں ہو رہے تھے۔ سائنس نے لوگوں کی عمریں کافی طویل کر دی تھیں۔ ایڈورڈ اس

بلیدان

محمد عثمان ذوالفقار

انسانی فطرت میں موجود بے چینی و اضطراب اسے قدرتی کاموں میں خلل ڈالنے پر اکساتے رہتے ہیں... وہ اپنی دانست میں ایسے قوانین بناتے ہیں کہ لگتا ہے وہ دنیا میں رہنے والے دوسرے لوگوں پر بہت بڑا احسان کر رہے ہوں... ایک ایسے سیارے کے مکینوں کی کہانی جہاں نہ عمر کی قید تھی نہ کوئی بیماری... کہ جس کی وجہ سے موت واقع ہو جائے... ہاں مگر کسی نئے نومولود کو دنیا میں آنے کے لیے کسی دوسرے کی زندگی کا خاتمہ ضروری تھا... جس سے وہ ننھا وجود بے خبر تھا۔

ایسی دنیا کی کہانی جہاں ہر نئی زندگی ایک زندگی مانگتی تھی

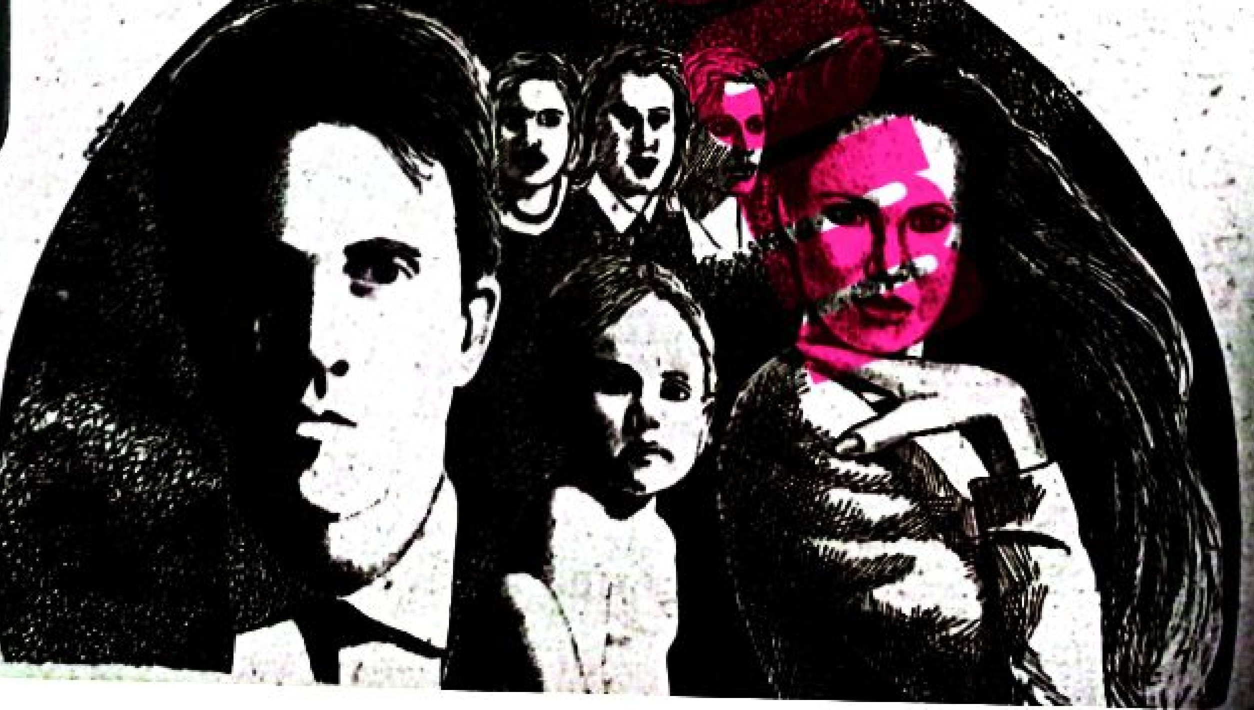

قوم سے تعلق رکھتا تھا جس کی اوسط عمر اب ایک سو اتیس سال تھی اور وہ خود اس وقت چھپن سال کا ہو چکا تھا۔ ہر چیز کو توازن میں لانے کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکا نے اپنی آبادی کو بھی چار کروڑ تک محدود کر دیا تھا۔ قدرتی طور پر شرح اموات کم ہو جانے کی وجہ سے حکومت کو شرح پیدائش کے سلسلے میں بھی قانون سازی کرنا پڑی، جس کے تحت ہر نئے پیدا ہونے والے بچے کے بدلے میں کسی ایک انسان کو رضاکارانہ طور پر موت قبول کرنا پڑتی اور اس رضاکار کا انتظام والدین کے ذمے ہوتا کہ اگر وہ اپنے بچے کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو کسی کو اس قربانی کے لیے آمادہ کریں۔ یہ سب کام "وفاقی ادارہ برائے خاتمۂ حیات" کے تحت سرانجام دیے جاتے تھے، جن کے ساتھ کوئی بھی ایک مخصوص فون نمبر کے ذریعے رابطہ کرسکتا تھا۔ یہ صرف ایک فون نمبر نہیں تھا بلکہ اس سارے عمل کا منہ بولتا ثبوت تھا، جس کا انگریزی مطلب یہ بنتا تھا کہ زندگی بمقابلہ زندگی۔

ایکسرے کے تجزیے کے بعد یہ بات عیاں ہوئی تھی کہ ویلنگ کی بیوی تین جڑواں بچوں کو اس دنیا میں لانے جارہی تھی اور وہ پہلی بار والدین بننے جارہے تھے۔ ویلنگ شدید اضطراب کے عالم میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کچھ سوچنے لگا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ایک بچے کی بات ہوتی تو شاید وہ کچھ کر لیتا مگر یہاں تو تین بچے تھے اور وہ جڑواں ہونے والے تھے۔ پریشانی کی وجہ سے وہ اپنے آپ میں اس قدر گم اور ساکت ہو گیا کہ اسے اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ اردگرد کے ماحول کو تو وہ پہلے ہی بھلائے ہوئے تھا۔

جس کمرے میں وہ تھا، اسے خوبصورت انداز میں سجایا جارہا تھا اور یہ سجاوٹ ان لوگوں کی یاد میں تھی جنہوں نے رضاکارانہ طور پر موت کو قبول کیا تاکہ دنیا کی آبادی اور اس کے مسائل کو کم کیا جاسکے۔ ایک بوڑھا آدمی جس کی عمر تقریباً دو سو سال تھی، سیڑھی پر چڑھ کر ایک دیوار کو پینٹ کرنے میں مصروف تھا۔ حالانکہ اسے یہ کام بالکل پسند نہیں تھا۔ پچھلے دنوں میں جب کوئی آدمی بوڑھا ہوتا تھا تو اس کے بال سفید اور جلد جھریاں زدہ ہو جاتی تھیں لیکن وہ زیادہ سے زیادہ پچیس سال کا لگ رہا تھا کیونکہ ان ہی برسوں میں بڑھاپے کو روکنے کا کامیاب علاج دریافت ہو چکا تھا، جب وہ ابھی بڑھاپے کی پہلی سیڑھی پر تھا۔

وہ جس دیوار پر پینٹنگ پر کام کر رہا تھا، وہ باغ کے ایک خوش کن منظر پر مشتمل تھی، جس میں مرد و عورت ڈاکٹرز اور نرسوں کے لباس میں ملبوس تھے اور ان میں کچھ زمین میں بیج بو رہے تھے، کچھ ان پر پانی چھڑک رہے تھے۔ جامنی یونیفارم میں ملبوس وہ لوگ زمین پر اگی ہوئی ان جڑی بوٹیوں کو اکھاڑ رہے تھے جو سوکھ کر اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھیں لیکن ہنوز زمین کی گہرائی میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے تھیں۔ کبھی قرونِ وسطیٰ کے ہالینڈ یا جاپان میں بھی کسی باغ کی ایسی دیکھ بھال نہیں کی گئی ہوگی جیسی اس کی ہو رہی تھی۔ ہر پودے کو برابر کی ہوا، پانی، روشنی اور دوسرے نمکیات مل رہے تھے۔ اسی وقت اسپتال کا اردلی راہداری میں نمودار ہوا۔ وہ ایک مشہورِ زمانہ نغمہ گنگنا رہا تھا۔

اردلی نے دیوار پر موجود تصویر کو دیکھا اور پھر مصور کو۔

"یہ کتنا حقیقی لگ رہا ہے، یوں جیسے میں بھی ان کے وسط میں کھڑا ہوں۔"

"کون سی چیز تمہیں احساس دلا رہی ہے کہ تم ان میں نہیں ہو؟" نقش گر نے طنز کیا۔ "تم جانتے ہو کہ اسے خوشی کا باغِ حیات کہتے ہیں۔"

"یہ ڈاکٹر ہٹز ہے نا؟" اردلی کا اشارہ اسپتال کے طبیب اعلیٰ برائے امراضِ نسواں ڈاکٹر بنجمن ہٹز کی طرف تھا جو مردانہ وجاہت میں اپنی مثال آپ تھے۔

"ابھی بہت سے چہروں میں رنگ بھرنا باقی ہے۔" اردلی نے دیوار گیر نقش کو دیکھتے ہوئے کہا۔ تصویر میں بہت سے لوگوں کے چہرے ابھی نہیں بنائے گئے تھے کیونکہ انہیں اسپتال یا پھر وفاقی ادارہ برائے خاتمۂ حیات کے شکاگو دفتر کی اہم شخصیات کے پورٹریٹ سے پر کیا جانا تھا۔

"کسی چیز کو اس طرح بنانا کہ وہ واقعی حقیقی لگے، کتنا زبردست کام ہے۔" اردلی نے کہا۔

"تو تمہارے خیال میں مجھے اس پر فخر کرنا چاہیے یا پھر تم سوچ رہے ہو کہ یہ میرا خیال تھا کہ زندگی کو ایسا بنا کر پیش کروں؟" دیوار پینٹ کرنے والے نے اردلی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو تمہارے خیال میں زندگی کیسی نظر آتی ہے؟" اردلی نے سوال کیا۔

"یہ زندگی کی ایک زیادہ حقیقی تصویر ہے۔" مصور نے اس گندے کپڑے کی طرف اشارہ کیا جس پر جابجا پینٹ کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ "تم اسے فریم کرو گے تو تم پر زندگی کی ایک خوفناک مگر حقیقی تصویر واضح ہو جائے گی۔"

"تم تو بوڑھی بطخوں کی طرح کہہ رہے ہو۔"

"تو کیا یہ جرم ہے؟" مصور نے سوال کیا۔

"اگر تم اس جگہ سے تنگ آگئے ہو بوڑھے میاں، تو پھر 2 BR 02 B کس مرض کی دوا ہے؟" اردلی نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

یہ وفاقی ادارہ برائے خاتمۂ حیات کے میونسپل دفتر کا سرکاری نمبر تھا۔ کوئی بھی ایسا آدمی جو اپنی زندگی سے بیزار ہو کر

اسے انجام تک پہنچانے کا خواہاں ہوتا، اس پر کال کر سکتا تھا۔

"جب اس کا وقت آئے گا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"بوڑھے میاں! آپ کو نہیں لگتا ہے کہ اب آپ کو نئے آنے والے انسانوں کے لیے یہ دنیا خالی کر دینی چاہیے تاکہ دنیا میں گڑبڑ نہ ہو؟" اردلی نے پوچھا۔

"انسانوں کا گڑبڑ کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا۔" مصور نے ایک نقش اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا تو اردلی چلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

انتظار کرتے ہوئے ویلنگ نے سر اٹھائے بغیر بڑبڑاتے ہوئے کچھ کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

اچانک ایک لڑکی ویٹنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے کپڑے، جوتے، کوٹ اور بیگ غرض سب کچھ گہرے جامنی رنگ کا تھا۔ اس کے بیگ پر وفاقی ادارہ برائے خاتمۂ حیات کی مہر لگی ہوئی تھی۔ خاتون کے چہرے پر بے تحاشا بال اگے ہوئے تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ادارے کے گیس چیمبر کے لیے بھرتی کرتے وقت لڑکی چاہے جتنی مرضی خوبصورت اور نسائی خصوصیات کی مالک ہوتی، لیکن پانچ سال کے بعد اس کے چہرے پر مونچھیں نکل آتی تھیں۔

"کیا مجھے یہاں آنے کے لیے بلایا گیا ہے؟" لڑکی نے مصور سے پوچھا۔

"یہ تو اس پر منحصر ہے کہ آپ کس لیے آئی ہیں۔" مصور نے کہا۔ "کیا تمہارے بچہ ہونے والا ہے؟"

"مجھے کہا گیا ہے کہ مجھے کسی تصویر کے لیے جانا ہے۔ ویسے میرا نام لیورا ڈنکن ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"اوہ، تم لوگوں کو ڈبوتی ہو؟" مصور نے ڈنکن کے ہم آواز لفظ کو استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

"چھوڑو اسے۔"

"یہ بہت خوبصورت تصویر ہے جیسے جنت کا کوئی کونا ہو۔" لڑکی نے تعریف کی۔

مصور نے اپنی جیب سے ایک فہرست نکالی اور اس میں لڑکی کا نام ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔

"تمہیں لافانی بنانے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ چہرے کے بغیر والی تصویریں دیکھو اور بتاؤ کہ تمہارا چہرہ کس تصویر میں پینٹ کروں، حالانکہ اب کم ہی تصویریں رہ گئی ہیں جنہیں پینٹ کیا جا سکتا ہے۔"

لڑکی تھوڑی دیر غور سے نقشِ دیوار کو دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ "مجھے ان چیزوں کے بارے زیادہ علم نہیں، میرے لیے تو سب ہی ایک جیسے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ فائن آرٹس کا استاد ہونے کے ناتے میں اس تصویر کے بارے میں مشورہ دوں گا۔" مصور نے ایک خاتون کے دھڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو سوکھی جھاڑیوں کو بھٹی میں ڈال رہی تھی۔

"یہ تو لوگوں کے اخراج والے شعبے کا کام ہے۔ میں مجھے میں ضرور ہوں لیکن لوگوں کو ٹھکانے لگانا میرا کام نہیں ہے۔" لیورا نے کہا۔

مصور نے ایک زوردار تالی بجائی اور کہنے لگا۔ "ایک لمحہ پہلے تم کہتی ہو کہ تمہیں آرٹ کی سمجھ نہیں اور اگلے ہی لمحے تم یہ ثابت کر دیتی ہو کہ تم اس سے زیادہ جانتی ہو جتنا میں نے تمہارے بارے میں سوچا تھا، پھر تمہارے لیے یہ تصویر زیادہ موزوں رہے گی۔" مصور نے ایک اور عورت کی طرف اشارہ کیا جو سیب کے درخت سے ایک مردہ شاخ کھینچ کر اتار رہی تھی۔

"اس طرح تو میں ڈاکٹر ہٹز کے ساتھ ہو جاؤں گی۔" لیورا نے اپنے لہجے کو دھیما رکھتے ہوئے کہا۔

"تو اس میں کوئی مسئلہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، نہیں، یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔"

"تو کیا تم اسے پسند کرتی ہو؟"

"کون ہے جو انہیں پسند نہیں کرتا؟" اس نے سفید بالوں والے دو سو چالیس سالہ ڈاکٹر ہٹز کی تصویر کو عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہا، جیسے وہ زیوس دیوتا کا کوئی دوسرا روپ ہو۔ وہ مزید کہنے لگی۔

"انہیں کون پسند نہیں کرے گا؟ شکاگو میں پہلا گیس چیمبر انہی کی کوششوں کی بدولت بنا تھا۔"

"تمہیں ان کے پہلو میں ہمیشہ کے لیے جگہ دے کر مجھے خوشی ہوگی۔" مصور نے کہا۔

"بالکل، یہ اس جیسا ہے جو میں کرتی ہوں۔" لیورا کو اپنا کام بتاتے ہوئے شرم آئی تھی۔ وہ لوگوں کی زندگی کا خاتمہ کرنے میں ان کی مدد کرتی تھی۔

تھوڑی دیر میں جب وہ اپنے پورٹریٹ کے لیے پوز بنا کر کھڑی تھی تو ڈاکٹر ہٹز انتظار گاہ میں داخل ہوا۔ اس کا قد سات فٹ تھا اور وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ اس وقت وہ اچھے موڈ میں تھا، اس لیے جب اس نے لیورا کو وہاں دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

"اوہ، تو مس ڈنکن آئی ہیں۔ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ یہ وہ جگہ تو نہیں ہے جہاں سے لوگوں کو اگلے جہان سدھارا جاتا

urdunovels.com

ہے بلکہ یہاں سے تو وہ دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔"

"ہم دونوں ایک ہی تصویر میں اکٹھے ہونے جا رہے ہیں۔" لیورا نے شرمیلے پن سے کہا۔

"بہت خوب۔" ڈاکٹر ہنز نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "اچھا، تو یہ وہی تصویر ہے نا؟"

"یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔" لیورا نے کہا۔

"مجھے یہ کہنے دو کہ......" ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ "تمہارے ساتھ ہونا میرے لیے بھی اعزاز کی بات ہے۔ جو دنیا ہم نے بنائی ہے، یہ تم جیسی خاتون کے بغیر ممکن نہیں تھا۔"

ڈاکٹر ہنز نے اسے سیلیوٹ کیا اور زچہ و بچہ والے کمروں کی جانب بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔

"تمہیں پتا ہے کہ ابھی کون پیدا ہوا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"تین جڑواں بچے۔"

"واقعی...... تین جڑواں بچے؟" اس کی یہ حیرت بچوں کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے بنائے گئے سرکاری قانون پر تھی۔ نئے قانون کے مطابق کوئی بھی نیا بچہ صرف اسی صورت میں زندہ رہ سکتا تھا، اگر اس کے والدین کوئی ایسا انسان ڈھونڈ لیں جو ان کے بچے کے لیے رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دے۔ تین جڑواں بچوں کا مطلب تھا کہ اگر والدین اپنے تینوں بچوں کو زندہ رکھنا چاہیں تو اس کے لیے انہیں تین رضاکار ڈھونڈنے ہوں گے۔

"تو کیا والدین نے تین رضاکاروں کا انتظام کر لیا؟" لیورا نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"آخری بار جو میں نے سنا تھا، وہ یہ کہ ان کے پاس ایک تو ہے اور باقی دو ڈھونڈنے کے لیے وہ کوشش کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"میرا نہیں خیال کہ وہ کامیاب ہوں گے۔" لیورا کہنے لگی۔ "کیونکہ ابھی تک تو کسی نے بھی تین لوگوں کی اکٹھی اپائنٹمنٹ نہیں لی۔ ہاں، میرے آنے کے بعد ایسا ہوا ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ویسے ان کے باپ کا نام کیا ہے؟"

"ویلنگ!" انتظارگاہ میں موجود ویلنگ نے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ کہا۔ "ایڈورڈ کے ویلنگ جونیئر اس ہونے والے باپ کا نام ہے۔" اس نے اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور مصوری والی دیوار کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ "میں حاضر ہوں۔"

"ارے مسٹر ویلنگ......!" ڈاکٹر ہنز بولا۔ "میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔"

"شاید میں غائب ہو گیا تھا۔" ویلنگ نے جواب دیا۔

"اسٹاف نے ابھی فون کر کے آپ کے تین جڑواں بچوں کے پیدا ہونے کی خبر دی۔" ڈاکٹر ہنز نے کہا۔ "بچے اور ان کی ماں خیریت سے ہیں۔ میں بس ابھی کو دیکھنے جا رہا تھا۔"

"بہت خوب۔" ویلنگ نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"آپ زیادہ خوش نہیں لگ رہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"کون ہے جو اس موقع پر خوش نہیں ہوگا؟" ویلنگ نے اپنے ہاتھوں کو بے فکری سے جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے بس یہی فیصلہ کرنا ہے کہ تینوں میں سے کون سا بچہ ہم رکھنے جا رہے ہیں، پھر اپنے دادا کو خوشی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت کر کے رسید لا کر یہاں جمع کروا دوں گا۔"

ڈاکٹر ہنز کو ویلنگ کا لہجہ اچھا نہیں لگا، اس لیے وہ اس طرف بڑھا اور کہنے لگا۔ "کیا تم آبادی کو ایک مخصوص حد تک قابو میں رکھنے پر یقین رکھتے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ بہترین طریقہ ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تو کیا تم پرانے اور اچھے دنوں میں نہیں جانا چاہتے؟" ڈاکٹر ہنز نے کہنا شروع کیا۔ "جب دنیا کی آبادی بیس ارب کی تھی اور بڑھ کر چالیس ارب ہونے والی تھی۔ اس کے بعد وہ 80 ارب اور پھر ایک کھرب 60 ارب ہو جاتی۔ کیا تم جانتے ہو کہ تواچہ کیا ہوتا ہے؟" ڈاکٹر نے آخر میں ویلنگ سے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"تواچہ، مسٹر ویلنگ......!" ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ "بلیک بیری کا سب سے چھوٹا گٹھلی دار پھل ہوتا ہے۔ اگر بروقت آبادی پر قابو نہ پایا جاتا تو آج اس سیارے پر انسانوں کی حالت بالکل ویسی ہی ہوتی تھی، جس طرح بلیک بیری کی شاخ پر ان چھوٹے گٹھلی دار پھلوں کی ہوتی ہے یعنی ایک دوسرے میں گھسے ہوئے۔"

ویلنگ نے بغیر کچھ کہے دیوار کو گھورنا جاری رکھا۔

"2000ء میں......" ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "سائنس دانوں نے دنیا کا جائزہ لیا تو لوگوں کے پینے کے لیے پانی اور کھانے کے لیے خوراک بہت کم رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود لوگوں کا اصرار تھا کہ انہیں حق حاصل ہے کہ وہ خرگوشوں کی طرح بچے پہ بچے پیدا کرتے جائیں اور انہیں یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں۔"

"میں بچے چاہتا ہوں اور تینوں کو رکھنا چاہتا ہوں۔" ویلنگ نے آہستہ سے کہا۔

"بے شک تم ایسا کر سکتے ہو، کیونکہ تم بھی انسان ہی ہو۔"

urdunovels.com

"اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اپنے دادا کو موت کے منہ میں نہ جانے دوں۔" ویلنگ نے کہا۔

"اصل میں کوئی بھی انسان اس بات سے خوش نہیں ہوتا کہ وہ اپنے قریبی عزیزوں کو اس بلیدان تک پہنچائے۔" ڈاکٹر نے حقیقت بیان کی۔

"میری خواہش ہے کہ لوگ اس جگہ کو اس نام سے مت پکاریں۔" لیورا نے افسوس سے کہا۔

"کس کو؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ لوگ اس جگہ کو بلی دان یا اس جیسے کسی نام سے نہ پکاریں۔ اس سے لوگوں کو غلط تاثر جاتا ہے۔" لیورا نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے معاف کرنا۔" ڈاکٹر ہٹز نے کہا، پھر اس نے خود کو درست کرتے ہوئے میونسپل گیس چیمبر کے لیے اس سرکاری نام کو استعمال کیا، جو اس سے پہلے شاید کسی نے بھی نہیں کیا ہوگا۔ "میں اب اسے اسٹوڈیو برائے اخلاقی خودکشی کہوں گا۔"

"یہ اس سے کافی بہتر نام ہے۔" لیورا ڈکن نے کہا۔

"اچھا، تو اب یہ آپ پر منحصر ہے۔" ڈاکٹر ہٹز نے مسکراتے ہوئے مسٹر ویلنگ سے کہنا شروع کیا۔ "آپ کس بچے کو منتخب کرتے ہیں کہ وہ اس صاف ستھرے اور انسانوں کے بے ہنگم ہجوم سے پاک سیارے پر ایک شاندار اور خوشیوں بھری زندگی کا آغاز کرے؟ جیسا کہ اس باغ میں دکھایا گیا ہے۔ دو سو سال پہلے جب میں جوان تھا اور آبادی سے دنیا کا برا حال تھا تو لوگ یہ سوچتے تھے کہ پتا نہیں اگلے بیس سالوں میں زمین پر زندگی ممکن رہے گی بھی یا نہیں۔ آبادی پر قابو پانے والوں کا شکریہ جن کی وجہ سے ہم کئی دہائیوں سے اس سیارے پر پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن جب اس نے ویلنگ کو ریوالور نکالتے دیکھا تو اس کی مسکراہٹ لمحوں میں کافور ہوگئی۔ ویلنگ نے اپنے ریوالور کا رخ ڈاکٹر ہٹز کی طرف کیا اور گولی چلا دی۔

"ایک بچے کی جگہ بن گئی۔" ویلنگ چلایا۔

پھر اس نے لیورا ڈکن کا نشانہ لے کر فائر کیا۔

"دو کی جگہ بن گئی۔"

دونوں کو انجام تک پہنچانے کے بعد اس نے خود کی بھی جان لے لی تاکہ اس کے تینوں بچے اس زمین پر خوشی سے کھلکھلا سکیں۔

کسی نے بھی فائرنگ کی آواز نہیں سنی، ماسوائے اس مصور کے جو سیڑھی کے اوپر بیٹھا خاموشی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

یہ سب دیکھنے کے بعد مصور زندگی کی خوفناک پہیلی پر غور کرنے لگا، جس میں سب سے پہلے پیدا ہونے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ایک بار جب آپ پیدا ہو جاتے ہیں تو آپ سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنی زندگی کو نتیجہ خیز بنائیں اور وہ بھی اس لیے تاکہ آپ مزید انسان پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس چھوٹے سے سیارے پر زیادہ سے زیادہ لمبا عرصہ جینے کی کوشش میں لگے رہیں، پھر ان سب کے بعد آخرکار انجام کیا تھا؟

مصور اس سلسلے میں جتنے بھی جواب سوچ سکتا تھا، وہ خوفناک تھے۔ یہاں تک کہ بلیدان اور آسان خاتمۂ حیات سے بھی زیادہ بھیانک۔ اس نے جنگوں کے بارے میں سوچا، پھر طاعون اور قحط سالی کے بارے میں سوچا، جنہوں نے کئی بار ہزاروں لاکھوں انسانوں کو یوں صفحۂ ہستی سے مٹایا تھا جیسے ان کا کوئی وجود تھا ہی نہیں۔

خیالات کے بھنور میں کافی دیر غوطے کھاتے رہنے کے بعد مصور کو محسوس ہوا کہ شاید اب وہ کبھی کسی مصوری کے جوہر نہ دکھا سکے۔ اس حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد اس نے ہاتھ میں پکڑا پینٹ برش نیچے موجود رنگوں سے لتھڑے کپڑے پر پھینک دیا، پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اس نے خوشی کے گلشنِ حیات میں جتنی زندگی گزار لی ہے، وہی کافی ہے اور آہستہ آہستہ سیڑھی سے نیچے اترنے لگا۔

نیچے اتر کر اس نے ویلنگ کا ریوالور پکڑا تاکہ اپنے آپ کو زندگی کی قید سے آزاد کر دے مگر اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے خود کو بے بس محسوس کیا۔

اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو اسے کمرے کے کونے میں ایک ٹیلی فون نظر آیا۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور وہ نمبر ملایا جو اسے اچھی طرح یاد تھا یعنی 2 B R 0 2 B۔

"وفاقی ادارہ برائے خاتمۂ حیات۔" دوسری طرف سے ایک لڑکی نے فون اٹھایا۔

"مجھے جلد از جلد کب تک اپائنٹمنٹ مل سکتی ہے؟" اس نے محتاط لہجے میں سوال کیا۔

"آج سہ پہر تک۔" لڑکی نے جواب دیا۔ "اور اگر کسی نے اپنی اپائنٹمنٹ کینسل کر دی تو آپ کو جلدی بھی مل سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، پھر آج سہ پہر کے لیے میرا نام لکھ لیں۔"

یہ کہہ کر مصور نے اپنا پورا نام و پتا لکھوا دیا۔

"جناب! آپ کا بے حد شکریہ۔" لڑکی نے شکریہ ادا کیا۔

"آپ کا شہر ممنون، وطن مشکور اور سیارہ احسان مند رہے گا اور سب سے بڑھ کر آنے والی نسلیں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔"

✖✖✖

جانگلی

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

کبھی کبھی حالات انسان کو الگ ہی ڈگر پر لے آتے ہیں... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ایسے سفر پر چل پڑتا ہے جس کا اسے ادراک نہیں ہوتا کہ منزل آئے گی بھی یا نہیں... وہ بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہو گیا... وہ سادہ طبع نوجوان تھا مگر نامساعد حالات کی طنابیں گرفت میں رکھنا جانتا تھا... ایک پُراسرار واقعہ اس کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا اور وہ نفرتوں کی آگ میں کود پڑا... اسے نہیں پتا تھا کہ انجام کیا ہوگا... بس اس کے سامنے ایک مقصد تھا کہ اسے حق کا ساتھ دینا ہے... سو بے خوف و خطر خطرات کے سامنے ڈٹ گیا... اور یہی الجھنیں اسے مزید الجھاتی چلی گئیں۔

ایک ایسے نوجوان کی کہانی جو اپنی صلاحیتوں کو آزمانا جانتا تھا

اوائلِ سرما کی مدبھری شام میں ایک خوشگوار ہیت کا تاثر دیتی سبک خرام صبا کے دوش بدوش سندھو دریا کے چوڑے پاٹ میں بہتا پانی اس وقت بھی اپنے سینے میں متا بھری برودت سموئے ہوئے تھا۔ درختوں کے جھنڈ کے پار کوٹڑی اور حیدرآباد کو ملاتا سندھو دریا پر بنا "مہران برج" اپنی برقی آنکھیں روشن کر چکا تھا اور وہاں سے شاید کوئی مسافر ٹرین گزر رہی تھی۔

لیکن میں اس وقت یہاں یہ سب دیکھنے کے لیے نہیں آیا تھا کیونکہ میرے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔ میں تو ادھر ہی کا باشندہ تھا۔ میرے دائیں بازو پر اور قدرے عقب میں گوٹھ اللہ یار کے کھیت کھلیان پھیلے ہوئے تھے۔ بائیں جانب دیہہ دریام کی جاگیر تھی۔ سامنے میرے سندھو دریا تھا اور میں گوٹھ اللہ یار کا رہواسی (رہائشی) تھا۔

سندھو دریا کے اس پار بیراجی علاقہ تھا جہاں ماچھی قوم اور مچھیروں کی بستیاں تھیں۔ اس کے بعد چند میل آگے سوناجنڈی کا گھنا اور خطرناک جنگل تھا جو بہت طویل حدود تک سندھو دریا کے دائیں بائیں دور تک چلا گیا تھا۔ پرانے زمانے میں لوگ بیل گاڑیوں پر اسی بیراجی راستوں سے دیگر علاقوں کا سفر کیا کرتے تھے جو دادو، سیہون شریف اور لاڑکانہ تک چلا جاتا تھا۔ وہیں سے دریا مختلف شاخوں میں بٹ جاتا۔ یوں یہ جنگل کا یہ سلسلہ دادو، سیہون شریف، کندھ کوٹ اور کشمور تک پھیلا ہوا تھا۔

مجھے دریا کے پار ماچھیوں کی بستیوں سے آگے سوناجنڈی کے جنگل میں اس مقام پر جانا تھا جدھر نہ جانے کس دور کے کھنڈرات پائے جاتے تھے۔ وہاں کسی ٹوٹے پھوٹے مندر کے آثار بھی تھے۔ جنگل میں اسی مذکورہ مقام پر چند چھوٹے ٹیلے ہے بھی تھے۔ ان کھنڈرات کو دیکھنے کے لیے کچھ لوگوں کی ٹیمیں بھی آتی دیکھی گئی تھیں۔ یہ بہت پہلے کی بات تھی، وہ شاید آثارِ قدیمہ کے کوئی لوگ تھے۔ ان کھنڈرات پر تحقیق کرنے آنے والے، انھیں کوئی نام نہ دے پائے تھے۔ البتہ ایک حال ہی میں آنے والی کسی سرکاری یا غیر سرکاری ٹیم سے سنا تھا کہ انھوں نے اسے "دیوبی مندر" کے کھنڈرات کا نام ضرور دے ڈالا تھا۔ خیر، اب ایک طویل عرصے سے کسی نے یہاں کا رخ نہیں کیا تھا۔

میں بہرحال وہاں کسی بات کا کھوج لگانے گزشتہ دو روز سے جا رہا تھا جس نے مجھے بے چین کر رکھا تھا اور سوتے جاگتے میں اسی مقام پر اس پراسرار آواز کو سنتا رہتا تھا جو پہلے دن سے ہی مجھے بے کل کیے ہوئے تھی مگر آج میں نے تہیہ کر رکھا تھا، اس اسرار کا کھوج لگا کر ہی رہوں گا۔ اسی "عہد" کی وجہ ہی تھی کہ میں نے وہاں چند دن رہنے کا منصوبہ بنا لیا تھا جس سبب میرے کاندھے پر ایک بوری لدی ہوئی تھی اور اس میں میری چند دنوں کی روزمرہ کی ضروریات کا سامان، ہلکی پھلکی خوراک سمیت موجود تھا۔ ساتھ ہی میں نے اس بات کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ جب تک اس اسرار کا کھوج نہیں لگ جاتا، میں وہاں سے واپس نہیں لوٹوں گا۔ گھر والوں کو میں نے یہی بتایا تھا کہ میں کسی دوست کے ہاں شہر جا رہا ہوں۔ شہر سے ہماری مراد جامشورو یا حیدرآباد ہوتی۔

میری کوشش تھی کہ شام ہونے تک وہاں پہنچ جاؤں۔ دریا میں مجھے چند ایک ماچھیوں کے شکارے (کشتیاں) تیرتی نظر آئیں اور ان میں سے ایک پر میں سوار ہو گیا۔ شکارا ایک ادھیڑ عمر کا خاکستری چہرے والا کھے رہا تھا۔ القصہ، اس نے مجھے مطلوبہ مقام سے ذرا قریب اتار دیا۔ اسے کرایہ دے کر میں دوسرے کنارے سے آگے ایک ٹیڑھی میڑھی کچی پگڈنڈی پر چل دیا۔ میں چاہتا تو ذرا آگے مطلوبہ مقام پر کشتی سے اتر جاتا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو میری اس پراسرار مہم کا پتا چلے۔

شام سر پر آ گئی تھی، فضا میں ہلکی ہلکی ٹھنڈ تھی۔ ہر سو خاموشی کا راج تھا...... ماسوائے قریب بہتے دریا کے پانی کے رل ترل مدھریاں کے...... جو کانوں کو بھلا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے کسی جنگلی جانور وغیرہ سے سامنا ہونے کے خدشے کے پیشِ نظر احتیاطاً چاقو، رسی اور رمائی بوری میں رکھ چھوڑے تھے۔

رمائی میرا بنایا ہوا ایک خودساختہ ہتھیار تھا بلکہ میرا کیا، میرے نانا حضور بخش کی ایجاد تھی۔ یہ ہتھیار جو دیکھا مار کرتا تھا، دراصل سندھی زبان میں "رمائی" کا مطلب گھما کر مارنا ہے۔ یہ ایک رسی ہوتی تھی جس کے سرے پر کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی کو اس طریقے سے باندھا جاتا تھا کہ اس میں موجود پتھر گھما کر جب مارا جاتا تو وہ اچھی خاصے فاصلے تک مار کرتا اور دوسرے اس کی چوٹ کسی بندوق کی گولی کے "دھکے" سے کم نہ ہوتی تھی لیکن اسے بڑی مہارت سے سر کے اوپر گھما کر چلایا جاتا تھا، جب ہی ٹھیک نشانے پر لگتا۔ بوقتِ ضرورت اسے دو بدو لڑائی میں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس کی بھی مجھے مہارت تھی۔ یہ آج کے "نن چکو" جیسا کام دکھاتی تھی۔

یہ مجھے نانا نے اچھی طرح سکھایا تھا۔ میں چاہتا

urdunovels.com

پوری جس میں میرا زادِ راہ تھا، اب میری پشت پر لدی تھی۔ ہاتھ میں چھڑی لیے میں پکی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ سانپ، جنگلی کتے اور گیدڑ راہ میں ملتے تھے۔ ان سے نمٹنے کا مجھے اچھا خاصا تجربہ تھا کیونکہ یہاں کے رہنے والے خود کو ''جانگلی'' ہی کہتے تھے۔ میں بھی ایک ''جانگلی'' ہی تو تھا۔ ادھر ہی پیدا ہوا، ادھر ہی پل بڑھ کر جوان ہوا۔

میں جب اپنے مطلوبہ مقام کی مذکورہ حدود میں داخل ہوا تو سونا پنڈی کا جنگل گھنا ہو چکا تھا۔ شام ڈھل کر رات میں بدلنے لگی تھی لیکن میرے دل و دماغ میں کوئی خوف، کوئی ڈر نہ تھا۔ میں یوں چلا جا رہا تھا جیسے رات میں اس پُرخطر جنگل کی سیر پر نکلا ہوا ہوں۔ اگرچہ حقیقت بھی یہی تھی۔ معاً میرے قدم رک گئے۔

''چھن...... چھن...... چھن......!''

قدرے فاصلے سے وہی عجیب، پراسرار اور نامعلوم سی بے چینی میں مبتلا کرتی آواز ابھری اور میرے قدم بھی رک گئے۔ ایسا لگا جیسے میری سانس بھی رک گئی ہو۔

یہ وہی آواز تھی چھن...... چھن...... جس نے کئی دنوں سے میرا سکون برباد کر رکھا تھا، جس نے مجھے ایک نامعلوم سی بے چینی دے رکھی تھی اور جس کا آج میں سراغ لگانے کا ارادہ کر کے ہی آیا تھا اور قسم کھا رکھی تھی کہ اس پراسرار آواز کا کھوج نہیں لگاؤں گا، اپنے گھر نہیں لوٹوں گا۔

میرے قدم رک چکے تھے، سانس دھیرے دھیرے ہموار ہونے لگی، اطراف میں خاموشی رہی۔ میں نے آواز کی سمت جانچنے کی کوشش میں اپنی ساری حسیات اسی طرف مرکوز کرلیں اور راک ہوتے ہی اسی سمت ایک قدم بڑھایا۔

''چھن...... چھن......!'' اسی سمت سے آواز آئی۔ میری سماعتوں کو فوری قیاس ہوا کہ پہلی والی آواز ایسی ہی تھی جیسے وہ قریب سے آئی ہو اور پھر یکدم دور جانے لگی۔ میں نے اسی طرف تیز تیز قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ میں گویا اس آواز کے تعاقب میں لگ گیا۔ آواز بھی اب بدستور ابھرنے لگی تھی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے اس نے بھی اپنے تعاقب کا اندازہ لگا لیا ہو۔

میرا ذہن آپوں ہی آپ یہ قیاس کرتا جا رہا تھا کہ آواز والے نے بھی مجھے دیکھ لیا ہے اور اب مجھے اپنے تعاقب میں آتا پا کر جیسے گھبرا گیا ہو اور اس نے بھی مجھ سے دور بھاگ جانے کے لیے اپنی رفتار تیز کر دی ہو۔

جھاڑ جھنکاڑ میرے راستے میں آتے اور میں انہیں دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا تیز تیز قدموں سے آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ ایک موقع پر میرے پاؤں پر ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل آ رہا۔ تب ہی میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ گرتے ہی میری پیشانی زمین پر پڑی کسی ٹھوس اور کند شے سے بڑے زور کے ساتھ ٹکرائی تھی۔

میرے حواس جاتے رہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا، سانسیں ماند پڑنے لگیں، سر چکرانے لگا۔ تب ہی مجھے چھن...... چھن کرتی دور جاتی آواز قریب آتی محسوس ہوئی۔ ایک تو پہلے ہی اس جنگل کے ماحول میں رات اتر آئی تھی، دوسرے سر پر چوٹ لگنے کے سبب میں پوری طرح دیکھنے سے بھی قاصر ہی تھا لیکن چھن...... چھن کرتی آواز میں جانے کیسا جادو تھا کہ میں نیم حواسوں میں ہی جہاں کا تہاں پڑا رہ گیا۔ گویا منتظر تھا کہ یہ ''چھنچھناتی'' آواز خود ہی قریب آ کر اپنا عقدہ کھول دے۔ میں اب بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ بس ایک آس تھی، ایک انتظار تھا کہ وہ قریب آ جائے۔ وہی ہوا، چھن چھن کرتی آواز میرے قریب آ گئی، بالکل قریب...... اور اس کے ساتھ خوشبو کی لپٹیں بھی خوشگوار جھونکے کی طرح میرے نتھنوں سے ٹکرائیں۔ اب میرے حواس ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ [illegible] شاید میرے شوقِ دید اور راز سے پردہ اٹھانے کی [illegible] میری قوتِ ارادی کو مضبوط کر رکھا تھا کہ میں کچھ ہوش میں تھا۔ تب ہی ایک لطیف سے لمس کا احساس مجھے اپنی پیشانی پر ہوا جیسے کوئی جھک کر میرے زخم کو چھو کر محسوس کر رہا ہو۔ نہ جانے اس لمس میں ایسی کیا نرماہٹ تھی، [illegible] تھا کہ مجھے پتا نہ لگا۔ یہ نیند کا شاخسانہ تھا یا پھر [illegible]...... کہ پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو سرکنڈوں کی جھونپڑی میں پڑے پایا۔ میں فرش پر تھا اور میرے نیچے بوسیدہ سی میلی رلی بچھی ہوئی تھی۔ فرش ناپختہ اور غیر ہموار سا تھا۔ ایک طرف بدنما بانس سے لالٹین جھول رہی تھی۔ اس کے قریب دیوار پر ایک بین لگی ہوئی تھی جس کی باریک ڈور دیوار پر گڑے کوکے (کیل) سے لٹکی نظر آئی۔ جھونپڑی خالی تھی۔ میرے حواس کچھ جاگے تو مجھے یاد آیا میرے ساتھ کیا ہوا تھا اور یہ بھی کہ وہی چھن چھن کرتی آواز میرے قریب آئی تھی۔ اس نے میرے زخم کو نرمی سے چھوا بھی تھا پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

یہ سب یاد آتے ہی بے اختیار میرا ایک ہاتھ اپنی پیشانی کے زخم پر چلا گیا۔ [illegible] پٹی بندھی تھی۔ زخم میں کوئی

نمی محسوس نہ ہوئی۔ اس کی جگہ ایک ٹھنڈک سی تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا دھیرے سے اٹھ کر بیٹھا تو مجھے چکر سا آ گیا۔ پھر کچھ سنبھالا لیا اور جھونپڑی کا جائزہ لینے لگا۔

میرے دائیں جانب تو نہ جانے کیا الا بلا بکھرا ہوا تھا جبکہ بائیں طرف تھوڑے کونے میں مجھے پانچ چھ کے قریب مٹکے اور پٹاریاں رکھی نظر آ گئیں۔ پہلے سرکنڈوں کی دیوار کے ساتھ جھولتی بین اور اب یہ پٹاریاں دیکھ کر مجھے سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی کہ میں کسی جوگی کی جھونپڑی میں تھا۔ اسی طرف ایک مٹی کا گھڑا بھی رکھا دکھائی دیا جس کے اوپر جست کا ٹیڑھا میڑھا گلاس رکھا تھا۔ جھونپڑی میں عجیب سی باس گردش کرتی محسوس ہوئی۔ میں بہرحال ان سب چیزوں کا عادی تھا اور مجھے اس پر کوئی حیرت بھی نہ ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ کسی سانپ کی تلاش میں نکلے ہوئے جوگی نے مجھے جنگل میں بے ہوش پڑے دیکھا اور ہمدردی کے ناتے یہاں اٹھا لایا۔ ایک طرف میرا بوری نما تھیلا بھی پڑا نظر آیا۔ اس کے اوپر کھڑکی کا پردہ نما چوکھٹا سا تھا جدھر سے باہر شفق اور بھر تاریک سا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ چھن چھن والی کا راز میں آشکار کرتے کرتے رہ گیا تھا۔

معاً ٹاٹ کے پردے کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری اور ساتھ ہی کھانسنے کی آواز سنائی دی پھر یکبارگی پردہ ہٹا۔ میرے تصور میں ایک خاکستری رنگت والے کھلے سے بڈھے جوگی آدمی کا خاکہ تھا لیکن آنے والا میری ہی عمر کا ایک تنومند نوجوان تھا۔ اس کی رنگت گہری سانولی ضرور تھی مگر وہ خوبرو تھا۔ بال گھنگھرالے، آنکھیں بڑی بڑی صاف، چمکدار اور روشن تھیں۔ چہرہ گول، پیشانی کشادہ، قد مناسب تھا۔ تاہم وہ جوگی ہی تھا کیونکہ اس نے ویسا ہی گیروا لباس اور پیلی پگڑی سر پر باندھی ہوئی تھی۔ بغل میں پٹاری اور گلے میں بین جھول رہی تھی۔

میری طرف اس نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ تلے دیکھا پھر حلق سے ایک ہلکی سی ہنکاری خارج کرتے ہوئے پٹاری اتار کر فرش پر رکھی، بین نکالی اور پاس گھڑے سے پانی پیا، پھر آستین سے ہونٹ پونچھتے ہوئے میرے قریب فرش پر بیٹھ گیا اور بڑبڑایا۔

''آج پھر پدم نکل گیا...... خیر کب تک بچے گا۔ میں بھی جوگی ہوں، اسے پکڑ کر ہی چھوڑوں گا۔''

میں اس کی طرف دیکھ کر اس کے شاید کوئی بات کرنے کا انتظار کرنے لگا لیکن اسے سانپ کی دُھن پڑی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ''پدم'' کسے کہہ رہا ہے۔ یہ ایک انتہائی زہریلا سانپ ہوتا ہے جو جوگیوں کے لیے بہت خاص ہوتا ہے۔ آسانی سے ہاتھ نہیں آتا اور ہاتھ لگ بھی جائے تو موت سے ضرور ہمکنار کر ڈالتا ہے۔ اسے کوئی ماہر اور کامل جوگی ہی بے بس کر سکتا ہے جبکہ مجھے یہ اتنا زیادہ تجربہ کار نہیں معلوم ہو رہا تھا۔

''تمہاری مہربانی......!'' میں نے ہولے سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چلتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ اس نے ایک دم میرے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ کی سختی اور طاقت کا چھوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا۔ میں بیٹھ گیا اور اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''مہربانی کیسی سنگت!'' اس کا لہجہ گہرا اور جما ہوا تھا۔ آگے بولا۔ ''کیا تجھے زخمی حالت میں جنگل میں پڑا چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا؟ کوئی جانور تجھے کھا جاتا، کوئی دھریا سانپ ڈس جاتا تجھے۔'' پھر اپنی ہی بات پر وہ سر جھٹک کر ہنسا۔ ''پر یہ تو بتا، میں تو ٹھہرا جانگلی، جوگی، سنیاسی...... تو ادھر رات میں جنگل میں کیا کرنے نکلا تھا؟''

''میں بھی تیری طرح جانگلی ہی ہوں۔'' میں نے بھی مسکراہٹ سے کہا پھر ایک گہری سانس لی۔ ''بس، کچھ تلاش کرنے نکلا تھا۔''

''تلاش کرنے نکلا تھا؟'' وہ حیران ہوا۔ ''کس کی تلاش...... سانپ کی......؟ پر تو، تو کہیں سے بھی جوگی نہیں لگتا۔'' کہتے ہوئے اس نے ایک طرف کونے میں رکھے میرے بوری نما تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے تیرا تھیلا بھی دیکھا تھا۔ مجھے تو، تو کوئی شکاری لگا تھا لیکن پھر بھی شکاری اس پہر اور اتنی کمزور تیاری سے تو نہیں نکلا کرتے۔''

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ اب میں اسے کیا بتاتا۔ تاہم پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''تمہارا نام کیا ہے اور کب سے یہاں رہتے ہو، کیا اکیلے ہو یا اور کوئی بھی تمہارے ساتھ رہتا ہے؟''

''اڑے سنگت! یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی، پہلے یہ بتا تو نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں؟'' وہ بولا۔ ''ویسے میرا نام علی گوہر ہے۔''

''مجھے بھوک ہے نہ پیاس۔'' میں نے جواب میں کہا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ میری نظروں کا مطلب سمجھ گیا اور چوکڑی مار کر بیٹھ رہا۔

''ادھر ذرا پرے ایک چھوٹا وسیبہ ہے، بھیاگی بستی...... میں وہیں رہتا ہوں۔ میرا پیو (باپ) دنیا میں نہیں رہا، اب صرف ایک بوڑھی ماں اور جوان بہن ہے۔

"یہاں میں خاص دنوں میں آ کر رہتا ہوں۔" سوچتیں...... کہتے ہوئے وہ جھونپڑی کی کھلی کھڑکی سے باہر متعدد بار نظر آنے والے تاروں بھرے آسمان کی طرف تکنے لگا پھر جب دوبارہ بولا تو اس کی آواز جیسے بدل کر ایک دم عجیب سی ہو گئی۔

"اماوس کی خاص راتوں میں...... جب...... جب...... ہاں، جب...... چاند اپنے پورے محاق پر ہوتا ہے تو میں یہاں آ کر بچار نے لگتا ہوں۔"

"کیوں...... اس کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے پوچھا لیکن وہ جیسے یہ کہتے کہتے کہیں کھو گیا تھا۔ اس کا چہرہ ہنوز کھڑکی کے بدلتا چوکھٹے کی طرف اٹھا ہوا تھا پھر چونک کر میری طرف دیکھا۔

"آں...... ہاں......" حلق سے آواز نکالی۔ "بڑی خاص وجہ ہے۔ وہی خاص نسلوں کے سانپوں کو پکڑنا پھر ان کا زہر فروخت کرتا ہوں، کیچلی بھی مہنگے داموں میں شہر کے حکیم لوگ خرید لیتے ہیں۔ اچھا گزارہ ہو جاتا ہے۔"

"ہمم۔" میرے منہ سے نکلا۔ "میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔"

"نہیں سنگت! اس پہر کدھر جائے گا۔ صبح ہو لینے دے۔ تیرا گوٹھ کون سا ہے اور تو نے تو ابھی اپنا نام بھی نہیں بتایا، نہ ہی یہ کہ تو یہاں تاریک جنگل میں کیا کرنے آیا تھا؟" اس نے کہا۔

"میرا نام راجا مراد علی ہے، پیار سے مجھے راجا بولتے ہیں۔ میں ادھر بیراجی علاقے کے کنارے واقع گوٹھ اللہ یار کا رہواسی (رہنے والا) ہوں۔ میرے ماں، پیو، وڈیرے سیفل خان کی رہاکی (کھیت مزدوری) کرتے تھے۔ جب میں صرف نو سال کا تھا تو پہلے باپ اور پھر ماں بھی مر گئی۔ مجھے ایک دور کے رشتے دار نے پالا۔ بس، ابھی تو میرے بارے میں قابلِ ذکر مختصر یہی کچھ ہے۔"

"تو کیا کرتا ہے...... رہاکی؟"

"نہیں، میں وڈیرے کا ڈرائیور ہوں۔ اس کی زمینوں پر ٹریکٹر چلاتا ہوں اور حویلی کے افراد کو بھی بوقتِ ضرورت لاتا لے جاتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے میرے چہرے پر اپنی نظریں جما دیں۔ "پر ابھی تک تو نے اصل بات نہیں بتائی۔" اس نے شاکی نظروں سے دیکھا۔

"وہ کیا؟"

"یہی کہ تو اس بن (جنگل) میں رات کے وقت اکیلا کیا کرنے آیا تھا؟" اس نے پوچھا۔ اس کے سوال پر میں نے ایک مجبورانہ قسم کی خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے ایکا ایکی چپ پا کر وہ دوستانہ انداز میں مسکرا کر میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"مراد علی! جب میں نے تجھے سنگت (دوست) کہہ دیا ہے تو پھر چھپانا کیا؟ اللہ سائیں، قسم کھاتا ہوں کہ مجھ سے تجھے کبھی دھوکا یا نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"میں بھی یہی قسم کھاتا ہوں۔" بے اختیار میرے منہ سے بھی نکلا اور اس نے دوستی کا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا جسے میں نے گرمجوشی سے تھام لیا۔

"چل، تیری مرضی، نہ بتا، پر آرام تو کر لے۔" وہ بولا۔

"نہیں، اب تو میں نے تجھے بتانا ہی ہے۔ شاید تو ہی میری مدد کر دے۔" میں نے قدرے ٹھہر کر کہا تو وہ دوست پروری سے بولا۔

"اب تو تیرے لیے جان بھی حاضر ہے۔ بھلے آزما کر دیکھ لے۔"

"سچائی کا دم بھرنے والے دوستوں کو آزمایا نہیں کرتے۔" میں نے بھی کراہت سے کہا۔

"ایک دم ٹھیک بولا۔ چل بتا پھر کیا معاملہ ہے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"شاید تجھے بات اتنی خاص نہ لگے لیکن میرے لیے خاص ہی سمجھ۔" کہتے ہوئے میں نے اسے مختصراً اس "چھن...... چھن" کرتی پراسرار آواز کے متعلق بتا دیا جسے میں گزشتہ متعدد کے کچھ دنوں میں سن چکا تھا۔ یوں بھی یہ کوئی اتنا لمبا چوڑا قصہ کب تھا۔ مجھے یقین تو تھا کہ وہ میری بات سن کر تعجب تو نہیں لگائے گا البتہ ہنسے گا ضرور لیکن میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ وہ ایک ٹک سا میری طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کا چہرہ بڑا یک بہ یک عجیب سا نظر آنے لگا پھر اس نے تفصیل سے پوچھا۔ میں نے بھی وہی کچھ بتا دیا جو میں سنتا چلا آ رہا تھا۔

"میں تیرے ساتھ ہوں، چل ابھی...... ادھر ہی چلتے ہیں۔" ذرا دیر بعد ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں...... میں نے اپنا تھیلا سنبھالا اور اس نے بین اور پٹاری۔ ہم جھونپڑی سے باہر آ گئے۔ رات نصف پہر میں ہلکورے لے رہی تھی۔ مرطوب ہوا میں قدرے تیزی محسوس ہونے لگی۔ ہر سو گہرا تاریک سناٹا، حتیٰ کہ دور قریب میں کسی جانور کے بولنے کی بھی آواز نہ آئی۔

ہم دونوں محتاط قدموں سے تاریک جنگل میں یوں چلے جا رہے تھے جیسے سب کچھ ہمیں نظر آ رہا تھا اور آتا بھی کیوں نہ، ہم دونوں ہی تو جانگلی تھے۔ ادھر ہی کے رہواسی،

urdunovels.com

یہیں پیدا ہوئے اور ادھر ہی پلے بڑھے۔ جنگل میں رہنے والے چھوٹے بڑے جانوروں کی بو باس سے آشنا تھے۔

میں نے دیکھا مجھ سے زیادہ علی گوہر جوش میں نظر آرہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی پر میں چپکا رہا پھر میں اسے انہی کھنڈرات کے قریب لے آیا۔ تاروں بھرے آسمان تلے، جنگل کے وسط میں، قدرے دریا کنارے..... کھنڈر کی شکل میں تقریباً کوئی پندرہ سو گز کے رقبے میں پھیلے یہ کھنڈرات عجیب تاثر پیش کرتے تھے اور اس سے زیادہ ہم دونوں کے ایک تک کھڑے وجود، جیسے کوئی دو بدروحیں ہوں اور اپنے ویران اور اجاڑ مسکن کو حسرت زدہ نظروں سے تک رہی ہوں۔ فضا میں کھنڈرات کی برسوں منہدم شدہ دیواروں سے عجیب باس اٹھتی محسوس ہو رہی تھی جو جنگل کی نباتاتی خوشبو میں رل مل کر اور ہی اثر پیدا کر رہی تھی۔

"کیا سب سے پہلے تجھے ادھر ہی سے وہ آواز سنائی دی تھی؟" معاً ہی میرے ساتھ مبہوت سے کھڑے علی گوہر نے پوچھا۔

"کچھ ٹھیک سے یاد تو نہیں لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ محاق کی ابتدائی تاریخوں کے ہی دن تھے، دوسرا یا تیسرا دن۔" میں نے جواب دیا۔

"بس، اب ایک آخری ثبوت مل جائے تو اس کی تصدیق ہو جائے گی۔" علی گوہر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کی نظریں بدستور کھنڈرات پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"کیسا ثبوت، کیسی تصدیق؟" میں نے الجھ کر پوچھا مگر اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا پھر ذرا ہی دیر بعد نہایت ہولے سے بولا۔

"تم کھنڈرات کے قریب جاؤ ذرا، ہو سکے تو اندر بھی داخل ہو جانا۔"

"تم نہیں آؤ گے؟ میں نے تو چند دن ادھر ہی رہنے کا عہد کر رکھا ہے، جب تک اس راز سے پردہ نہیں ہٹ جاتا۔" میں نے کہا۔

"جو میں نے کہا ہے، وہ کرو۔ میں بھی آجاؤں گا اور تمہاری مدد سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ تم دیکھو گے کہ میں صرف کچھ ہی لمحوں میں اس راز سے پردہ اٹھا دوں گا..... جاؤ۔"

میں آگے بڑھ گیا۔ ابھی کھنڈرات سے دو تین قدم ہی پیچھے تھا کہ اچانک وہی چھنچھناتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں رک گیا، پیچھے مڑ کر دیکھا۔ علی گوہر کو آنے کا اشارہ کیا۔ وہ جیسے اسی کا منتظر تھا۔ جھٹ سے میرے قریب آ گیا۔ چھن چھن کرتی آواز بدستور آرہی تھی مگر اس کے محرک اور مخرج کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

"تم سن رہے ہو علی گوہر! یہ آواز چھن..... چھن کرتی؟" میں نے کہا۔

"ت..... تم سن رہے ہو.....؟" اس نے الٹا مجھ سے پوچھا۔ اس کی آواز مجھے لڑکھڑاتی محسوس ہوئی۔

"ہاں، میں تو سن رہا ہوں مگر تم.....؟" مجھے حیرت ہوئی۔

"مجھے آواز نہیں آرہی، پر تو سنتا رہ لیکن خبردار! ادھر سے ہلنا بھی مت..... اب بتا آرہی ہے آواز؟" کہتے ہوئے اس نے جیسے تصدیق چاہی۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ پہلے تو مجھے لگا وہ مذاق کر رہا ہے مگر اس کے چہرے کے تاثرات اس قدر سنجیدہ اور متغیر سے تھے کہ مجھے یہ خیال رد کرنا پڑا۔ جواب میں بولا۔

"ہاں، ہاں علی گوہر! مجھے تو صاف آرہی ہے پر تجھے کیوں نہیں آتی۔ ذرا غور کر۔"

"مجھے یہ آواز کبھی سنائی نہیں دے گی اور نہ ہی کسی اور کو ماسوائے تیرے۔" وہ جیسے کسی فسوں تلے لہجے میں بولا پھر یکدم میرا بازو پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے بولا۔

"چل واپس..... میں جان چکا ہوں یہ کون ہے۔ تصدیق ہو چکی۔" وہ عجیب ڈرامائی لہجے میں بولا مگر میں نہ مانا، بولا۔

"نہیں علی گوہر! میں نے اس راز سے پردہ ہٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اس کا کھوج لگا کر رہوں گا۔ تو واپس چلا جا۔"

"اس راز سے پردہ ہٹ چکا۔ میں وعدہ کرتا ہوں تجھے سب بتا دوں گا۔" وہ ایک عجیب جوش سے بولا۔ "میں نے تیرا ساتھ دینے اور ساتھ رہنے کی قسم کھائی ہے سنگت! اور ہم جوگی فقیروں کی قسمیں جھوٹی نہیں ہوتیں نہ وعدے..... چل آ۔"

میں حیران پریشان سا اس کے ساتھ ہولیا۔ ہم تاریکی میں تیز تیز قدموں سے جھونپڑی کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اس سارے راستے علی گوہر نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جلد از جلد ان کھنڈرات سے دور اور اپنی جھونپڑی میں پہنچ جانے کے لیے بے چین ہو۔

ابھی ہم جھونپڑی سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھے کہ دفعتاً تاریک جنگل میں ایک کھنکھناتی سی آواز ابھری۔ یہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک فائر ہوا اور پھر ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ جس نے تاریک جنگل کے سکوت کو تھرتھرا ڈالا۔

☆☆☆

urdunovels.com

جامشورو (سندھ) میں دریائے سندھ کے کنارے واقع ایک گاؤں "اللہ یار" ہے۔ شہر کوٹری کے قریب ہونے کے سبب یہ جدید سہولیات سے آراستہ ہے۔ اسی تناسب سے گوٹھ اللہ یار میں تعلیم کا تناسب بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے لیکن بات وہی ڈھاک کے تین پات والی ہے اور وہ ہے ازلی غربت اور ازلی امارت......یعنی وہی بات کہ جو ازلی غریب اور بے کس ہیں اور جو ازلی امیر اور بااختیار ہیں، وہ ایسے ہی آج کے جدید دور میں بھی چلے آرہے ہیں۔ جدید ترقی نے کچھ نہیں بدلا۔ تب ہی یہ مقولہ سمجھ میں آیا کہ جو خود ہی کنوئیں کا مینڈک بنا رہے تو پھر اسے کون باہر نکالے؟

میرا باپ امیر علی گوٹھ کے ان ہزاروں لوگوں میں سے ایک تھا جو غربت کی چکی میں پس کر عمر سے پہلے قبر میں جا پہنچا۔ وہ ایک ہاری تھا۔ میری ماں بھی کھیت مزدوری کرتی تھی پھر ایک دن وہ بھی مرگئی۔ اسے چاولوں کی بوائی کے دوران دھوپ لگ گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا اسے ہیٹ اسٹروک ہوگیا ہے جس سے فوری جان چلی جاتی ہے۔

میری عمر اس وقت صرف نو سال تھی۔ میں بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا......یتیم و یسیر۔ پہلے تو ترس کھا کر کچھ دن مجھے مسجد کے پیش امام نے اپنے پاس رکھا لیکن پھر میرے ایک دور کے رشتے دار کے حوالے کردیا جو بے اولاد اور اکیلا تھا۔ پیش امام نے یہی سوچ کر کہ بڑا ہو کر میں اس کا سہارا بنوں گا، اس نے مجھے قادر بخش کے حوالے کردیا، کیونکہ خود پیش امام صاحب کا کنبہ بڑا تھا۔ اس کی اپنی عیال داری تھی۔

قادر بخش کو میں "ماما" کہتا تھا۔ وہ ایک اچھا اور محبت کرنے والا آدمی ثابت ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میری طرح دنیا میں وہ بھی تنہا تھا۔ ابھی تین چار سال پہلے ہی اس غریب کا سب کچھ اجڑ گیا تھا۔ اس کی بیوی تھی جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کی خالہ زاد بھی تھی۔ پہلے بچے کی پیدائش کے دوران بدقسمتی سے زچہ بچہ جانبر نہ ہو سکے۔ اس کے بعد وہ گم صم سا ہوگیا۔ کچھ عرصے تک تو وہ گھر سے باہر نہیں نکلا۔ نماز باقاعدگی سے ادا کرتا تھا پھر لوگوں اور بالخصوص پیش امام کے سمجھانے پر اس نے اپنی روکھی پھیکی زندگی کا وتیرہ بدلا لیکن دوسری شادی کا ارادہ آج تک نہ کرپایا۔ بچے اور بیوی کی قبر گوٹھ کے ہی قبرستان میں تھی جہاں وہ ہر روز شام میں اگربتیاں جلانے اور پھول نچھاور کرنے جایا کرتا۔

قادر بخش کی عمر پچاس سال ہوچکی تھی، صحت مند تھا، قد

جواب

ٹرین نہایت سست رفتاری سے چلی جارہی تھی۔ اس دوران میں گارڈ ایک کمپارٹمنٹ میں آیا اور بآواز بلند بولا۔ "جو مسافر بھاگ پورہ جارہے ہیں انہیں نہایت افسوس سے اطلاع دی جاتی ہے کہ بھاگ پورہ کا اسٹیشن جل کر تباہ ہوگیا ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی رہی پھر ایک مسافر امید افزا لہجے میں بولا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں...... جب تک ہم بھاگ پورہ پہنچیں گے، ان شاء اللہ اسٹیشن دوبارہ تعمیر ہو چکا ہوگا۔"

(مرسلہ: نازیہ سلطان، کوئٹہ)

کاریات

"آپ کا بیٹا پاؤں چلنا سیکھ رہا تھا۔ کیا اس نے چلنا سیکھ لیا؟"

"نہیں، ابھی تو وہ ڈرائیونگ سیکھ رہا ہے۔"

☆☆☆

"باجی! کل ڈیڈی کی سالگرہ ہے۔ اس سالگرہ پر ہم انہیں کیا تحفہ دیں؟"

"میرا خیال ہے اس سالگرہ پر ہم انہیں ان کی کار چلانے کا موقع دے دیں۔"

☆☆☆

"آپ نے کار کے ایک طرف نیلا اور دوسری طرف سفید پینٹ کیوں کروا رکھا ہے؟"

"تاکہ جب بھی ایکسیڈنٹ ہو، گواہوں کے بیانات میں تضاد پیدا ہو جائے۔"

☆☆☆

"ارشد کا دعویٰ ہے کہ موٹر سائیکل سوار نے ٹکر مار کر اسے عمر بھر کے لیے معذور کردیا ہے۔ وہ کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا۔ دراصل اس ٹکر سے اس کا وہ انگوٹھا ٹوٹ گیا ہے جس سے اشارہ کر کے وہ لفٹ لیا کرتا تھا۔"

(مرسلہ: عنبرین احمد، ساہیوال)

درمیانہ اور مزاجاً مرنجاں مرنج بن چکا تھا۔ وہ وڈیرے صیقل خان کے گورداسوں کا منشی تھا جسے "چھوٹا منشی" کہتے ہیں۔

میرے ساتھ قادر بخش نے خوب دل بہلایا تھا۔ میرا یوں خیال کرتا ہے جیسے میں اس کی سگی اولاد ہوں۔ میں بھی اس سے مانوس ہو گیا تھا۔ وہ اچھا کماتا اور اچھا کھاتا تھا اسی لیے مجھ پر اس کی خوش خوراکی کا خاطر خواہ اثر پڑا۔ میں نے خوب قد نکالا تھا اور سینہ کشادہ تھا۔ بچپن میں میری رنگت گہری سانولی تھی لیکن تو جوانی میں یہ رنگ عجیب ہی انداز میں نکھر کر سامنے آیا۔ شاید یہ جوانی کا رنگ تھا۔ خالص خوراک نے مجھے نکھار دیا تھا۔

گھنے گھنگرالے بال، بڑی روشن سیاہ چمکدار آنکھیں اور باریک مونچھیں مجھے خوب جچتی تھیں۔ میں بھی ان میں خوب تیل چپڑ کر باہر نکلا کرتا تو آتی جاتی گوٹھ کی لڑکیاں اور عورتیں ایک نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھتی ضرور تھیں اور پھر پنگھٹ پر جانے کا کبھی اتفاق ہوتا تو نوجوان لڑکیاں مجھے دیکھ کر خواہ مخواہ ہی ہنسنے لگتیں اور معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو کہنیوں کے ٹھوکے مارتیں۔ ایک کی تو سرسراتی ہوئی سرگوشی میری سماعتوں سے ٹکرا ہی گئی جو وہ میرے بارے میں اپنی پنگھٹ کی سکھی سے کہہ رہی تھی۔

"یہ مچھندر کچھ کماتا بھی ہے یا ملاکھڑ پہلوانوں کی اکھڑیاں نکالے اصیل مرغ کی طرح اینڈتا پھرتا ہے؟"

دوسری بولی۔ "صحت دیکھ کر تو یہی نظر آ رہا ہے کہ کھاتا خوب ہوگا پر کمانے کا پتا نہیں۔" اس پر وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

مجھے ان کی جگت بازی پر غصہ آ گیا۔ میں لیے دیے رہنے والا لڑکا تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر ایک پتھر اٹھایا اور اس کا مٹکا پھوڑ ڈالا۔ وہ سب کورس میں چلا اٹھیں۔

جب میں بچپن میں پیش امام کے ہاں رہتا تو وہاں میں قرآنی تعلیمات حاصل کرتا تھا مگر اسکول نہیں جایا کرتا تھا لیکن ماما قادرے کے پاس آتے ہی اس نے مجھے اسکول جانے کی بھی ترغیب دی کہ دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم بھی ضروری ہے۔ سو، یوں میں نے گوٹھ میں پرائمری تک پڑھا، ہائر سیکنڈری اسکول جامشورو میں بھی داخلہ لیا۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ماما بھی میرے شوق پر خوش تھا کیونکہ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ میں پڑھ لکھ لوں۔ کم از کم دنیا کا چال چلن تو سیکھ لوں۔ بقول ان کے، انسان اسکول میں صرف تعلیم ہی نہیں سیکھتا اور بھی بہت کچھ اسے سیکھنے کو ملتا ہے جو آگے عملی زندگی میں کام آتا ہے۔ یوں میں نے میٹرک کر لیا پھر انٹر اور گریجویشن کرنے لگا۔ ماما نے غلط نہیں کہا تھا، اسکولوں اور کالجوں میں آدمی صرف پڑھائی نہیں اور بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ سب سے پہلے مجھے یہاں شہر میں اپنے بارے میں پتا چلا۔ جب اپنے بارے میں معلوم ہوا تو خود بخود دوسروں کا بھی ادراک ہوتا چلا گیا۔

کھلی ڈلی شلوار قمیص، ٹائٹ پینٹ شرٹ میں بدلنے لگیں جو مجھ پر خوب جچتی تھیں لیکن میں انہیں کالج اور شہر تک ہی محدود رکھتا تھا۔ گوٹھ پہن کر آتا تو لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے اور مجھے کوفت ہوتی کیونکہ یہاں تو لوگ نیچے لاک (تہبند) اوپر صدری (کھلی ڈلی واسکٹ) یا پھر بڑے گھیر والی شلوار اور کھلی سی قمیص کرتہ پہنتے۔

گوٹھ میں رہنے والوں کو شہر کے لوگ کچھ اور ہی سمجھتے تھے۔ یوں میں ان کی بھی بود و باش اختیار کرنے لگا۔

میں نے بھلا اور کیا پڑھنا تھا۔ بس، زمانے کا رکھ رکھاؤ سمجھ لیا۔ اسے ہی میں نے بہت سمجھا۔ آرٹس میں گریجویشن کرنے کے بعد میں گھر آ بیٹھا مگر کالج کی زندگی مجھے یاد آتی۔ تاہم گوٹھ بھی جو میرا اصل تھا، اس سے تو مجھے پیار تھا۔ میں اب بیکار تھا اور اس سے مجھے کوفت ہونے لگی۔ میں شہر یا گاؤں میں کوئی کام کرنا چاہتا تھا۔ البتہ ماما بہت خوش تھا اور لوگوں کو فخر سے بتایا کرتا کہ میرا راجا پڑھا لکھا ہو گیا ہے۔

"ماما! بہت ہو گیا۔ اب مجھے بھی کہیں دھندے سے لگا دے۔" میں نے ایک دن ماما قادرے سے کہہ دیا۔

وہ پہلے حیرت سے پھر مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اڑے راجا، میرے شہزادے! تجھے بھلا کمانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا مجھ سے کوئی کمی رہ گئی ہے؟"

"مذاق نہ کر۔ میں کیا، تو خود بھی جانتا ہے کہ تو نے مجھے ہمیشہ باپ کی شفقت دی، ماں کی طرح دیکھ ریکھ کی میری۔ میرے غریب اور سگے ماں، پیو بھی یہ سب نہیں کر سکتے تھے۔" میں نے کہا تو وہ مسکرایا۔

اس وقت شام تھی۔ ہم کچے مگر کشادہ صحن میں چوڑے اور موٹے پایوں والی بان کی چار پائی پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں تو پاؤں جھلائے بیٹھا تھا جبکہ ماما سامنے والی چار پائی پر گاؤ تکیے سے پشت لگائے بیٹھا تھا۔ شام میں یہاں بیٹھنے سے پہلے میں تازہ پانی کا چھڑکاؤ کر دیا کرتا تھا تاکہ ٹھنڈک رہے۔ ہمارے عقب میں دو کمرے تھے۔ ایک ماما کا اور دوسرا میرا تھا۔ کونے میں کھرل تھے دو بھینسیں کھرلی میں منہ ڈالے ہوئے تھیں، ساتھ ان کا بچھڑا

بھی تھا۔ ایک طرف مرغیوں کے چوبی دڑبے تھے۔

''اچھا بتا، کیا کام کرنا چاہتا ہے؟'' بالآخر ماما قدرے سنجیدگی سے بولا۔

اسے راضی ہوتے دیکھ کر میں فوراً اٹھا اور اس کی ٹانگیں دباتے ہوئے بولا۔ ''ماما! تو نے بہت کام کیا، مشقت بھی کی، اب آرام کر اور مجھے کام کرنے دے۔ یہی ایک جوان مرد کی شان ہوتی ہے۔ دیکھ، تو مجھے اپنی جگہ چھوٹا منشی رکھوادے یا پھر میں شہر جاکر کوئی نوکری ڈھونڈ لیتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں اس کی ٹانگوں کو دباتا رہا۔ ماما نے میری طرف کچھ تیز سی نظروں سے گھورا لیکن اس میں باپ جیسی شفقت کی گرمی تھی۔

''اوئے، تو کیا مجھے گھر ڈال کر بیمار کردینا چاہتا ہے۔ تجھے میں چلتا پھرتا اچھا نہیں لگ رہا؟''

''نہیں ماما! بیمار ہوں تیرے دشمن۔ میں تو......!''

''اچھا اچھا، ٹھیک ہے، کل میں وڈے منشی اصغر علی سے بات کروں گا۔ دیکھیں کیا کہتا ہے وہ۔'' ماما بولا۔

''او ماما...... میرے اچھے ماما! سدا جیو۔'' میں نے خوشی سے نعرہ بلند کیا اور دوبارہ جلدی جلدی اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔ وہ میری محبت پر مسکراتا رہا۔

''بس' تو کل ہی بات کرلے پھر۔''

''چنگا، چنگا۔ اب چاپلوسی چھوڑ، بہت زور دے دیا۔'' ماما مسکرایا۔

میں بھی ہنس کر بولا۔ ''تیری تو مجھے چاپلوسی کرنے میں بھی مزہ آتا ہے ماما! بالکل اسی طرح جیسے کوئی بچہ اپنی بات منوانے کے لیے اپنے بابا کی معصومانہ چاپلوسی کرتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' ماما نے کہا۔

اگلے دن صبح تڑکے ماما اور میں گھر سے نکلے۔ کھیتوں، کھلیانوں اور بیل کھاتے کے راستوں میں سحر خیزی اتری بھلی معلوم ہورہی تھی۔ دور بابا ملنگ کے آٹے کی چکی کی مخصوص آواز آتی رہی۔ جب ماما نے وڈیرے کے گوداموں کی طرف جانے کے بجائے قبرستان کی راہ لی تو میں قدرے چونکا کیونکہ ماما قبرستان صرف جمعرات یا جمعے کو جایا کرتا تھا، وہ بھی صبح سویرے نہیں، جیسا کہ مذکور ہوا، سہ پہر یا شام میں۔

''ماما! خیریت ہے، آج صبح صبح ہی قبرستان؟ اور پھر آج تو منگل وار ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، یار راجا! تیری میٹھی میٹھوی مامی رات مجھے خواب میں آئی تھی۔ چپ چپ تھی بیچاری۔'' ماما بظاہر نارمل لہجے میں بتانے لگا لیکن میں محسوس کرسکتا تھا کہ اس کی آواز ایک گم گشتہ درد کی کسک سے بوجھل ہورہی تھی۔ سو، میں چپ ہورہا۔

''پتا ہے راجا! اگر تیری مامی زلیخاں آج زندہ ہوتی نا، تجھ سے بھی وہ بہت پیار کرتی، بالکل میری طرح۔''

''مجھے پتا ہے ماما!'' میں نے پوری سچائی اور محبت سے کہا۔ ''جب تو مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے تو بھلا مامی کیوں نہ کرتی۔''

''یہی بات ہے راجا! زلیخاں واقعی بہت محبت کرنے والی خاتون تھی۔'' ماما ایک گہری سانس بھر کر بولا۔ ''وہ سب سے ہمدردی رکھتی تھی۔ اس کا خلوص تو پورے گوٹھ میں مشہور تھا۔ آڑے ٹیڑھے وقت میں وہ سب کے کام آنے کی کوشش کرتی، کبھی کسی سے گلا نہیں کیا۔ میرا تو بہت خیال رکھتی تھی، بہت چاہتی تھی مجھے...... ہم تھے بھی تو بچپن کے ساتھی مگر تقدیر کو جانے کیا منظور تھا کہ بس......''

ماما کا دل بھر آیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ ہی چل رہا تھا۔ بے اختیار میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ دھر لیا۔ ''حوصلہ کر ماما! پتا ہے ایسے نیک لوگ سیدھا جنت میں جاتے ہیں۔''

وہ آنسو پونچھنے لگا۔ میں نے پھر زیادہ بات نہ کی۔ وہ مامی کے ذکر پر دکھی ہوجاتا تھا۔ اگرچہ کوشش میری بھی یہی تھی کہ ماما دوسری شادی کرلے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ماما کو یہ غم ناسور کی طرح نہ لگ جائے۔ دوسری عورت آجائے گی، بال بچہ ہوگا تو ماما سب بھلادے گا اور ایک نئی زندگی شروع کرے گا۔ ماما قادرے کے چند ایک قریبی اور اچھے دوست جن میں مسجد کے پیش امام بھی تھے، مجھ سے کہا کرتے تھے کہ ماما مجھ سے بہت زیادہ مانوس ہوچکا ہے اور مجھے اپنے بیٹے ہی کی طرح سمجھتا ہے تو میں اسے کسی طرح دوسری شادی پر راضی کرلوں اور میں نے ایسا کرنے کی کوشش کی بھی تھی لیکن وہ ایک بار تو ماما مجھ سے ناراض ہی ہوگیا تھا۔ میں بھی پھر چپ ہورہا۔ کیا کہتا اور...... بہرحال، اللہ سائیں سے دعا ضرور کرتا رہتا کہ ماما کو مامی زلیخاں جیسی ہی اچھی دوسری بیوی عطا کردے۔

بہرکیف، ہم قبرستان پہنچے، فاتحہ پڑھی اور پھر ڈیرے پر آگئے۔ ڈیرے پر چند ہی لوگ نظر آئے۔ شاید صبح کا وقت تھا ورنہ یہاں سہ پہر یا شام کو زیادہ لوگ ہوتے تھے۔ چھوٹے منشی کی حیثیت سے تو ماما قادر بخش کو سب ہی جانتے تھے۔ ماما نے ان سے وڈے منشی اصغر علی کے بارے

سے پوچھا۔ کسی نے بتایا کہ وہ اپنے گھر پر ہے اور اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔

ہم اس کے گھر کی طرف چل دیے لیکن راستے میں رک کر ماما نے کچھ سوچ کر مجھ سے کہا۔ ”راجا! تو ایسا کر، گھر لوٹ جا۔ میں خود ہی اس سے خیر خیریت کر کے آتا ہوں اور تیری نوکری کی بھی بات کرلوں گا۔“

”تیری مرضی ماما! جیسے تو کہے۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا اور جانے لگا تو ماما نے مجھے آواز دے کر روک دیا پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے وڈے منشی کے ہاں لے جانا بھی چاہتا تھا اور نہیں بھی۔ بس، اسی کشمکش میں تھا۔

”یار! تو چلا ہی چل میرے ساتھ۔ اچھا ہے وہ بھی تجھے دیکھ لے گا۔ بات زیادہ اچھی ہوجائے گی۔“ وہ بولا۔ میں مسکرا کر اس کے ساتھ ہولیا۔

سارے راستے ماما کو میں نے الجھا ہوا ہی پایا جس کی توجیہہ میں نہ نکال سکا کہ آخر ماما مجھے وڈے منشی کے گھر لے جانے سے کیوں کترا رہا تھا۔

چھوٹا سا ہی تو گوٹھ تھا۔ پیدل ہی ہر جگہ آیا جایا جاسکتا تھا۔ چند گام کے بعد ہم ایک نسبتاً کشادہ سے مکان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ دروازے پر موٹا پردہ جھول رہا تھا۔ اسے ہٹا کر ماما نے دستک دی۔ چوبی دروازے کی کھڑکھڑاہٹ اندر تک گونجی پھر ذرا دیر بعد ہی ایک نسوانی آواز ابھری۔

”کون ہے؟“

ماما یکدم چپ ہو رہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ مجھے کن انکھیوں سے تکے جا رہا تھا پھر یکدم گڑبڑا کر بولا۔ ”وہ...... وہ...... ادا اصغر علی سے ملنا تھا۔ سنا ہے وہ بیمار ہے۔ آج ڈیرے پر بھی نہیں آیا۔“

مجھے حیرت ہوئی کہ ماما نے اپنا نام بتانے کے بجائے سیدھا یہ سب کہہ ڈالا۔ کیا اسے معلوم تھا کہ آواز دینے والی اس کی آواز سن کر پہچان جائے گی؟ اور دوسرا یہ کہ ماما کو یوں عجیب عجیب برتاؤ کرتے دیکھ کر میں تو بدستور حیرت میں ہی مبتلا رہا تھا۔

یہی بات تھی کیونکہ اس کی آواز پہچانتے ہی اندر سے یکدم دروازہ کھول دیا گیا اور نہ صرف کھول دیا گیا بلکہ ”اندر والی“ نے بھاری سا پردہ بھی ہٹا دیا۔ ماما تو گھبرایا ہی، خود میں بھی ٹھٹکا سا گیا۔ اگلا لمحہ مزید متحیر کرنے والا ثابت ہوا مگر صرف میرے لیے، ماما کے لیے نہیں کیونکہ ایسا ہی لگا تھا جیسے وہ اس کا عادی ہوچکا ہو۔

سامنے ایک گٹھری سی تیکھے نین نقوش والی خاتون جو خوب گوری چٹی بھی تھی، دروازے پر کھڑی دکھائی دی۔ اس کی آنکھیں خوب گہری اور سرمگیں تھیں۔ پیلے اور سرخ رنگ کے شیشے کے کام اور خوبصورت کڑھائی والے کپڑے، بھرے بھرے سے گلابی ہونٹ جن پر دودھ جیسے سپید دانت اسے بہت دلکش بنائے ہوئے تھے۔

عورت نے ایک نگاہ مجھ پر اور پھر ماما پر ڈالی تو اس کے چہرے پر شوخ سی مسکراہٹ عود کر آئی۔

”وہ...... وہ...... یہ میرا......“ ماما کچھ بوکھلا سا گیا۔

”راجا ہے۔“ عورت نے یکدم کھلکھلاتی ہنسی کے ساتھ اس کا جملہ مکمل کردیا۔

”ہیں؟“ ماما کے منہ سے ہونقوں والے انداز میں برآمد ہوا اور میری طرف دیکھ کر اس نے ہولے سے اضطراری عالم میں نفی میں جنبش دی تو ناچار مجھے بھی دینا پڑی پھر یکدم ماما نے سر کو اثباتی جنبش دی اور میں نے بھی یہی کیا۔ ہم دونوں ہی بوکھلا گئے تھے۔

اس دلکش سی عورت کے بارے میں پہلے تو میرا اندازہ یہی ہوا کہ وہ شاید وڈے منشی کی بیوی ہو مگر وڈے منشی کی عمر اور اس عورت کی عمر میں واضح فرق تو تھا ہی مگر یہاں یہی کچھ ہوتا تھا۔ پھر مجھے اس کی بیٹی کا شبہ ہوا۔ اسے بھی رد کرنا پڑا کیونکہ خاتون کا ”ڈول“ اور کچھ بڑھی ہوئی عمر اس سے لگا نہیں کھا رہے تھے۔ میں خود ہی الجھ پڑا۔

وہ عورت میٹھی میٹھی مسکراہٹوں سے ماما قادر بخش کو تک رہی پھر آہستگی سے بولی۔ ”آجاؤ اندر، ادا اصغر کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔ تم بھی آجاؤ۔“ آخر میں اس خاتون نے مجھے بھی ملائمت آمیزی سے کہا۔

وڈے منشی کو اس عورت کے ”ادا“ (بھائی) کہنے پر عقدہ کھلا کہ وہ اس کی بہن تھی۔

ہم اندر آگئے۔ منشی ایک کمرے میں صاف ستھری رلی بچھی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہم سے بڑے تپاک سے ملا، روایتی انداز میں خیر خیریت پوچھنے کا تبادلہ ہوتا رہا۔

”بھا اصغر! تیری طبیعت کو کیا ہوا؟ کل تو تو بھلا چنگا تھا۔“ ماما نے بے تکلفی سے مسکرا کر پوچھا۔

”اوے یار! بس، دھوپ لگ گئی تھی، بخار نے آن لیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”اب لسی پانی پیا ہے تو کچھ طبیعت چنگی ہوئی ہے۔“

...وڈیرے منشی ... کبھی دعا سلام ہو۔

آج تفصیل سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اندازہ ہوا دونوں کے درمیان خاصی دوستانہ بے تکلفی تھی۔ اس دوران ریشماں آتی جاتی رہی، کبھی پانی کے بہانے اور کبھی کسی کے بڑے بڑے گلاس تھمانے کے لیے۔ ریشماں، ماما سے پردہ نہیں کر رہی تھی۔ ماما اس سے نظر چرانے کی کوشش کر رہا تھا یا نظر ملانے کی۔

میری نوکری کی بات ہو گئی۔ اصغر نے مجھے کل بلا لیا تھا ڈیرے پر۔ وہ مجھے ٹریکٹر ڈرائیو بھرتی کرنے کا عندیہ دے چکا تھا۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو صحن میں آگے میں تھا اور پیچھے ماما۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ماما ریشماں سے ٹکرا کر چل رہا تھا اور وہ اس کی قمیص کا کونا پکڑنے کی کوشش میں تھی۔ مجھے متوجہ دیکھ کر دونوں سٹ گئے۔

ہم باہر آ گئے۔ ماما نے یوں گہری سانس کھینچی جیسے سکون مل گیا ہو۔

''ماما......! مجھ پر تو آج ایک اہم راز کھلا ہے۔'' میں نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیسا راز؟'' ماما نے مجھے گھورا۔

''اچھا یہ تو بتا، یہ وڈے منشی کی بہن ریشماں اتنی بڑی عمر کی ہونے لگی ہے، کیا ابھی تک اس کی شادی وادی نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوئی تھی، مگر بیچاری کی قسمت...... چھ سالوں بعد شوہر کو کالا یرقان ہو گیا اور وہ چل بسا۔ ماں مر چکی ہے، اب بڑے بھائی کے گھر آ گئی ہے۔'' ماما نے بتایا۔

''ماما! ویسے اچھی خاتون ہے، کیسے تمہاری خدمت کر رہی تھی۔ کچھ ایسا لگتا ہے وہ تجھے پسند بھی کرتی ہے۔''

''پاگل عورت ہے۔'' ماما نے موضوع بدلنے کی غرض سے مختصراً کہا۔

''پاگل نہیں ہے ماما! عقلمند ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بھلا جس عورت کا انتخاب تم ہو ماما، وہ پاگل ہو سکتی ہے؟''

ماما نے مجھے رک کر گردن موڑ کر دیکھا۔ ''اڑے، تو اپنی نوکری لینے گیا تھا یا میرا اسنگ (رشتہ)؟''

''ماما! کیا خرابی ہے، اگر تو شادی کر لے تو۔'' میں نے کہا۔ درحقیقت میں خود بھی چاہتا تھا کہ ماما کی ایک تو تنہائی دور ہو اور دوسرے اس کے جو زخم لگا تھا، وہ دھل جائے۔ مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ ریشماں، ماما میں دلچسپی رکھتی تھی اور یہ ''چھیڑ چھاڑ'' کا کھیل نیا نہیں تھا مگر ماما کتراتا تھا۔

وہ ماما کے گلے کا ہار بننے کی کوشش کرتی تھی۔ جب ہی ماما کی یہاں میرے ساتھ آنے سے الجھن سمجھ میں آ گئی۔

بہر کیف، ماما نے جواب نہ دیا اور چل پڑا۔ میں بھی چپ ہو رہا۔

القصہ، میں ٹریکٹر ڈرائیور بن گیا۔ مجھے یہ جاب اچھی لگی۔ ٹریکٹر روسی تھا اور آرام دہ۔ اس کا کیبن اے سی والا تھا۔ بڑی ٹھاٹ والی نوکری تھی۔ جب پہلی تنخواہ ملی تو میں نے سب سے پہلے حیدرآباد جا کر ماما اور اپنے لیے شاپنگ کی۔ ماما کو اس کی اصل والی چٹی قمیص، اجرک اور شیشوں کے کام والی سرخ ٹوپی خرید کر دی۔ جوتے، کپڑے بھی لیے۔ دو عدد اچھے والے اسمارٹ فون بھی خریدے۔ اس سے پہلے ماما کے پاس سادہ سیل فون تھا۔ میں تو کالج کے دور سے ہی استعمال کرنے لگا تھا۔ اگرچہ وہ سیکنڈ ہینڈ تھا، چاہتا تو ماما مجھے خرید کر دلا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ ماما اس فون کو دیکھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ میں نے اسے ایک دن میں ہی استعمال کرنا سکھا دیا اور واٹس ایپ، آئی ایم او وغیرہ بھی بنا کر دے دی۔ نیٹ وغیرہ کے لیے کیبل والی جالی گھر پر لگوا دی۔ فون پر بھی میں مہینے بھر کا پیکج لوڈ کر لیتا تھا تاکہ گھر سے باہر بھی ''موبائل ڈیٹا'' کے ذریعے نیٹ سے لنک رہے۔

غرضیکہ اب زندگی میری ڈگر پر آ گئی تھی۔ ایک دن وڈیرے سیفل خان کے ڈرائیور کو سانپ نے ڈس لیا۔ چونکہ وہ ان کا ذاتی ڈرائیور تھا، اسی لیے فوری علاج کے لیے اسے حیدرآباد اور پھر کراچی کے اسپتال لایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکا۔

دوسرا ڈرائیور رکھا تھا مگر وہ وڈیرے کو پسند نہ آیا۔ اس کی ڈرائیونگ اسے اچھی نہیں لگی تھی پھر ایک دن وڈے منشی اصغر نے مجھے فون کیا۔ میں اس وقت اپنا کام وقت سے چند گھنٹے پہلے ہی ختم کر چکا تھا اور ٹریکٹر گودام کے گیراج میں لگا کر گھر کی راہ لینے لگا تھا کہ فون کی بیل بجی۔

''اڑے راجا! تو ٹریکٹر کسی اور کے حوالے کر کے فوراً حویلی پہنچ، بجوا (جلدی)۔''

''میں فارغ ہو چکا ہوں، ابھی ٹریکٹر گیراج میں کھڑا کیا ہے۔ مگر کیوں چاچا؟'' میں اصغر علی کو چاچا کہنے لگا تھا۔

''بس ٹھیک ہے، پھر جلدی سے حویلی آ جا۔''

''خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں، ہاں۔ وہ دراصل......!'' پھر رک کر اصغر علی بولا۔ ''یہ بتا تو ٹریکٹر تو چلا ہی لیتا ہے مگر گاڑی شاڑی چلاتے

کا تو تجربہ ہو گا ہی تجھے؟"

"ہاں چاچا! کالج کے دور میں اپنے دوستوں کی جیپ کار چلا ہی لیتا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں، جو آدمی ٹریکٹر جیسی بلا کھینچ لے، اس کے لیے بھلا کار... کیا حیثیت رکھتی ہے۔ چنگا، تو نکل اور وہاں رحیم داد سے مل لے۔"

آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں حویلی کی طرف جا رہا تھا اور آج تک میں نے صرف وڈیرے فیصل خان کو ہی دیکھا تھا۔ ایک آدھ بار اس کے بڑے بیٹے بہرام خان کو بھی جو شادی شدہ تھا یا پھر چھوٹے بیٹے حاصل خان کو، جسے اکثر میں امیر کبیر رئیس زادوں کے ساتھ بلیک ہڈ والی اسپورٹس جیپ یا بڑی سی گاڑی میں دیکھ لیا کرتا تھا۔ باقی حویلی کے کتنے فیملی ممبرز تھے، مجھے اس کا علم نہیں تھا، نہ ہی میں نے اب تک کبھی ماما سے پوچھنے کی ضرورت سمجھی۔ اسی لیے دل تھوڑا گھبرا بھی رہا تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی ادنیٰ آدمی کا دربار شاہی میں بلاوا آ گیا ہو۔

بہرکیف، میں نے سوچا ماما کو بتا دوں۔ یہ ماما کی مجھے تاکید بھی تھی کہ میں ہر بات سے انہیں مطلع ضرور کرتا تھا اور پھر یہ تو حویلی کا بلاوا تھا۔

"چنگا، چنگا۔ چلا جا، ضرور چلا جا۔" وہ فون پر بولا۔

"پر ذرا دھیان رکھنا اور مؤدب رہنا۔ وڈے لوگ ہیں، ناز نخرے والے بھی۔ میرا خیال ہے فیملی ساتھ ہو گی۔ سائیں وڈے کی لاڈلی اولاد ہے۔ تم بس خادم کی طرح رہنا، ہر حکم بجا لانے کی کوشش کرنا۔" وہ آگے دھیمے لہجے میں کہنے لگا اور میں غور سے اس کی بات سنتا رہا۔ "ایک بات اور سن......"

وہ اتنا کہہ کر ذرا چپ ہوا لیکن پھر جیسے کچھ سوچ کر بولا۔ "اچھا چھوڑ، لیکن......" کہتے کہتے وہ خود ہی الجھ گیا۔ لگتا تھا وہ پریشان تھا مگر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وڈیرے کا حکم تھا اسی لیے شاید کچھ زیادہ بھی نہیں کہنا چاہ رہا تھا۔ تب میں نے ہی اسے کریدا۔

"ماما! تو اتنا پریشان کیوں ہو گیا؟ بات کیا ہے، کھل کر کہہ تاکہ میں تیری ان سب باتوں کا خیال رکھ پاؤں گا نا۔"

"بہت چالاک ہو گیا ہے تو۔" ماما ہنسا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "بس یار! تو بھی جوان خون ہے اور وہ بھی جاگیردار ... بس خیال رکھنا۔" وہ دراصل مجھے یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ تو ... ذاتی معاملات میں پڑنے کی کوشش ہرگز مت ... پھر پورا ورد دیا۔

"... مجھے یہ ضرورت ہے ان کے ذاتی معاملات میں پڑنے کی ماما! پر بات اب بھی مجھے کچھ اور لگی ہے، تو کھل کر کیوں نہیں کہتا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں، بس تو جا۔" کہتے ہوئے ماما نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کا مطلب تھا ضرور ادھر کچھ ایسی بات تھی جو مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی۔ خیر، میں نے سر جھٹک کر خود سے کہا۔ "اگر ایسا تھا بھی تو مجھے کیا۔"

میں سیدھا حویلی پہنچا اور رحیم داد سے ملا۔ وہ ایک دبلا پتلا مگر پھرتیلا شخص تھا۔ ماما ہی کی عمر کا تھا اور خاصا سنجیدہ گرو دکھائی دیا۔ پہلے تو اس نے نیچے سے اوپر تک مجھے بڑے غور سے دیکھا پھر ہولے سے مسکرا کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

"لگتا ہے اس قادرے نے تجھے پکا کر کے بھیجا ہے۔"

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ ماما قادرے نے مجھے اچھی بہت سمجھا بجھا کر بھیجا تھا کہ مجھے کس تیاری کے ساتھ جانا ہے کیونکہ حویلی والے کراچی میں کسی بڑے بیوروکریٹ کے ہاں دعوت پر جا رہے تھے اور یہ ایک بڑی دعوت تھی جس میں شہر کے بڑے بزنس مین، گورنمنٹ آفیسرز ہی نہیں سیاسی شخصیات بھی مدعو تھیں اور ظاہر ہے اسی مناسبت سے ان کا شوفر بھی ویسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ سو، میں نے بھی اسی طرح کی تیاری کر رکھی تھی۔

کار ڈرائیور کی ہلکی ڈارک اینڈ بلیکش براؤن پتلون، کافی کلر کی فٹ شرٹ جو میرے کسرتی اور دراز قامت وجود پر خوب جچ رہی تھی، پیروں میں بوٹ تھے۔ گوٹھ میں اور بھی میرے جیسے ہی کسرتی جسم اور دراز قامت نوجوان تھے اور وہ بھی میری ہی طرح چند کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے بھی تھے جو شہر میں تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے اور گوٹھ میں تو شلوار قمیص پہنا کرتے لیکن شہر کالج جاتے وقت پینٹ شرٹ چڑھا لیتے۔ البتہ میری ان سے ہٹ کر کچھ اور ہی وجاہت تھی اور اسے چار چاند میرے گھنے سیاہ بالوں نے لگا دیے تھے۔ وہ میں نے اس قدر دراز رکھے تھے کہ مجھے پیچھے کی طرف پونی نما چھوٹی سی چوٹی باندھنا پڑتی۔ یہ میرا اسٹائل ہوتا۔ کبھی کھلے بھی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ یوں گوٹھ اور شہر کی بود و باش نے میری شخصیت کو کچھ الگ انداز میں ایک ایسی کشش عطا کر ڈالی تھی کہ اس کا اظہار گوٹھ کے کم مگر شہر میں کالج فیلوز اکثر کیا کرتے تھے۔

بہرکیف، چاچا اصغر علی میرا جائزہ لینے کے بعد چابیوں کا ایک گچھا میری طرف بڑھاتے ہوئے مزید بولا۔ "یہ گاڑی نکال لا، ادھر گیراج میں کھڑی ہے۔"

نے حویلی کے قریب ہی بڑی سی اوطاق کی طرف اشارہ کیا جہاں تین چار بڑے بڑے گیراج بنے ہوئے تھے۔ میں گاڑی نکال لایا اور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔

''وڈے بھوتار سائیں اور ان کی فیملی کراچی جا رہے ہیں۔ وہاں ایک بڑے سرکاری آدمی (بیوروکریٹ) کے گھر بڑی دعوت ہے۔'' رحیم داد بتانے لگا۔ ''بہت احتیاط سے گاڑی چلانا۔'' پھر ایک لمحہ خاموشی کے بعد الجھے ہوئے لہجے میں آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

''پتا نہیں تو کیسا ڈرائیور ہے، چلاتا تو ٹریکٹر ہے۔ کمبخت یہاں اور کوئی اور بھی ایسا نہیں۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''اڑے چھوکرا! تجھے گاڑی چلانے کا تو تجربہ ہے نا؟''

''جی سائیں! کیوں نہیں۔ میں کالج کے دور میں اپنے دوستوں کی گاڑیاں چلاتا تھا اور کئی بار سیر و تفریح کے لیے کراچی بھی جا چکا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا!'' رحیم داد مطمئن نظر آنے لگا۔ ''اصغر علی نے تیرے بارے میں بتایا تو تھا کہ تو خاصا ہوشیار اور سیانا ہے۔ ٹھیک ہے پھر۔ بس، ابھی یہ لوگ باہر آنے والے ہیں، تو جب تک گاڑی کا آئل پانی چیک کر لے۔''

میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے اسے بتا دیا کہ وہ میں پہلے ہی ''ٹاپ آف'' کر چکا تھا۔ وہ اندر بتانے چلا گیا۔ میں باہر ہی کھڑا حویلی کی بلند و بالا عمارت کو تکنے لگا۔ یہ میری غیر اختیاری حرکت تھی کہ دفعتاً میں چونکا۔

☆☆☆

تاریک اور سنسان جنگل میں چلتے گاڑی کے انجن کی آواز پھر گولی چلنے کا دھماکا اور ساتھ ہی کسی لڑکی کی چیخ نے ہم دونوں کو ہی بری طرح ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''یہ کی...... یہ کیا ہوا؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلتے ہوئے برآمد ہوا جبکہ علی گوہر بھی چونک کر رک گیا پھر کاٹ لہجے میں زیر لب بڑبڑایا۔

''رات...... گاڑی، فائر...... اور لڑکی...... شکار۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' میں نے الجھ کر سرگوشی میں کہا۔

''ہاں...... کسی نے لڑکی کا شکار کیا ہے۔'' علی گوہر سنسناتے لہجے میں بولا تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں آج سے پہلے کبھی ایسے حالات کا شکار نہ رہا تھا۔

رات کے سناٹے میں گاڑی کے انجن کی آواز بدستور ہمارے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ پھر ادھر ادھر تاریکی میں دیکھنے کے دوران ہی مجھے اپنے بائیں جانب اور قدرے سامنے سے تیز روشنی چمکتی نظر آئی۔ یہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ علی گوہر نے یکایک میرا بازو پکڑا اور ایک موٹے تنے والے درخت کے عقب میں آ گیا۔

گاڑی کچھ آگے آ کر رک چکی تھی۔ میں بغور آنکھیں سکیڑ کر اس طرف دیکھنے لگا۔ تاریکی میں دیکھنے کا تو میں بھی عادی ہی تھا لیکن چونکہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس نہیں بجھائی گئی تھیں اس لیے نظریں چندھیا رہی تھیں اور ٹھیک سے کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ گاڑی کا بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون سی اور کس ماڈل کی ہے۔

گاڑی رکتے ہی اس کے اندر سے پانچ چھ افراد برآمد ہوئے۔ میں اپنی آنکھیں سکیڑ سکیڑ کر انہیں دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ تیز روشنی اور تاریکی کے اس امتزاج نے عجیب سا ماحول بنا دیا تھا۔ دیکھنے کے باوجود میں کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ یہی حال علی گوہر کا بھی تھا۔

بہرکیف، ہم کچھ دیر عام پر آنے کا انتظار کرتے رہے پھر اگلے لمحات میں جیپ کی لائٹ بھی گل کر دی گئیں۔ البتہ جیپ کا انجن ہوتے ہوئے غرا رہا تھا۔ اب پانچواں شخص بھی نیچے اتر آیا۔ یہ ایک اونچے اور چوڑے ٹائروں والی قدرے بڑی سی جیپ تھی۔ جیپ سے اترنے والے وہ اب کل پانچ افراد تھے اور پانچوں ہی کو میں پہچان چکا تھا۔ ایک تو خوبرو نوجوان جو وڈیرے سیمل خان کا لاڈلا بیٹا حاصل خان تھا، باقی چار اسی کی عمر کے نوجوان، کمیل، شمس، منیر شاہ اور رائیل تھے۔ آخرالذکر چاروں اس کے دوست تھے۔ شمس جاشورو کے ایک زمیندار بابی خان کا بیٹا تھا، کمیل کراچی کے ایک بیوروکریٹ آصف اقبال کی اولاد تھا، منیر شاہ حیدرآباد کی ایک بزنس کلاس فیملی سے تعلق رکھتا تھا جبکہ رائیل کا باپ امارات میں ایک اچھی پوسٹ پر ملازمت کرتا تھا لیکن اس کی فیملی کراچی میں ڈیفنس میں رہائش پذیر تھی، وہاں اس کی کوٹھی تھی۔ حاصل خان کے ہاتھ میں پستول چمک رہا تھا اور اس کے دونوں دوست بظاہر خالی ہاتھ نظر آئے۔

''شمنگ ہٹ!'' بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکلی سرگوشی میں برآمد ہوا اور میرے ساتھ دبکے کھڑے علی گوہر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''کیا کہا......؟''

''کچھ نہیں......!'' میں نے ہولے سے کہا۔ میں اب اسے کیا بتاتا کہ یہاں امیرزادوں کا ایک خونی کھیل تھا۔ اس کے بارے میں صرف میں نے سن کر جلا دیا تھا لیکن

urdunovels.com

آج شاید پہلی مرتبہ اس کا مشاہدہ اور تجربہ بھی ہونے والا تھا۔ ہتک عزت کا نام بھی ابھی امیر زادوں نے اسے دے رکھا تھا۔

اسی وقت ایک جانب سے جس نے جو نسبتاً قد آور تھا، جھاڑیوں میں جھک کر کسی گرے ہوئے وجود کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹا۔ یہ کوئی لڑکی تھی۔ اپنے لباس اور وضع قطع سے وہ ماڈرن اور شہری دکھائی دیتی تھی۔ میں نے دیکھا، وہ ہوش میں تھی اور کراہ رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی ہی نظر آئی جیسے کچھ دیر پہلے اسے زدوکوب بھی کیا گیا ہو۔ مجھے اس کے بدن کے ایک حصے سے خون بھی ٹپکتا دکھائی دیا۔ گولی شاید اسے روکنے کے لیے دانستہ ٹانگ پر داغی گئی تھی۔

"تت..... تم خونی، بھیڑیے..... بزدل.....!" لڑکی کے منہ سے یہ الفاظ میرے لیے حیران کن تھے۔ میں تو سمجھا تھا وہ ان سے خوفزدہ ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر ان پانچوں مشٹنڈوں کی منتیں کرے گی لیکن یہ تو بے بس اور زخمی ہو کر بھی دلیری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ پتا نہیں اس بات نے میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی جسے میں کوئی نام نہ دے پایا۔

حاصل خان اور اس کے چاروں دوستوں نے بے غیرتی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے بدمست قہقہے بلند کیے اور پھر حاصل خان نے آگے بڑھ کر جھک کر لڑکی کو گردن سے دبوچ لیا اور اسے کھڑا کر دیا۔ لڑکی لنگڑانے لگی۔ وہ اپنے زخمی پاؤں پر کھڑی نہیں ہو پا رہی تھی۔

"ہم نے تم سے جو کہا تھا کہ ہماری بات مان لو، تم نے کیوں غرور کیا؟ اب بھگتو اس کی سزا۔" حاصل خان نے اپنا چہرہ اس لڑکی کے قریب کرتے ہوئے پُرغرور لہجے میں کہا۔

"تمہاری ماں بہن تو ہو گی، اس سے کیوں نہیں کہا اپنی اور اپنے دوستوں کی بات منوانے کا۔" لڑکی نے پھر بے خوفی کا مظاہرہ کیا تو میرے اندر سنسنی سی ہونے لگی۔ ایسی صورت حال میں جب بھی یوں ہوتا، میں سن سا ہونے لگتا تھا۔

یہ ایک مجبور، بے کس اور بے بس عورت ذات کی ان اور بگڑے ہوئے رئیس زادوں پر ایسی چوٹ تھی کہ اگر ان میں ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو وہ ان جملوں پر پانی پانی ہو جاتے یا پھر اس لڑکی کو گولی مار دیتے لیکن یہ لوگ واقعی بزدل اور بے غیرت تھے۔ جواب میں پھر جنگل میں ان بدطینتوں کے شیطانی قہقہے گونجے اور حاصل خان نے لڑکی کو سہیل کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

"اسے جیپ میں ڈالو اور لے چلو۔"

"لیکن یار! تم نے اسے زخمی کر کے خود گر کر دیا۔" عمس بولا۔ ان کی آوازیں مجھے بوجھل اور غم خوردہ سی محسوس ہوئیں۔ اندازہ ہوا کہ یہ پیے ہوئے بھی تھے۔

"خیر کوئی بات نہیں، مرہم پٹی کر کے پھر جشن منائیں گے۔" حاصل خان کے بجائے محسن نے ہی اپنی بات کا جواب دیا۔ کچھ اسی طرح کا اوباشانہ لقمہ باقی تینوں نے بھی دیا اور سب ہنسنے لگے۔

"دیکھو، تم لوگ غلط کر رہے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔ میرے ساتھی کو بھی تم نے گولی مار دی ہے۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ....."

لڑکی کی بات درمیان میں ہلکی چیخ میں بدل گئی کیونکہ اسی وقت حاصل خان نے اسے زور کا تھپڑ مارا تھا۔ اس کے بعد یہ لڑکی کو لیے جیپ میں سوار ہو گئے۔ انجن اسٹارٹ ہی تھا پھر اس کی ہیڈ لائٹس بھی تیز ہو گئیں۔

وہ جانے لگے تھے۔

میں نے علی گوہر کی طرف دیکھا تو وہ میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا معاملہ ہے یار؟" وہ بولا۔

"معاملہ ظاہر ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا تو جانتا ہے ان لوگوں کو؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک تو ہمارے ہی وڈیرے صیقل خان کا چھوٹا بیٹا حاصل خان ہے۔ باقی اس کے رئیس زادے ساتھی۔ میں ان کی چاکری (نوکری) کرتا ہوں۔"

"چل پھر واپس ہو، ہمارا کیا۔" علی گوہر بولا۔ "نوکروں کو اپنی اوقات میں رہنا چاہیے۔"

علی گوہر کے ان جملوں نے میرا اندر جھنجھوڑ ڈالا۔ "علی گوہر.....! تو نے غلط سمجھا۔ میں ان کا صرف نوکر ہوں، غلام نہیں۔ تو چلا جا، میں لڑکی کی مدد کرنے جاؤں گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میرے اندر ایک عزم تھا۔

"کیا.....؟" علی گوہر بھونچکاں رہ گیا۔ "یعنی تو یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ یہ لوگ کون ہیں اور کتنے طاقتور..... پھر بھی.....؟"

"علی گوہر.....!" میں نے بالکل خشک اور جیسے مشینی لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "تو واپس چلا جا مگر میں ان کے پیچھے جاؤں گا۔" کہتے ہی میں نے قدم بڑھا دیے۔ اسی وقت علی گوہر نے عقب سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

UrduNovels.com

"بس، میں بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ تو کسی مصلحت سے کام تو نہیں لینا چاہتا۔ تیرے دل میں واقعی اس لڑکی کی مدد کرنے کا سچا جذبہ موجود ہے۔ اب علی گوہر کا پیچھے ہٹنا اس کی موت کے برابر ہوگا۔" اس نے نہایت ہنستے ہوئے لہجے میں کہا تو میرے ہونٹ دھیرے سے کھل اٹھے۔

"ٹھہر۔" اس نے کہا اور اپنا گیروے رنگ کا کپڑا مجھے تھما دیا پھر اپنی کمر میں لپٹا ہوا اسی رنگ کا کپڑا کھول کر اس کا ڈھاٹا بنا لیا اور میں نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ سے ایسا ہی کیا۔ اب ہم دونوں "ڈھاٹا پوش" تھے۔

"جوش میں اگر ہوش شامل رہے تو کامیابی یقینی ہے۔ یہ ایک سپیرے کا اصول ہے، ورنہ بندہ ڈس لیا جاتا ہے۔" وہ ناصحانہ لہجے میں بولا۔ "یہ تیری جان پہچان کے لوگ ہیں، معاملہ پردے کے پیچھے ہی نمٹ جائے تو اچھا ہوتا ہے۔"

میں نے اس کی بات سن کر اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔

جیپ غائب ہوگئی تھی۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے جھونپڑی میں پہنچے۔ میں نے اپنے مخصوص ساخت کے "دیسی ہتھیار" سنبھال لیے (چاقو، رسی، رسائی وغیرہ) اور علی گوہر نے فقط ایک "کاترا" اٹھا کر اپنی کمر سے باندھ لیا۔ یہ چمڑے کا ایک "چھتر" نما بیلٹ ہوتا ہے۔ بقول اس کے وہ اس کے ذریعے زخم کھائے ہوئے سانپ کو بے بس کرتا تھا۔

اس کے بعد میں نے ایک شارٹ کٹ راستہ اپنایا اور پھر ہم دونوں تاریکی میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جدھر ایک گارے مٹی اور لکڑی کا خوبصورت سا بڑا مکان بنا ہوا تھا۔ اس کا نام انہوں نے "ہنٹنگ ہٹ" رکھا تھا لیکن میں اس جگہ کی خوفناک اصلیت سے واقف تھا۔ یہاں ٹیلی فون، بجلی سمیت انٹرنیٹ کی سہولت بھی موجود تھی۔ وائی فائی تو نہیں تھا لیکن نیٹ کی سہولت موجود تھی۔ اے سی اور ہیٹر بھی موجود تھا۔

میں ادھر کئی بار حاصل خان اور ان کے یار دوستوں کے ساتھ آ چکا تھا، شکاری ہم یا پھر کوئی "پینے پلانے" کی محفل ڈالا کرتا یہ لوگ ادھر ہی کرتے اور کبھی کبھی یہ مجھے بھی ساتھ لے آتے۔ میں ان کی خدمت میں رہتا لیکن ہمیشہ سے حقیقت یہی رہی تھی کہ مجھے ان کے طور طریقوں سے نفرت تھی۔ کئی بار تو ساتھ آنے سے بہانہ بھی بنا لیتا تھا اور "وڈے سائیں" کا گھر کا کھڑ ٹریکٹر لیے کھیتوں میں نکل جاتا۔ وجہ یہی تھی کہ حاصل خان اور اس کے اوباش اور آوارہ دوستوں کے

کاریات

"آپ کی بیگم کی ڈرائیونگ کیسی ہے؟"

"وہ جس طرف گاڑی موڑتی ہے، کبھی کبھی اتفاقاً سڑک بھی اسی طرف مڑ رہی ہوتی ہے۔"

"آپ کی گاڑی ایک گیلن میں کتنا چل جاتی ہے؟"

"اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ گیلن کس چیز کا ہے؟"

☆☆☆

"یہ خاتون سامنے سے اپنی گاڑی میں آ رہی تھیں، اگر آپ انہیں گزرنے کے لیے راستہ دے دیتے تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔"

"میں ضرور راستہ دے دیتا جناب! بشرطیکہ مجھے اندازہ ہو جاتا انہیں کس طرف کا راستہ چاہیے۔"

☆☆☆

"اچھا تو تمہیں تیز رفتاری کے جرم میں میرے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے تم کتنی مرتبہ میرے سامنے پیش ہو چکے ہو؟"

"ایک مرتبہ بھی نہیں مجسٹریٹ صاحب! البتہ سڑکوں پر کئی مرتبہ میں نے آپ کو اوور ٹیک کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میری گاڑی اسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے زیادہ چلتی ہی نہیں۔"

☆☆☆

"یہ صاحب اس وقت کس رفتار سے جا رہے تھے جب ان کا چالان کیا گیا؟"

"رفتار کا مسئلہ تو بعد کا ہے، اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ صاحب بادلوں کے قریب رانگ سائڈ جا رہے تھے۔"

☆☆☆

"میں نے دیکھا ہے کہ آپ اپنی کار اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو بھی چلانے کے لیے دینے لگے ہیں۔"

"ہاں، اس کی عمر اور تجربہ اتنا نہیں ہے کہ میں اسے کراچی کی سڑکوں پر پیدل بھیجنے کا خطرہ مول لے سکوں۔"

(مرسلہ: کاشف خان کراچی، چنیوٹ)

کرتوتوں سے واقف تھا۔ ان کے خلاف نفرت میرے دل میں اس وقت پروان چڑھی تھی جب یہ شہر سے طوائفیں اور گانے بجانے والی لایا کرتے تھے لیکن ان سب کے باوجود میں نے صرف سن رکھا تھا کہ یہ پانچوں امیر زادے مہینے میں ایک بار ایک عریاں کھیل بھی کھیلا کرتے تھے جو ان کی درندہ صفت فطرت کی عکاسی کرتا تھا لیکن اس کے بارے میں، میں نے صرف سن رکھا تھا اور کبھی مشاہدہ نہیں کیا تھا کیونکہ سنا یہی تھا کہ یہ عریاں کھیل وہ ہمیشہ خود ہی کھیلا کرتے تھے، اس وقت کوئی نوکر یا خدمت گار ساتھ نہیں ہوتا۔

بہرکیف، ہنٹنگ ہٹ کے سامنے بڑے سے احاطے میں ان کی جیپ کھڑی نظر آئی لیکن ساتھ میں نئے ماڈل کی دو اور گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔

یہ لوگ لڑکی کو اندر لے جا چکے تھے۔ ہم دونوں ڈھاٹے باندھے اندر کی جانب لپکے۔ علی گوہر نے اپنی کمر سے گاترا کھول کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور میں نے اپنی رمائی۔

سب سے پہلے علی گوہر نے لکڑی کے دروازے کو زوردار لات رسید کی۔ دروازہ دھڑ سے کھلا، ہم اندر داخل ہو گئے۔ سامنے ہی ہال کم لاؤنج تھا جہاں فرنیچر کے نام پر دو سرکنڈوں کے اونچے پشتے والے موڑھے، تین بید کی چوڑے پایوں والی کرسیاں، ایک لمبی سی میز، قریب میں بید کی لمبی سی بینچ، دائیں بائیں دو صوفے تھے۔ ایک پر لڑکی کو لٹا کر اس کی ٹانگ کی مرہم پٹی کی جارہی تھی جو ابھی تک بلک رہی تھی۔ شمس اس کی پٹی میں مصروف تھا، حاصل خان اور منیر شاہ ایک صوفے پر ٹانگیں پھیلائے شراب پی رہے تھے۔ سہیل اور رانجل ایک میز پر رکھی شراب کی بوتلوں کو کھول رہے تھے۔

ہمیں یوں درانہ وار اندر داخل ہوتے دیکھ کر یہ پانچوں یوں بدکے جیسے آسمانی بجلی آن گری ہو۔ لڑکی نے بھی مچلنا بند کر کے ہماری طرف اپنی حیرت بھری آنکھوں سے تکنا شروع کر دیا۔ اندر روشنی تھی۔ پہلی بار لڑکی کا میں نے چند لمحاتی ساعتوں میں جائزہ لیا۔ وہ ایک خوبصورت اور اسمارٹ سی لڑکی تھی۔ قد چھوٹا سا تھا مگر جسم متناسب، رنگت گوری، بال بوائے کٹ، آنکھیں نیلی اور گہری، ہونٹ تراشیدہ۔ اس کی صاف رنگت کی جلد میں نزاکت کے ساتھ چکناہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔

"کون ہو تم لوگ اور جرأت کیسے کی اس طرح اندر داخل ہونے کی؟" حاصل خان نے شعلہ برساتی آنکھوں اور لال بھبوکا چہرے سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے غرا کر کہا۔ وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ منیر بھی اٹھنے لگا۔ میز کی طرف کھڑے سہیل اور رانجل بھی چونک گئے۔

"لڑکی کو ہمارے حوالے کر دو۔" میں نے آواز بدل کر سپاٹ لہجے میں حاصل خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اگر وہ مجھے بغیر ڈھاٹے کے دیکھ لیتا تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔ ہر وقت انہیں ادب اور فدویانہ لہجے اور انداز میں "چھوٹے سائیں" کہنے والا یوں اسے للکار رہا تھا۔

"یہ چور، اچکے لگتے ہیں۔ انہیں چند روپے دے کر روانہ کر دو۔ کیوں رنگ میں بھنگ ڈالتے ہو حاصل خان!" اس کے ساتھی سہیل نے بے فکری سے کہا۔

"لڑکی ہمارے حوالے کر دو یا پھر مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" اس بار علی گوہر نے گرجدار آواز میں کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے اپنی آواز بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تمہاری تو......" پرطیش لہجے میں حاصل خان نے دانت پیس کر کہا اور قریب رکھے ہولسٹر کی جانب بڑھا۔ اسی وقت میرا ہاتھ لہرایا اور ساتھ ہی رمائی کی مخصوص "گھو" پر میرے انگوٹھے نے حرکت کی۔ رمائی فضا میں نوے ڈگری گھومی اور اس کے سرے پر بندھا پتھر نکل کر حاصل خان کی پیشانی پر لگا۔ وہ پھٹ گئی، بھل بھل خون جاری ہو گیا۔ وہ چکرا کر ایسا گرا کہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں نے رمائی گھمانے کی رفتار کم رکھی تھی ورنہ اس کا سر کھل جاتا۔

باقی چاروں پہلے تو آنکھیں پھاڑے اپنے "چہیتے" ساتھی کا حشر دیکھتے رہے پھر بیک وقت چاروں حرکت میں آئے اور جارحانہ انداز میں ہماری جانب بڑھے تو علی گوہر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا گاترا گھما کر سب سے پہلے قریب آنے والے شمس کے رسید کر دیا۔ اس نے جھکائی دے کر بچنے کی بہت کوشش کی لیکن سانپ کے پھن جیسا سرا رکھنے والے لہراتے گاترے نے اپنا ہدف پا کر ہی چھوڑا۔ شمس کے منہ سے ایک کربہ انگیز چیخ نکلی اور وہ اپنی سرخ پڑتی گردن پر ہاتھ رکھے ایک طرف کو جا پڑا۔ اس کے قریب میں سہیل تھا۔ علی گوہر نے اس کا بھی وہی حشر کیا جبکہ میری جانب بڑھتے ہوئے منیر شاہ اور رانجل کو میں نے باری باری ملاکھڑے کا مشہور داؤ "اکھڑی" لگا کر پل کے پل میں فرش بوس کر ڈالا۔ یہ اڑنگا تھا جس سے مدمقابل کی کمر پہ بل بھی پڑ جاتا ہے اور وہ اتنی جلدی دوبارہ اٹھنے کے قابل نہیں رہتا۔ سو، وہ گرتے ہی کراہنے لگے۔ میں نے اپنی اس منصوبہ بندی میں تیزی اور وقت کا تعین کار فرما رکھا تھا اور

صرف وہاں ہی حد تک اقدام کیا تھا تا کہ میں اور علی گوہر کم سے کم ان چاروں کے سامنے رہ سکیں ورنہ پہچان لیے جانے کا احتمال ہوتا۔ یہ بانچوں حرام کی کمائی کے پروردہ تھے۔ عیاشیوں اور سہل پسندی نے انہیں اس قابل کہاں رکھا تھا کہ وہ اس طرح کے محاذ پر زیادہ دیر ٹکنے کے قابل رہتے۔

ادھر لڑکی ہماری جانب تشکیک بھری نگاہوں سے گھورنے لگی۔ لامحالہ طور پر وہ شاید یہی سمجھ رہی تھی کہ ہم بھی "شکاری" تھے اور نوالہ چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ تب ہی میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

"لڑکی......! وقت کم ہے۔ یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔"

لڑکی کو جیسے ہوش آیا۔ اس نے سوچا ہوگا بعد میں دیکھا جائے گا، ابھی تو نکل چلو۔ سو، وہ زخمی ہونے کے باوجود اٹھی اور ہماری طرف بڑھی۔ میں نے آگے ہو کر اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔

مجھے اعتراف تھا اس کا ہاتھ، جلد بہت ملائم اور نازک تھی جو اس کی شہری لڑکی ہونے کا واضح ثبوت فراہم کرتی تھی کیونکہ یہاں کی دیہاتی عورتوں کے ہاتھ میں وہ نرمی نہ تھی۔

ہم اسے باہر لے آئے۔ سہارے کے باوصف اس کے چلنے کی رفتار سست تھی۔ تب میں نے اسے اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ وہ ہولے سے کراہی۔ میں اور علی گوہر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے رہے۔ جلد ہی ہم جھونپڑی میں پہنچ گئے۔

لڑکی کو نیچے اتارا پھر اپنے چہروں سے ڈھاٹے اتار دیے۔ لڑکی پھیلی ہوئی آنکھوں سے ہمیں تکتی رہ گئی۔ ہمارے ڈھاٹے کھولنے سے شاید اسے کچھ تسلی ہوئی تھی۔ تحیرانہ انداز میں اس کی خوبصورت اور کشادہ گہری پھٹی پھٹی آنکھوں کی کشش سوا ہو گئی۔

"تت...... تم لوگ کون ہو؟" وہ بولی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہاری چیخ سن کر اس طرف متوجہ ہوئے تھے۔" علی گوہر نے کہا۔

"خدا کے لیے پھر میرے ساتھی کو بھی بچا لو۔ ان ظالم صفت انسانوں نے اسے بھی گولی ماری تھی۔" لڑکی پر تشنے بھر دوا سندو نے خاطر خواہ اثر کیا۔

"کس مقام پر اسے گولی ماری تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ ادھر دریا کے کنارے پر جو پرانے کھنڈرات تھے ان کے عقب میں۔"

میں سمجھ گیا اس کا اشارہ گوپی مندر کے کھنڈرات کی طرف تھا۔ "تم دونوں ادھر ہی رکو، میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

علی گوہر بولا۔

"نہیں، میں بھی ساتھ چلوں گی۔" لڑکی بولی پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "پلیز! تم بھی چلو نا۔"

میں علی گوہر اور لڑکی کے ساتھ باہر آ گیا۔ لڑکی مدد طلب نگاہوں سے میری جانب تکنے لگی تو میں نے دوبارہ اسے کندھے پر اٹھا لیا اور ہم تاریک جنگل میں تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگے۔ اس کا نازک اندام بدن میرے چٹان جیسے مضبوط کندھوں پر بڑی سہولت کے ساتھ دھرا پڑا تھا۔

رات آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی لیکن جنگل اب بھی غرق تھا۔ اس نے راہ میں میرے کان میں سرگوشی کی۔ "تم تاریکی میں اس قدر آسانی اور تیزی کے ساتھ کس طرح بڑھے جا رہے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور پھر جب گوپی کھنڈرات کے قریب سے گزرنے لگا دفعتاً وہی چھنچھناتی ہوئی پراسرار آواز کا خیال جاگا لیکن اب کے ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں اس کے قریب سے گزرتا ہوا عقب میں خاصی دور تک چلا گیا اور جلد ہی ایک جانب جھاڑیوں میں، میں نے کسی وجود کو بے سدھ پڑے پایا۔

لڑکی چیخ مار کر میرے کاندھے سے اتری۔ شاید وہ اپنے ساتھی کو پہچان گئی تھی۔

"فرزین...... فرزین......!" چلاتے ہوئے وہ لڑکی اس کی جانب لپکی اور جھک گئی۔

"یہ یہ...... یہ زندہ ہے، پلیز......! اس کی مدد کرو......!" لڑکی نے گردن موڑ کر ہماری جانب دیکھا اور پھر میں نے لپک کر بے سدھ پڑے اس کے ساتھی کا جائزہ لیا۔ وہ اوندھے منہ جھاڑیوں میں آڑا ترچھا پڑا تھا اور اس کے دائیں پہلو سے خون رستا ہوا دکھائی دیا۔ یہ ایک خوبرو نوجوان تھا۔

میں نے اسے آہستگی سے سیدھا کیا اور اس کے پہلو والے زخم کا معائنہ کرنے لگا تو ایک اور لرزہ دینے والا انکشاف ہوا۔ اس کے پیٹ میں بھی گولی ماری گئی تھی اور کافی خون بہہ چکا تھا۔

"علی گوہر! یہ آخری سانسوں پر ہے۔ کیا تم اس وقت کچھ کر سکتے ہو؟" میں نے بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر علی گوہر سے کہا۔ اس نے جھک کر دیکھنے کی کوشش تک نہ کی اور اسی طرح کھڑے کھڑے بولا۔

"اسے میری جھونپڑی پر لے جانا ہوگا، یہاں میں

کچھ نہیں کرسکتا۔"

"پھر دیر مت کرو...... اسے اٹھاؤ۔" میں نے تیزی سے کہا۔ علی گوہر نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا تو نوجوان کے زخموں سے دوبارہ خون بہنا شروع ہوگیا۔

"ایک بات بتا دوں ویسے۔" علی گوہر نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ بچے گا نہیں۔" اس کی بے رحمانہ بات سن کر لڑکی کے منہ سے فوراً ہی سسکاری نکل گئی۔ خود میں حیرت سے علی گوہر کا چہرہ تکنے لگا۔ اسے شاید پہلے ہی لڑکے کی حیثیت کمزوری دیکھ کر اندازہ ہو چکا تھا۔

پھر علی گوہر رکا نہیں، فوراً جھونپڑی کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکل دیا۔ میں اس کے پیچھے ہولیا۔ لڑکی کو میں نے پھر اٹھا لیا تھا۔

علی گوہر کی بات غلط نہیں نکلی۔ جھونپڑی پر پہنچنے تک لڑکے کا دم پرواز کر چکا تھا۔

☆☆☆

حویلی کی عمارت قدیم و جدید طرز کا بہترین نمونہ تھی۔ نہایت اعلیٰ درجے کی عمارتی لکڑی اور پختہ قرمزی رنگت کی اینٹوں کے علاوہ ٹائلز کا استعمال بھی کیا گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق حویلی کی اراضی ہزار گز سے کم پر محیط نہ تھی۔ اس کے آگے بڑا سا لان تھا، پہلو میں اوطاق، عقب میں بھی باغیچہ تھا جہاں شکاری یا محافظ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہتیں۔ وہاں ایک جانب گھوڑے اور ریس والے بیل بھی بندھے رہتے۔ ایک جانب بڑا سا گیراج تھا جہاں گاڑیاں کھڑی رہتیں۔ ان میں ایک بغیر ہڈ کی روکی اسٹائل جیپ بھی تھی۔ یہ وڈیرے مغل خان کے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے حاصل خان کی تھی۔

حویلی کے قریب تو کیا، اس کے اطراف میں بھی بلا غرض و ضرورت ادھر ادھر دیکھنے کی اجازت نہ تھی، خواہ غیر ارادی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر میرے ساتھ یہ ہو چکا تھا۔ جتنا ایک پل یا شاید اس سے بھی کم۔ مجھے ایک آنسوؤں بھرا حسین چہرہ حویلی کی بالائی منزل کے خوب صورت محرابی دریچے پر ابھرتا اور فوراً ہی غروب ہوتا نظر آیا تھا۔

"اوئے، چھوکرے! ہوشیاری، پکڑ، یہ کیا کرتا پڑا ہے؟" مجھا قریب کھڑے رحیم داد نے میری چوری پکڑلی۔

"وہ...... وہ...... مجھے چھینک آتے آتے رہ گئی۔" میں نے بہانہ کیا۔

"خیال رکھ چھوکرا! کسی محافظ نے بھی تیری اس حرکت کو دیکھ لیا نا تو تیرے ساتھ میری بھی اندر شامت ہو جائے گی۔" رحیم داد نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔

یہاں کے مسلح محافظ خطرناک اور چوکس ہوا کرتے تھے۔ وہ بظاہر غیر مسلح اور دیکھنے میں عام سے ہی نظر آتے۔ یوں انہیں بلا دھڑک حویلی کے اندر، باہر اور کسی بھی وقت آنے جانے کی اجازت ہوتی تھی۔ کسی بھی اندر باہر ہونے والی غیر معمولی حرکات و سکنات کی خبر، دوسرا سانس لینے سے پہلے وڈیرے مغل خان تک پہنچانے کی سختی سے انہیں تاکید ہوتی۔ خواہ وہ نوکر چاکر سے لے کر باہر کے محافظ ہی کیوں نہ ہوتے۔ بالفاظِ دیگر وہ جاسوس کہلاتے تھے۔

"معاف کرنا، اب خیال رکھوں گا۔" میں نے ہولے سے کہا لیکن وہ ایک جھلک، وہ ایک لمحہ...... وہ ایک ساعت...... جیسے لہر بن کر میرے پورے وجود میں سرایت کرتی چلی گئی تھی اور میں کھو سا گیا تھا۔ آنسوؤں سے لبریز وہ چہرہ جیسے سمندر کی عمیق گہرائیوں سے نکالا ہوا سیپ، اس میں سے جھانکتا، چمکتا دمکتا مگر آبدیدہ سا موتی...... انمول موتی۔ وہ آنکھیں...... اف...... اتنی گہرائی...... ایک لمحے میں اس قدر بولتی ہوئی محسوس ہوئیں جیسے...... جیسے...... مدد کے لیے کسی کو پکار رہی ہوں۔ اس قدر مقناطیسیت ان غزال چشم آنکھوں میں کہ نظارہ کرنے والے پر بےخودی اور بےاختیاری طاری کردے۔ یہی حال میرے ساتھ ہونے لگا۔ دل بار بار مچلنے لگا کہ اس محرابی دریچے کی جانب دیکھوں، دوبارہ اس رخِ ماہ روشن چہرے کا دیدار کروں...... اس معصومانہ حسن کی ایک ذرا جھلک پھر دیکھ لوں جو فقط لحظہ بھر کے دیدار میں جانے کتنی داستانیں سنا گیا تھا۔ وہ چہرہ بار بار مجھے اوپر دوبارہ دیکھنے کے لیے اکسائے جاتا اور یہ میرا دل ہی جانتا تھا کہ کس طرح میں نے دل کو سنبھالے رکھا۔ دلِ بےچین میں اس قدر طوفان اٹھنے لگا کہ کوئی کاش غلطی نہ ہو جائے۔ میں نے اپنی کلائی میں دانت گاڑ لیے۔ تکلیف کی شدت سے میرا دھیان کچھ بٹا مگر پھر وہی بے کلی۔

اپنی کیفیات پر مجھے خود بھی حیرت ہوئی۔ کہاں تو گوٹھ کی حسینائیں، شہر اور کالج کی خوبصورت کلاس فیلوز میں سے کسی پر بھی میرا دل مائل بہ الفت نہ ہوا تھا مگر آج دل کو کیسا چرکا لگا تھا۔

"ہوشیاری۔" رحیم داد نے اگلے ہی لمحے جیسے آواز کا ہلکا سا مجھے ٹہوکا دیا۔ میں خیالات کے بھنور سے یکدم ہی ابھرا۔ حویلی کے مرکزی دروازے سے اہلِ خانہ نکل رہے تھے۔ رحیم داد جھٹ سے اپنے شیشوں کے کام والی ٹوپی

سنبھالا ہوا ان کی جانب بڑھا۔ مجھے اس نے گاڑی کے پاس ہی (مودب) کھڑے رہنے کی تاکید کردی تھی۔ میں نے دیکھا، سب سے پہلے باس کی طرح چھریرا شخص برآمد ہوا۔ اس نے اعلیٰ درجے کا کرتہ شلوار پہن رکھا تھا، اوپر رنگی سی قیمتی واسکٹ، سر پہ بالا کی بنی سرخ رنگ کی شیشوں کے کام والی ٹوپی، پیروں میں شاہی انداز کے کھسّے، ہاتھ میں اسٹک جس کا متھا سونے کا تھا اور اس کے سرے پر چاندی کی نوک۔ بائیں ہاتھ میں گولڈن کلر کی قیمتی گھڑی، دائیں ہاتھ کی انگشتریوں میں مختلف پتھروں اور نگینوں کی انگوٹھیاں بھی دکھائی دیں۔ چہرے کی رنگت سرخ وسپید تھی اور گھنی ڈاڑھی سرخ رنگ کی، مونچھوں کا بھی یہی حال تھا۔ صاف لگتا تھا کہ ان پر مہندی لگائی گئی تھی۔ چہرے پر روایتی رعونت اور گھنی بھوؤں سے ڈھکی ہوئی آنکھوں میں غرور کی چمک مترشح تھی۔

دبلا پتلا ہونے کے باوجود قد کی لمبائی بتاتی تھی کہ ادھیڑ عمری میں بھی اس کے قویٰ مضبوط اور کاٹھی سیدھی تھی۔ اس کی کمر میں کہیں بھی ایک ذرا خم دکھائی نہ دیتا تھا۔ شخصیت خاصی بارعب تھی اور یہی وڈیرا اصیقل خان تھا۔ اس سمیت اندر سے کل چھ افراد برآمد ہوئے۔ تین خواتین، دو جوان مرد۔ خواتین میں ایک زرق برق لباس میں ملبوس ان کی دوسری بیوی تھی۔ ایک جوان بیٹی، ایک بہو جو وڈیرے اصیقل خان کی پہلی بیوی کے بیٹے بہرام خان کی بیوی تھی۔ تیسری ایک نوجوان لڑکی تھی اور اس سے ایک سال بڑا حاصل خان تھا۔ یہ دوسری بیوی کی اولاد میں سے تھے۔ میں صرف بہرام خان اور حاصل خان کا نام ہی جانتا تھا جو دونوں آپس میں سوتیلے بھائی تھے۔ یہ سب خوبصورت اور زرق برق لباس میں تھے۔ شہری دعوت کے سبب سوائے وڈیرے کے، اس کی دوسری بیوی نے ساڑی، بہرام خان نے کوٹ سوٹ اور حاصل خان نے جینز اور شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ لڑکی کا لباس بھی ماڈرن طرز کا تھا۔ دونوں نوجوان بہن بھائیوں کے کانوں میں بلیوٹوتھ لگے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بیش قیمت موبائل سیٹ تھے۔

بس، اتنا ہی مجھے پتا تھا باقی اور مزید کتنی تعداد اہلِ خانہ کی تھی، میں نہیں جانتا تھا، نہ ہی کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔ فقط ماما قادرے نے جو بتایا تھا یا پھر یہاں رہتے ہوئے خود ہی معلوم ہوسکا تھا، وہ پتا تھا۔

میں نے جھٹ سے سینے پر ہاتھ رکھ کر وڈیرے کو ذرا سے جھک کر سلام کیا اور لپک کر ان سب کے لیے باری باری دروازے کھول دیے۔ اسی اثنا میں اندر حویلی سے کچھ خدمت گار برآمد ہوئے۔ انہوں نے ہاتھوں میں مٹھائی کے خوبصورت سجے ہوئے ٹوکرے اور دیگر تحفے تحائف کے بڑے بڑے شاپرز پکڑ رکھے تھے۔ انہوں نے وہ تحائف گاڑی کے عقبی حصے میں رکھ دیے۔

پھر جب یہ سب لوگ اندر براجمان ہوگئے تو میں نے بھی آکر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ رحیم داد ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا اور اب باہر فدویانہ انداز میں سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

اگنیشن سوئچ میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک بٹن پش کیا، گاڑی کے نفیس سائلنسر نے ہولے سے غرا کر بیداری کا پتا دیا اور ہموار ہوگیا۔ وڈیرا اصیقل خان میرے برابر کی سیٹ پر براجمان ہوگیا اور میری جانب گھور گھور کر تکنے لگا۔ میں ایک دو بار ہی اس کے سامنے آیا تھا اور وہ بھی دور دور سے۔ تب ہی اس نے اپنی کھڑکی کے قریب ہاتھ باندھے کھڑے رحیم داد کو پکارا۔

”اڑے او رحیم داد......!“

بوتل کے جن کی طرح کھڑے رحیم داد کے پورے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا، وہ لپک کر کھڑکی کے اور نزدیک آ گیا۔

”سائیں...... سائیں بھوتار......! حکم......؟“

”اڑے یہ چھوکرا کون ہے؟“ وڈیرے نے کھرکھراتی آواز میں پوچھا۔ اشارہ میری جانب تھا۔

”بس...... سائیں وڈا......! آپ نے شاید اسے پہچانا نہیں۔“

”اڑے کیا بکواس کرتا ہے تو؟“ وڈیرے اصیقل خان نے جھٹکے دار لہجے میں کہا تو رحیم داد ہاتھ جوڑے لرزنے لگا۔

”ہمیں اسے پہچان کر کیا کرنا ہے، یہ ہے کون؟“

”بس...... سائیں......!“ بے چارے رحیم داد کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ ”یہ...... یہ وہ ماما قادرا ہے نا، سائیں! قادر بخش، چھوٹا منشی، اس کا پت...... بیٹا ہے۔ ہماری زمینوں پر یہ ٹریکٹر چلاتا ہے۔“

”تھو لعنت ہے تیرے منہ پر۔“ وڈیرے نے کھڑکی سے ہی ہاتھ نکال کر اسے پانچ انگلیاں دکھا دیں اور رحیم داد نے بڑے شوق سے ان کا نظارہ کرنا ضروری سمجھا کہ اس میں گلوخلاصی ہو جائے تو کیا برا تھا۔

ایک موٹی گالی دینے کے بعد وڈیرے نے کہا۔

"تجھے اور ڈرائیور نہیں ملا تھا جو تو نے ٹریکٹر ڈرائیور کو بلا لیا؟"

"بس...... سائیں بھوتار! یہ گاڑی بھی چلاتا ہے۔"

"کس کی گاڑی؟"

رحیم داد میری جانب دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو تو ہی تو کچھ بول۔

میں نے نہایت ادب سے لیکن اس میں ڈر یا خوف یا غلامی کا شائبہ تک نہ تھا اور مہذب سے لہجے میں کہا۔

"سائیں! میں کالج میں دوستوں کے ساتھ گاڑی چلاتا رہا ہوں اور کراچی شہر کے علاوہ سکھر اور کندھ کوٹ تک بھی گیا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔"

کھنکناتے لہجے والے دبنگ وڈیرے کو نہ جانے میرے ٹھہرے اور جمے ہوئے لہجے میں کیا لگا کہ وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اے سی آن کیا، خودکار شیشے چڑھا دیے، گاڑی کو تھوڑا ریورس کر کے ایک چھوٹا سا ٹرن لیا اور یہی وہ وقت تھا جب میں اپنی طرف کا بیرونی بیک ویو، اسٹیئرنگ پر نصب ایک بٹن سے ایڈجسٹ کرنے لگا تو ایک چھکتے خیال سے اسے میں نے چند لمحوں کے لیے کچھ ایسے زاویے پر بھی کیا کہ وہ عقبی منظر کے بجائے حویلی کی اوپری منزل کے نقشے کی ذرا دیر کو جھلک دکھا دے۔

یکلخت ہی مجھ پر وہی سناٹے طاری ہونے لگے۔ وہی کیفیات حاوی ہونے لگی۔ اسی دریچے سے وہی اپسرا مثل، آبدیدہ رخِ روشن، تپتے صحرا میں گلستان کا گماں دیتا درشن اور...... آن کی آن میں سمندر سی گہری آنکھوں میں غرقاب کر ڈالنے والا اثرانگیز فسوں...... یہی وقت تھا جب میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھے وڈیرے میتھل خان نے زور سے کھنکھارا مارا اور میں چونک کر حال کی دنیا میں آ گیا۔

ایسا ہی نظارہ تھا اس ماہ جبین کا...... کہ وہ گرد و پیش سے ہی بیگانہ کر ڈالتا تھا۔ چونکہ میں گاڑی کے اندر تھا اور پھر کسے کیا معلوم تھا کہ میں بیرونی عقبی منظر پیش کرنے والے مرر کو کس زاویے سے ایڈجسٹ کر کے کیا نظارہ کر رہا تھا۔ بھلا کوئی جان بھی کیسے سکتا تھا۔

میں گاڑی کو جامشورو روڈ پر لایا اور پھر کراچی جانے والی مین ہائی وے پر آ گیا۔ یہاں سے ٹول ٹیکس کروایا اور ٹول پلازا بغیر رکے آگے نکل گیا۔ یہ سب میں نے بڑی تیزی سے کیا تھا کہ کسی کو انتظار کرنے اور رکنے پر کوفت نہیں محسوس ہوئی تھی۔

آگے ٹرک ٹرالر اور مسافر کوچز کا رش تھا لیکن میں بڑی مہارت اور بغیر گاڑی کو جھٹکے دیے ان کے درمیان سے نکالتا لے گیا۔ اس کے بعد رواں طریقے سے گاڑی کو کراچی کی طرف دوڑانے لگا۔ میں نے ساتھ بیٹھے وڈیرے میتھل خان کی طرف بغیر دیکھے تاڑ لیا تھا کہ وڈیرا بڑی خاموشی مگر غور سے میری ڈرائیونگ اسکل کو آبزرو کر رہا تھا۔

"اڑے...... چھوکرا! کیا نام ہے تیرا؟" معا ہی وڈیرے نے گمبھیر آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"سائیں! میرا نام...... مراد علی ہے۔" میں آگے کہنے والا تھا کہ پیار سے مجھے سب "راجا" کہتے ہیں مگر ماما قادرے کی نصیحت مجھے یاد تھی۔ اس نے کہا تھا اگر وڈا سائیں تجھ سے کچھ پوچھے تو فقط مختصر سا جواب دینا، اضافی بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے یہی کیا تھا۔

"مگر جہاں تک مجھے پتا ہے، قادر بخش کی کوئی اولاد نہیں۔ اس کی تو زنانی (بیوی) بھی مر چکی ہے۔" وڈیرے نے کہا۔

"آپ نے بالکل صحیح کہا سائیں!" میں نے ہولے سے جواب دیا۔ میرے اندر میں عام روایتی لوگوں جیسا غلامانہ یا ڈرا ہوا انداز نہ تھا۔ میں احترام کے دائرے میں بالکل نارمل لہجے میں جواب دے رہا تھا۔

"پھر اس حرامزادے نے ہم سے جھوٹ کیوں بولا کہ تو قادر بخش کا بیٹا ہے؟" میتھل خان تپ کر بولا۔ اس کا اشارہ یقینی طور پر رحیم داد کی طرف تھا۔

"سائیں! اس نے جلدی اور گھبراہٹ میں کہہ دیا ہوگا آپ سے۔" میں آہستگی سے جواب میں بولا۔

"ہم۔" وڈیرے نے گمبھیر ہنکاری بھری اور چپ ہو رہا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ دو تین بار اپنی گردن موڑ کر میرا جائزہ لیتا رہا ہے۔

"تیرے ماں پیو نہیں ہیں؟" ذرا دیر کی گمبھیر خاموشی کے بعد اس نے پھر پوچھا۔ باقی لوگ اپنی اپنی باتوں اور ہلکے پھلکے ہنسی مذاق میں مگن تھے۔ فقط اس کی بیوی خاموش تھی۔ اگرچہ ضرور تا وہ بھی کبھی کبھی دو چار جملے اچھال دیتی تھی۔

"نہیں سائیں!"

"مر گئے یا گم ہو گئے؟"

اپنے ماں باپ سے متعلق وڈیرے کا یہ لہجہ مجھے ناگوار گزرا۔ میں نے بھی ٹھنڈی ہوئی متانت سے جواب دیا۔ "ان کا انتقال ہو گیا ہے۔"

وڈیرے کو پھر جیسے چپ لگ گئی۔

اسی وقت صیقل خان کی عقبی سیٹ پر براجمان اس کی بیوی نے قدرے جھک کر پیچھے سے اس کے کان میں کچھ کہا تو وڈیرا جیسے جلال میں آگیا۔

"چنگا بابا...... اچھا...... ہم سے زیادہ سیانی ہے تو۔" وڈیرے نے جھٹکے دار لہجے میں بیوی کو جھڑک دیا۔ "نیا نوکر اور نیا آدمی ہم سے مشکل سے ہی ہضم ہوتا ہے۔ پوچھ کچھ ضروری ہوتی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کی بیوی نے اس کے کان میں کیا کہا ہوگا۔ میری باریک مونچھوں سے ڈھکے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو میں نے روکے رکھا۔ دوسری بیوی تھی، خوبصورت بھی اور کم عمر بھی۔ شاید اسی لیے وڈیرے نے اس کی زیادہ کلاس نہ لی۔

سفر جاری رہا۔ ذرا دیر بعد جانے وڈیرے کو کیا ہوا کہ اس نے اپنی واسکٹ کی جیب سے بلیوٹوتھ نکال کر اپنے کان میں ٹھونسا پھر اپنے بیش قیمت آئی فون سے ایک نمبر ملا کر اسے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

"اڑے قادرا......!" رابطہ ہوتے ہی وڈیرے نے کہا تو میں اندر سے چونکا اور یہی سمجھا شاید وڈیرا اب ماما قادر بخش سے میری کوئی شکایت کرنے لگا تھا۔

"اڑے قادرا! یہ تیرا پٹ مراد علی، لگتا کیا ہے تیرا......؟ اچھا...... چنگا...... ہاں ہاں...... اب تو تیرا پٹ (بیٹا) ہی ہوا نا۔" کہتے ہوئے وڈیرے نے قہقہہ لگایا تو میرے اندر سے خدشہ یکدم حیرت میں بدل گیا۔ ماما قادر بخش سے اس لہجے میں صیقل خان کو بات کرتے دیکھ کر مجھے سکون اور تسلی ہوئی لیکن وہ میرے سلسلے میں ماما سے کیا بات کرنا چاہتا تھا، اس کی کھد بد مجھے ضرور ہونے لگی۔

"ہاں، ہاں۔ ٹھیک ہے، چنگا...... چنگا...... بابا! پر میں تجھ سے یہی کہنا چاہ رہا ہوں کہ......" فون کان سے لگا کر میری جانب گردن موڑ کر ایک لمحے کے لیے صیقل خان نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔

"میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں...... کیا......؟ ڈرائیور...... اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اصغر علی سے کہہ دینا کہ کوئی دوسرا ٹریکٹر ڈرائیور رکھ لے۔ جس آدمی کی جہاں جگہ ہوتی ہے، اسے میں وہیں رکھنا پسند کرتا ہوں بابا......!" آخر میں گمبھیر لہجے میں یہ کہتے ہی صیقل خان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میرے سینے میں عجیب سی ہلچل مچنا شروع ہوگئی جو دھیرے دھیرے نامعلوم سنسنی میں بدلنے لگی۔ بھلا میرے اندر ایسا کیا نظر آگیا تھا اس خرانٹ دماغ وڈیرے کو؟ لیکن ساتھ ہی صیقل خان کے مزاج کا ایک عجیب اور دوہرا پہلو بھی میرے سامنے کھلا۔ کہاں تو وہ مجھ سے بڑی اکھڑ مزاجی سے گفتگو کر رہا تھا اور پھر ماما سے بات کرنے لگا تو میں سمجھا اب میری شکایت کرنے لگا ہے۔ حالانکہ میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا تھا لیکن چونکہ یہ "بڑے لوگ" تھے اور نازک مزاج، کیا خبر میری کیا نارمل بات بھی اسے بری لگی ہو۔ تاہم جب ماما سے بات کرنے لگا تو اس کا رعونت بھرا لہجہ اچانک بے تکلف ہو گیا پھر آخر میں جب وہ ماما سے بات کر چکا تو میری جانب دیکھ کر صیقل خان معنی خیز انداز میں مسکرایا بھی تھا۔

الیکشن

الیکشن میں ایک بڑا وڈیرا بھی امیدوار تھا۔ اس نے اپنے ایک ہاری کو بلا کر کہا کہ اس کے تینوں بچے بھی ووٹر ہیں، وہ انہیں سمجھا دے کہ وہ اسے ووٹ دیں اور دوسروں سے بھی اس کے حق میں ووٹ دلوائیں گے۔

ہاری نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "حضور! میں آپ کا غلام ہوں۔ جس بکس میں کہیں، ووٹ ڈال دوں گا لیکن اپنے بیٹوں کے بارے میں وعدہ نہیں کر سکتا۔"

وڈیرے نے ناراض ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو اس نے دست بستہ جواب دیا۔ "حضور! وہ پڑھ لکھ گئے ہیں۔"

(مرسلہ: حنا خان، مری)

ووٹر لسٹ

1977ء کے الیکشن کی بات ہے۔ ایک صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ ایک واقف نے پوچھا۔ کہاں جا رہے ہو تو انہوں نے جواب دیا۔ "اپنے والد کی تلاش میں۔"

"والد کی تلاش میں؟ مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟" واقف نے حیرت سے کہا۔ "انہیں تو فوت ہوئے دو سال ہو گئے ہیں۔"

"ہاں مگر ووٹروں کی لسٹ میں ان کا بھی نام تھا اور معلوم ہوا ہے کہ کوئی صاحب ان کا ووٹ بھگتا آئے ہیں۔ میں ان ہی صاحب کی قدم بوسی کے لیے جا رہا ہوں۔" والد مرحوم کے بیٹے نے جواب دیا۔

(مرسلہ: اسما امتیاز، کراچی)

بہرکیف، میں خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ عقب میں اہل خانہ اپنی اپنی گفتگو میں مشغول تھے البتہ چھوٹی وڈیرن مجھے کچھ بے چین سی محسوس ہوئی۔

ایک بار جھڑکی کھانے کے بعد اس نے دوبارہ شوہر سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی تاہم اس نے منہ ضرور بنا رکھا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم کلفٹن کی سمندری حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اس کے بعد عالیشان بنگلوں اور کوٹھیوں کا رہائشی سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر مطلوبہ کوٹھی کے سامنے میں نے گاڑی روک دی۔

کوٹھی کسی نگینے کی طرح دمک رہی تھی۔ اسے بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ باوردی ویٹرز کی خدمات لی گئی تھیں جن میں ویٹرس بھی شامل تھیں۔ دعوت کا انتظام وسیع عریض لان میں کیا گیا تھا، باقی مہمان اندر باہر ہر جگہ ہی دکھائی دیے۔ آرکسٹرا بھی بج رہا تھا جس کے دھیمے سروں میں کوئی مغربی دھن تھی۔ کوٹھی کا رقبہ میرے اندازے کے مطابق دو ہزار گز تو تھا ہی۔ یہ ایک معروف بیوروکریٹ آصف اقبال کی کوٹھی تھی اور اس کی بیٹی کی آج شادی تھی۔ بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے اور کئی چمچماتی گاڑیاں، زرق برق لباس میں ملبوس خواتین، مرد اور بچے دکھائی دیے۔ گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ صیقل خان، آصف اقبال کے گہرے اور قریبی دوستوں میں تھا اسی لیے اس کی گاڑی پہچانتے ہی باوردی مسلح دربانوں نے انہیں کوٹھی کے وسیع وعریض احاطے میں ہی پارکنگ کے لیے جگہ دے دی جہاں اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

ہم سب نیچے اتر آئے۔ وہ لوگ اندر چلے گئے اور میں وہیں گاڑی کے ساتھ ہی رہا۔ پاس ہی دیگر ڈرائیورز کا گروپ تھا۔ میں جا کر ان میں شامل ہو گیا۔ وہ ایک گھاس کا کنج تھا اور وہاں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ڈرائیور حضرات وہیں بیٹھے آپس میں خوش گپیوں میں مشغول تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا لیکن جلد ہی اکتاہٹ کا شکار ہونے لگا۔

اہل خانہ تو اندر بات چیت اور دیگر سرگرمیوں میں اپنا وقت گزار لیتے، میرے لیے یہ بوریت بننے لگا۔ ڈرائیورز بھی اتنے پڑھے لکھے نہ تھے، نہ ہی میں ان سے زیادہ گھل مل پایا اور جا کر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر سیٹ کو ایزی کر کے ہلکی آواز میں عابدہ پروین کے گیت سننے لگا۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا، میرے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔ اسٹوڈنٹ لائف میں میرے کچھ کلاس فیلوز بھی امیر کبیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور اکثر میں دیگر فیلوز کے ساتھ حیدرآباد اور کراچی اس طرح کی تقریبات میں شامل رہا تھا۔ بے شک میری اوقات ان جیسی نہ تھی لیکن کالج اور یونیورسٹی کے دور میں خود کو میں نے کبھی بھی ان سے کم ظاہر نہ کیا تھا۔ ہمیشہ اچھا لباس پہنتا اور ویسا ہی رکھ رکھاؤ اختیار کرتا تھا۔ کسی کو لگتا ہی نہ تھا کہ میں دیہاتی یا پینڈو قسم کا لڑکا ہوں۔ کسی مفکر کا قول ہے کہ انسان اس وقت تک احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خود کو ایسا سمجھے اور میں نے کبھی خود کو دوسروں سے کمتر نہیں سمجھا تھا نہ ہی بلند۔ بس، میں ایک انسان تھا اور اللہ سائیں نے مجھے جو عطا کر رکھا تھا، اس پر میں شکر گزار رہتا تھا اور حقیقت بھی تو یہی تھی۔ بھلا کس شے کی کمی تھی میرے پاس۔ ناما قادر بخش جیسا باپ والی شفقت اور محبت دینے والا آدمی میرا سرپرست، عزت سے دو وقت کی روٹی مل جاتی، پہننے کو کپڑے اور پھر ایک حد تک شہری تعلیم بھی حاصل کی اور کیا چاہیے تھا بھلا۔

معاً ہی میرے دائیں جانب ایک لمبی چوڑی سیاہ رنگ کی گاڑی رکی۔ میں سیٹ پر ایزی لیٹے لیٹے گردن ذرا موڑ کر اس طرف دیکھنے لگا۔

شیشہ چڑھا ہوا تھا لیکن میں اندر سے باہر دیکھ سکتا تھا۔ یہ بھی کوئی ہائی فائی فیملی تھی۔ اپنی وضع قطع سے یہ لوگ زمیندار ہی لگے لیکن جب ان میں سے اپنی عمر کے نوجوان لڑکے پر میری نگاہ پڑی تو میرے ہونٹ تھوڑے سکڑ گئے۔ یہ عمس تھا، حاصل خان کا دوست۔ تو گویا یہ جاشورو کے زمیندار ماجھی خان کی فیملی تھی۔

میں انہیں گاڑی سے اترتا دیکھتا رہا۔ ان میں مرد، بچے، خواتین سب ہی تھے پھر سب لوگ لان کی طرف بڑھ گئے۔ میں پھر گیت سننے میں مگن ہو گیا۔ تھوڑی دیر اور گزری۔ اچانک میرا سیل فون گنگنایا۔ میں نے ڈیک آف کیا اور بلیوٹوتھ پر کال ریسیو کی۔ سیل فون ابھی ہاتھ میں ہی تھا جسے میں ڈیش بورڈ پر رکھنے ہی والا تھا۔

''ہیلو!'' میں نے ہولے سے کہا۔

''چھن......چھن......چھن......''

دوسری طرف سے ابھرنے والی اس آواز پر مجھے اس قدر زوردار جھٹکا لگا کہ سیل فون ہاتھ سے پھسل کر نیچے پائیدان پر جا گرا۔

سنسنی خیز کہانی کے واقعات

آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے

بغاوت

مظہر سلیم ہاشمی

کسی بھی ملک میں ہونے والی بغاوت بڑی تباہی کا سبب بنتی ہے... اور اقتدار کی رسّا کشی میں متعدد جانیں چلی جاتی ہیں... سفری و مواصلاتی نظام سب کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے... ایسے میں وہاں پھنسے لوگ کس عذاب سے گزرتے ہیں، اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے... مگر بعض دفعہ یہی بغاوت دو حریفوں کو آپس میں ملا دیتی ہے۔

بغاوت کے دوران دوسرے ملک میں پھنس جانے والے دو بزنس مینوں کا احوال

اپنی دم پر انگریزی کے حرف "P" کا ایک بڑا نشان لیے نیلے اور سلور رنگ کا بوئنگ طیارہ 707 لاگوس بین الاقوامی ہوائی اڈے کے شمالی سرے پر رینگتے ہوئے رکا تھا۔ چھ سیاہ مرسڈیز گاڑیوں کا بیڑا طیارے کے قریب پہنچا اور زمین پر رینگتے مگرمچھوں کی طرح قطار بنا کر انتظار میں کھڑا ہو گیا۔

پسینے میں شرابور چھ وردی پوش ڈرائیور باہر نکلے اور چوکنا کھڑے ہو گئے۔ جب پہلی گاڑی کے ڈرائیور نے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا تو فیڈرل گارڈ کا کرنل حنان باہر نکلا اور تیزی سے مسافروں کی سیڑھیوں کے نچلے حصے کی طرف بڑھا۔ ان سیڑھیوں کو ہوائی اڈے کے چار ملازمین نے عجلت میں ان کی جگہ پر لگایا تھا۔

اگلے حصے کے کیبن کا دروازہ کھلا تو کرنل نے اوپر کی جانب دیکھا۔ کیبن کے تاریک اندرونی حصے کے پس منظر میں ایک دبلی پتلی، پرکشش ائرہوسٹس کھڑی تھی۔ اس نے سلور بلیجنگ والا نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے کوٹ کے کالر پر بھی ایک بڑا "P" نمایاں تھا۔ وہ مڑی اور کیبن کی سمت میں سرہلایا۔

چند لمحوں بعد ایک بے عیب لباس میں ملبوس، گھنے سیاہ بالوں اور گہری بھوری آنکھوں والا لمبا شخص دروازے میں اس کی جگہ نمودار ہوا۔ اس شخص کے گرد ایک فطری وقار اور مقناطیسیت تھی۔

اسے دیکھتے ہی کرنل نے سلیوٹ کیا۔ پریجیو سلطنت کے سربراہ سرایڈوارڈو فرانسسکو ڈی سلویرا نے سرسری سا اثبات میں سرہلایا۔

ڈی سلویرا اپنے ائرکنڈیشنڈ 707 کی ٹھنڈک سے نائجیریا کی جھلسانے والی دھوپ میں بغیر کسی بے چینی کے نمودار ہوا تھا۔ کرنل اس لیے، نفیس برازیلین کو اس کے پرائیویٹ سیکریٹری کے ہمراہ اگلی مرسیڈیز کی طرف لے گیا۔ پریجیو کا باقی عملہ طیارے کی پچھلی سیڑھیوں سے اترا اور باقی کی پانچ گاڑیوں میں بیٹھ گیا۔

ڈرائیور ایک کارپورل فوجی افسر تھا جسے معزز مہمان کے لیے دن رات دستیاب رہنے پر مامور کیا گیا تھا۔ اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور سلیوٹ کیا۔

ڈی سلویرا نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ کارپورل گھبراہٹ آمیز انداز میں مسکرایا جس سے اس کے سفید دانت نمودار ہوئے۔ ایڈوارڈو نے زندگی میں آج تک اتنے بڑے دانت کسی انسان کے نہیں دیکھے تھے۔

"لاگوس میں خوش آمدید!" کارپورل نے اسے ویلکم کہا۔ "امید ہے آپ نائجیریا میں بہت بڑی ڈیل کریں گے۔"

ایڈوارڈو نے ایک بار پھر اسے نظرانداز کرتے ہوئے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اپنی سیٹ پر پیچھے کی جانب ہوکر بیٹھ گیا۔

وہ کھڑکی سے باہر برٹش ائرویز کے 707 کے مسافروں کو دیکھنے لگا جو اس سے ذرا پہلے اترا تھا۔ وہ مسکرا اٹھا کہ کہاں وہ اکیلا اس جیسے طیارے پر سوار تھا اور کہاں برطانیہ کے اتنے مسافروں کو یہاں تک لانے کے لیے ایک جہاز مخصوص تھا...... اور اب وہ تمام مسافر شدید گرمی میں کسٹم کلیئرنس کے لیے قطار میں کھڑے تھے۔

ڈرائیور نے گاڑی کو پہلے گیئر میں ڈالا اور سیاہ گاڑیوں کا قافلہ اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ کرنل عثمان، کارپورل کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھا۔ وہ جلدی سمجھ گیا کہ برازیلین مہمان کو فضول گفتگو پسند نہیں ہے۔

اپنے باس کے ساتھ بیٹھے سیکریٹری نے ایک بار بھی منہ نہیں کھولا تھا۔ کرنل، جو مثال قائم کرنے کا عادی تھا، خاموش رہا اور ڈی سلویرا کو اپنی مہم کے حوالے سے منصوبے بنانے اور اس پر غور کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔

ایڈوارڈو فرانسسکو ڈی سلویرا، ریو ڈی جینیرو سے سو میل شمال میں واقع چھوٹے سے گاؤں ریٹیلی میں پیدا ہوا تھا۔ وہ برازیل کے دو سب سے طاقتور خاندانوں میں سے ایک کا وارث تھا۔ اس نے سوئٹزرلینڈ میں نجی تعلیم حاصل کی اور پھر لاس اینجلس میں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہارورڈ بزنس اسکول سے تعلیم مکمل کی۔ ہارورڈ کے بعد وہ امریکا سے برازیل واپس آیا اور فرم میں نہ تو سب سے اوپر اور نہ ہی سب سے نیچے بلکہ درمیان سے کام شروع کیا، جہاں اس نے بیتاس گیرلیس میں اپنے خاندان کے کان کنی کے مفادات کو سنبھالا۔ اس نے تیزی سے اوپر کا راستہ بنایا۔ اپنے والد کے منصوبے سے بھی زیادہ تیزی سے اس نے سب کچھ سنبھال لیا تھا۔ لڑکا اپنے باپ سے بھی دو قدم آگے نکلا تھا۔

اٹھیس سال کی عمر میں اس نے ماریا سے شادی کی جو اس کے والد کے سب سے قریبی دوست کی بڑی بیٹی تھی۔

بارہ سال بعد، جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو ایڈوارڈو پریجیو تخت کا وارث بنا۔ کل سات بیٹے تھے۔ دوسرا بیٹا الفریڈو اب بینکنگ کا انچارج تھا، جواؤ شپنگ انڈسٹری چلاتا تھا، کارلوس تعمیرات کا ذمے دار تھا، مینوئل خوراک اور سپلائی کا انتظام کرتا تھا، جیمے خاندانی اخبارات چلاتا تھا اور چھوٹا انتونیو آخری اور یقیناً سب سے کم اہم خاندانی فارمز چلاتا تھا۔

تمام بھائی کسی بھی بڑے فیصلے سے پہلے ایڈوارڈو کو رپورٹ کرتے تھے کیونکہ وہ برازیل کی سب سے بڑی نجی کمپنی کا چیئرمین تھا۔ باوجود اس کے کہ اس کے پرانے خاندانی دشمن مینوئل روڈریگز، جو بھی شیخی بھرے دعوے کرتے...... وہ واقعی برازیل کی سب سے بڑی کمپنی کا سربراہ تھا۔

جب 1964ء میں جنرل کاسٹیلو برانکو کی فوجی حکومت نے سول حکومت کا تختہ الٹا تو جرنیلوں نے اتفاق کیا کہ وہ تمام ڈی سلویرا یا روڈریگز کو ختم نہیں کرسکتے۔ اس لیے

ہیں ان دو حریف خاندانوں کے ساتھ جینا سیکھنا ہوگا۔

ڈی سلویرا نے بھی ہمیشہ اپنی عقل مندی کا مظاہرہ کیا کہ سیاست میں بھی شامل ہونے کی کوشش نہیں کی، سوائے اس کے کہ ہر سرکاری افسر، فوجی یا سول، کو اس کے عہدے کے مطابق ادائیگی کرتے رہے۔ اس سے یہ ہوا کہ جو بھی گروہ اقتدار میں آیا، پرانیو سلطنت اس کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔

ڈی سلویرا کے اپنے مصروف شیڈول میں لاگوس کے دورے کے لیے تین دن مختص کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ نائجیریا کا حکومتی نظام برازیل سے کافی ملتا جلتا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ کم از کم اس پروجیکٹ پر اس نے میونل روڈریگز کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ اس کا یہ قدم ریو ائرپورٹ کا ٹینڈر اس کے ہاتھوں کھونے کا ازالہ کر دینے والا تھا۔ ایڈورڈو اس خیال پر مسکرایا کہ روڈریگز کو اندازہ ہی نہیں کہ وہ نائجیریا میں ایک ایسی ڈیل کرنے کے لیے موجود ہے جو اسے اپنے حریف سے دگنا بڑا بزنس مین بنا سکتی ہے۔

ٹریفک سگنلز کی پروا کیے بغیر جب سیاہ مرسیڈیز آہستہ آہستہ پر ہجوم اور شور شرابے والی سڑکوں سے گزر رہی تھی تو ایڈورڈو کو نائجیرین سربراہِ مملکت جنرل محمد کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ یہ ملاقات برازیل میں نائجیرین صدر کے سرکاری دورے کے موقع پر ہوئی تھی۔ جنرل محمد کے اعزاز میں دیے گئے عشائیے میں تقریر کرتے ہوئے صدر ارنستو جیسل نے امید ظاہر کی کہ دونوں ممالک سیاست اور تجارت میں قریبی تعاون کی طرف بڑھیں گے۔

ایڈورڈو نے غیر منتخب راہنما سے اتفاق کیا اور خوشی سے سیاست کو صدر کے لیے چھوڑ دیا تاکہ وہ اسے اس کے انداز میں تجارت جاری رکھنے کی اجازت دیں۔ وہ اسی میں خوش تھا۔

جنرل محمد نے مہمانوں کی جانب سے جواب دیا۔ اس نے ایک ایسے انگریزی لہجے میں بات کی جو عام طور پر صرف آکسفورڈ سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ جنرل نے اس پروجیکٹ پر تفصیل سے بات کی جو ان کے دل کے سب سے قریب تھا۔

ابوجا میں ایک نیا نائجیرین دارالحکومت تعمیر کرنا تھا۔ ایک ایسا شہر جسے برازیل کا حریف سمجھا جا سکے۔

تقاریر ختم ہونے کے بعد جنرل نے ڈی سلویرا کو ایک طرف لیا اور ابوجا سٹی پروجیکٹ کے بارے میں مزید تفصیل سے بات کی اور پوچھا۔

"کیا وہ بھی ٹینڈر پر غور کر سکتے ہیں؟"

ایڈورڈو مسکرایا اور صرف یہ خواہش کی کہ کاش اس کا دشمن روڈریگز وہ گفتگو سن سکتا جو وہ نائجیرین سربراہِ مملکت کے ساتھ کر رہا تھا۔

ایڈورڈو نے ایک ہفتے بعد بھیجی گئی تجویز کے مسودے کا بغور مطالعہ کیا اور جنرل کی پہلی درخواست پر اتفاق کرتے ہوئے سات آدمیوں کی ایک ریسرچ ٹیم کو ابوجا پر فزیبلٹی اسٹڈی رپورٹ مکمل کرنے کے لیے لاگوس بھیج دیا۔ ایک ماہ بعد ہی ٹیم کی تفصیلی رپورٹ ڈی سلویرا کے ہاتھوں میں تھی۔

• ایڈورڈو اس نتیجے پر پہنچا کہ پروجیکٹ کی متوقع منافع خیزی نائجیرین حکومت کو مکمل تجویز پیش کرنے کے قابل ہے۔ اس نے ذاتی طور پر جنرل محمد سے رابطہ کیا۔ گفتگو کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ مکمل طور پر متفق ہیں اور آگے کے کام بڑھانے کی اجازت دے دی۔

اس بار تیس آدمی لاگوس بھیجے گئے اور تین ماہ اور 170 صفحات کے بعد ایڈورڈو نے تجویز پر دستخط کیے اور مہر لگائی جس کا نام "نائجیریا کے لیے ایک نیا دارالحکومت" تھا۔ اس نے حتمی دستاویز میں صرف ایک تبدیلی کی۔ تجویز کا سرورق نیلے اور سلور رنگ میں تھا جس کے درمیان میں پرچم لوگو تھا۔ ایڈورڈو نے اسے سبز اور سفید یعنی نائجیریا کے قومی رنگوں میں تبدیل کروا دیا جس پر دو گھوڑوں پر سوار ایک عقاب کا قومی نشان تھا۔

اسے احساس تھا کہ یہ چھوٹی چیزیں ہی ہیں جو جرنیلوں کو متاثر کرتی ہیں اور اکثر پلڑا بھاری کر دیتی ہیں۔ اس نے فزیبلٹی اسٹڈی کی دس کاپیاں نائجیریا کے سربراہِ مملکت کو ایک ملین ڈالرز کے انوائس کے ساتھ بھیج دیں۔

جب جنرل محمد نے تجویز کا مطالعہ کر لیا تو انہوں نے سلویرا کو پروجیکٹ کے اگلے مرحلے پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے اپنے مہمان کے طور پر نائجیریا آنے کی دعوت دی۔ ڈی سلویرا نے جواب میں عارضی طور پر دعوت قبول کی اور شائستگی سے لیکن مضبوطی سے نشاندہی کی کہ اسے ابھی تک ابتدائی فزیبلٹی اسٹڈی پر خرچ ہونے والے ایک ملین ڈالرز کی ادائیگی موصول نہیں ہوئی ہے۔ رقم سینٹرل بینک آف نائجیریا سے واپسی ٹیلیکس کے ذریعے بھیج دی گئی اور ڈی سلویرا اپنی ڈائری میں "نئے وفاقی دارالحکومت کے پروجیکٹ" کے لیے مسلسل چار دن نکالنے میں کامیاب رہا۔

urdunovelists.com

اس کے شیڈول کا تقاضا تھا کہ وہ پیر کی صبح لاگوس پہنچے کیونکہ اسے جمعرات کی رات تک پیرس میں ہونا تھا۔

جب یہ خیالات ایڈوارڈو کے ذہن میں گردش کر رہے تھے، تب تک مرسیڈیز گاڑیاں ڈوڈن بیرکس کے باہر رک گئیں۔ لوہے کے گیٹ کھلے اور ایک مکمل مسلح گارڈ نے جنرل سلیوٹ پیش کیا۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو عام طور پر صرف آنے والے سربراہِ مملکت کو دیا جاتا تھا۔

تمام گاڑیاں آہستہ آہستہ گیٹ سے گزریں اور صدر کی نجی رہائش گاہ کے باہر رک گئیں۔ ایک بریگیڈیئر سیڑھیوں پر ڈی سلویرا کو صدر تک لے جانے کے لیے انتظار کر رہا تھا۔

دونوں نے ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک ساتھ کھانا کھایا جو برطانوی افسروں کے میس سے کافی ملتا جلتا تھا۔

کھانے کے دوران انہوں نے استوائی جنگل کے بیچ میں ایک پورا نیا شہر تعمیر کرنے کے مسائل پر عمومی بات چیت کی۔ پروجیکٹ کی لاگت کا عبوری تخمینہ ایک ہزار ملین ڈالرز تھا لیکن جب ڈی سلویرا نے صدر کو خبردار کیا کہ حتمی نتیجہ تین ہزار ملین کے قریب جا سکتا ہے تو صدر کا جبڑا تھوڑا سا لٹک گیا۔ ڈی سلویرا کو تسلیم کرنا پڑا کہ یہ پروجیکٹ پریٹیو انٹرنیشنل کا اب تک کا سب سے پرعزم منصوبہ ہوگا، لیکن اس نے صدر کو فوراً یہ بھی بتایا کہ دنیا کی کسی بھی تعمیراتی کمپنی کے لیے بھی بات سچ ہوگی۔

ڈی سلویرا اپنا بہترین کارڈ جلدی کھیلنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے کافی تک انتظار کیا اور پھر گفتگو میں یہ بات شامل کی کہ اسے ابھی ابھی شدید مخالفت کے باوجود ایمیزون کے جنگل میں آٹھ لین والی شاہراہ تعمیر کرنے کا ٹھیکا ملا ہے۔ یہ شاہراہ بالآخر پین امریکن ہائی وے سے جڑے گی۔ ایک ایسا ٹھیکا جو حجم میں صرف اس پروجیکٹ کے بعد دوسرے نمبر پر تھا جس پر وہ اب نائیجیریا میں غور کر رہے تھے۔

صدر متاثر ہوئے اور پوچھا کہ کیا یہ منصوبہ ڈی سلویرا کو نئے دارالحکومت کے پروجیکٹ میں شامل ہونے سے تو نہیں روکے گا؟

”مجھے اس سوال کا جواب تین دن میں معلوم ہو جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

اپنے دورے کے اختتام پر سربراہِ مملکت کے ساتھ مزید بات چیت کرنے کا وعدہ کیا۔ اس نے صدر کو بتایا کہ تب وہ انہیں واضح کر دے گا کہ آیا وہ اس منصوبے کو جاری رکھنے کے لیے تیار ہے یا نہیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ایڈوارڈو کو فیڈرل پیلس ہوٹل لے جایا گیا جہاں پوری چھٹی منزل اس کے اختیار میں دے دی گئی تھی۔

چھ مرسیڈیز گاڑیاں ہوٹل کے باہر رکیں اور کرنل اپنے مہمان کو گھومتے دروازوں اور استقبالیہ سے گزار کر لے گیا۔

ایڈوارڈو نے پچھلے چودہ سالوں سے کسی ہوٹل میں خود چیک اِن نہیں کیا تھا سوائے ان مواقع کے جب اس نے فرضی نام سے رجسٹر ہونے کا انتخاب کیا تھا تاکہ کوئی نہ جان سکے کہ اس کے ساتھ کون سی عورت ہے۔

پریٹیو انٹرنیشنل کا چیئرمین ہوٹل کی مرکزی راہداری کے بیچ میں چلتا گیا اور انتظار کرتی لفٹ میں قدم رکھا۔ اس کی ٹانگیں کمزور پڑ گئی تھیں اور اسے اچانک تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ لفٹ کے کونے میں ایک چھوٹے قد کا گنجا، بھاری بھرکم آدمی کھڑا تھا جس نے پرانی جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کا منہ مسلسل کھل اور بند ہو رہا تھا کیونکہ وہ چیونگم چبا رہا تھا۔

دونوں آدمی ایک دوسرے سے جتنا دور ہو سکے، کھڑے رہے اور کسی نے جان پہچان ہونے کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ لفٹ پانچویں منزل پر رکی اور مینوئل روڈریگز، روڈریگز انٹرنیشنل کا چیئرمین باہر نکل گیا اور اس آدمی کو پیچھے چھوڑ گیا جو تیس سالوں سے اس کا سخت حریف رہا تھا۔

ایڈوارڈو نے خود کو سنبھالنے کے لیے لفٹ میں ریلنگ کو پکڑا کیونکہ اسے اب بھی چکر آ رہے تھے۔ وہ اس ان پڑھ خود ساختہ نودولتیے سے کس قدر نفرت کرتا تھا، وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ روڈریگز کے چار سوتیلے بھائیوں کے خاندان جو سب مختلف باپوں سے تھے، کا دعویٰ تھا کہ وہ اب برازیل کی سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی چلا رہے ہیں۔

دونوں آدمی ایک دوسرے کی ناکامی میں اتنی ہی دلچسپی رکھتے تھے جتنی اپنی کامیابی میں۔

ایڈوارڈو کچھ الجھن میں تھا کہ آخر روڈریگز لاگوس میں کیا کرنے کے لیے آ سکتا ہے کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کے حریف کا نائیجیرین صدر سے کوئی رابطہ نہیں ہوا ہے۔

ایڈوارڈو کبھی کسی کے سامنے اعتراف نہ کرتا کہ روڈریگز کی موجودگی اسے پریشان کر رہی ہے، لیکن پھر بھی اس نے فوراً یہ پتا لگانے کا فیصلہ کیا کہ اس کے پرانے دشمن کو نائیجیریا کیا چیز لائی ہے۔

اپنے سوئٹ پہنچتے ہی ڈی سلویرا نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کو ہدایت کی کہ وہ چیک کرے کہ مینوئل روڈ ریگز کیا کر رہا ہے۔

ایک گھنٹے کے اندر ہی اس کا پرائیویٹ سیکریٹری اس معلومات کے ساتھ واپس آیا جو اس کے چیئرمین نے طلب کی تھی۔

اس نے دریافت کیا تھا کہ روڈ ریگز وہاں لاگوس میں ایک نئی بندرگاہ تعمیر کرنے کے ٹھیکے کے لیے ٹینڈر دینے نائجیریا میں آیا ہے اور بظاہر نئے دارالحکومت کے ساتھ کسی بھی طرح ملوث نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ابھی تک صدر کے ساتھ ملاقات کا انتظام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بندرگاہوں کا انچارج کون سا وزیر ہے اور مجھے اس سے کب ملنا ہے؟'' ڈی سلویرا نے پوچھا۔

سیکریٹری نے اپنی اپائنٹمنٹس فائل میں تلاش کیا۔

''وزیر نقل و حمل......!'' سیکریٹری نے کہا۔ ''آپ کی ان کے ساتھ جمعرات کی صبح نو بجے کی اپائنٹمنٹ ہے۔''

نائجیرین سول سروس نے ڈی سلویرا کے لیے ملاقاتوں کا چار روزہ شیڈول تیار کیا تھا جس میں نئے سٹی پروجیکٹ میں شامل ہر کابینہ وزیر شامل تھا۔

''یہ صدر کے ساتھ آپ کی حتمی بات چیت سے پہلے آخری ملاقات ہے، پھر آپ پیرس کے لیے پرواز کریں گے۔'' سیکریٹری نے مزید بتایا۔

''بہترین...... وزیر سے ملنے سے پانچ منٹ پہلے اور صدر سے بات کرتے وقت مجھے اس گفتگو کی یاد دلا دینا۔'' سیکریٹری نے فائل میں نوٹ کیا اور چلا گیا۔

ایڈوارڈو اپنے سوئٹ میں اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ اپنے ماہرین کی طرف سے جمع کرائی گئی نئے دارالحکومت کے پروجیکٹ کی رپورٹس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی ٹیم کے کچھ ارکان میں پہلے ہی گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

ایک خاص تشویش جو ہمیشہ ایک بڑے تعمیراتی ٹھیکے کے ساتھ آتی تھی، وہ ابتدائی پرنسپل رقم کی ادائیگی کی صلاحیت...... اور وقت پر ادائیگی تھی۔ ایسا نہ کرنا دیوالیہ پن کا تیز ترین راستہ تھا۔ لیکن نائجیریا میں تیل کی دریافت کے بعد سے آمدنی کی کوئی کمی نہیں لگ رہی تھی۔ یقیناً حکومت کی جانب سے پیسا خرچ کرنے کے لیے تیار لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان خدشات نے ڈی سلویرا کو پریشان نہیں کیا تھا، حالانکہ وہ ہمیشہ پیشگی ادائیگی پر اصرار کرتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ خود یا اس کا وسیع عملہ برازیل سے ایک سینٹی میٹر بھی باہر نہیں نکلتا۔

تاہم اس خاص ٹھیکے کا بڑے پیمانے کا دائرۂ کار حالات کو کچھ زیادہ ہی غیر معمولی بنا رہا تھا۔ ایڈوارڈو نے محسوس کیا کہ اگر اس نے کام شروع کیا اور پھر اسے مکمل نہ کر پایا تو یہ اس کی بین الاقوامی ساکھ کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگا۔

اپنی بیوی کو کال کرنے کی ناکام کوشش میں ایک گھنٹا ضائع کرنے کے بعد اس نے اپنے کمرے میں خاموشی سے رات کا کھانا کھاتے ہوئے رپورٹس دوبارہ پڑھیں اور جلدی سونے چلا گیا۔

اگلی صبح ڈی سلویرا کی پہلی اپائنٹمنٹ سینٹرل بینک آف نائجیریا کے گورنر کے ساتھ تھی۔

ایڈوارڈو نے نیا استری شدہ سوٹ، قمیص اور انتہائی چمکدار جوتے پہنے ہوئے تھے۔ وہ بے شمار نئے ملبوسات لے کر آیا تھا۔ چار دن تک کوئی اسے ایک بار پہلے سے پہنے ہوئے کپڑوں میں دوبارہ نہیں دیکھتا۔

8:45 پر اس کے سوئٹ کے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک ہوئی۔ سیکریٹری نے دروازہ کھولا تو کرنل عثمان کو چوکنا کھڑے پایا۔ وہ ایڈوارڈو کو بینک لے کر جانے کے لیے انتظار کر رہا تھا۔

جب وہ ہوٹل سے نکل رہے تھے تو ایڈوارڈو نے دوبارہ مینوئل روڈ ریگز کو دیکھا جس نے وہی پرانی جینز، وہی سلوٹ زدہ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور شاید وہی گم چبا رہا تھا۔

اس وقت وہ ایک بی ایم ڈبلیو میں بیٹھ رہا تھا۔ ڈی سلویرا نے غائب ہوتی بی ایم ڈبلیو پر تیوری چڑھانا صرف تب بند کیا جب اسے بندرگاہوں کے انچارج وزیر کے ساتھ جمعرات کی صبح کی اپنی اپائنٹمنٹ یاد آئی، جس کے بعد صدر کے ساتھ اس کی ملاقات طے تھی۔

سینٹرل بینک آف نائجیریا کے گورنر کو یہ تجویز کرنے کی عادت تھی کہ ادائیگی کے شیڈول کیسے پورے ہوں گے اور تکمیل کے آرڈرز کی ضمانت کیسے دی جائے گی۔

ایڈوارڈو کی اگلی اپائنٹمنٹ دوپہر کے کھانے کے لیے برازیلی سفیر کے ساتھ ایک ناگزیر رسمی ملاقات تھی۔ اسے ان تقریبات سے نفرت تھی کیونکہ اس کا ماننا تھا کہ سفارت خانے صرف کاک ٹیل پارٹیوں اور پرانی معمولی باتوں پر بحث کے لیے موزوں ہیں، جن میں سے کسی کی وہ پروا نہیں کرتا تھا۔

اس موقع پر بھی کچھ مختلف نہیں ہوا اور اس ملاقات

معلومات تھیں کہ
سے حاصل ہونے والا واحد فائدہ۔ جو
مینوئل روڈریگز لاگوس میں نئی بندرگاہ کی تعمیر کے لیے تین کی شارٹ لسٹ میں شامل ہے اور اگر اسے ٹھیکا ملا تو وہ جمعے کو صدر سے ملاقات کی توقع کر رہا ہے۔

”جمعرات کی صبح تک دوسری کمپنی شارٹ لسٹ ہو جائے گی اور صدر کے ساتھ کوئی ملاقات نہیں ہوگی۔“ ڈی سلویرا نے خود سے وعدہ کیا۔

یہ سوچتے ہوئے کہ دوپہر کے کھانے سے اسے زیادہ سے زیادہ بھی فائدہ ہونے والا ہے۔ یہاں تک کہ سفیر نے مزید کہا۔

”روڈریگز اس بات کا سب سے زیادہ خواہشمند لگتا ہے کہ ابوجا میں نئے شہر کا ٹھیکا آپ کو ملے۔ وہ ہر اس وزیر کے سامنے آپ کی تعریفیں کر رہا ہے جس سے وہ ملتا ہے۔“

”عجیب بات ہے۔“ ایڈورڈو نے کہا۔

سفیر نے اپنی بات کو جاری رکھا۔ ”میں ہمیشہ سمجھتا تھا کہ آپ دونوں کی آپس میں نہیں بنتی۔“

ایڈورڈو نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے مقصد پر بڑھا چڑھا کر باتیں کرتے ہوئے روڈریگز کون سی چال چل رہا ہے۔

ایڈورڈو نے دوپہر وزیرِ خزانہ کے ساتھ گزاری اور ان عارضی انتظامات کی تصدیق کی جو اس نے بینک کے گورنر کے ساتھ کیے تھے۔

اس شام ایڈورڈو نے اپنے سینئر مشیروں کے ساتھ نجی طور پر کھانا کھایا۔ یہ لوگ خود پہلے ہی وزراء کے اہلکاروں کے ساتھ معاملات طے کر رہے تھے۔ ہر کوئی اب روزانہ کی رپورٹس کے ساتھ آ رہا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ اگر انہوں نے نائیجیریا میں کام کیا تو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے چیف انجینئر نے فوراً اس بات پر زور دیا کہ ہنرمند مزدور کسی بھی قیمت پر کرائے پر نہیں لیے جا سکتے کیونکہ جرمنوں نے اپنے وسیع روڈ پروجیکٹس کے لیے مارکیٹ پر پہلے ہی قبضہ کر رکھا ہے۔

مالیاتی مشیروں نے بھی ایک مایوس کن رپورٹ پیش کی۔ بین الاقوامی کمپنیاں چھ مہینے یا اس سے زیادہ اپنے چیک سینٹرل بینک سے کلیئر ہونے کا انتظار کرتی ہیں۔ ایڈورڈو نے ان کے خیالات پر نوٹ بنائے لیکن اپنی رائے نہیں دی۔ اس کا عملہ گیارہ بجے کے کچھ بعد چلا گیا اور اس نے سونے سے پہلے ہوٹل کے گراؤنڈز میں چہل قدمی کرنے کا فیصلہ کیا۔

سرسبز باغات میں اپنی چہل قدمی کے دوران اس نے مینوئل روڈریگز کے ساتھ براہِ راست تصادم سے بچنے کے لیے صرف ایک بڑے پودے کے پیچھے خود کو بمشکل چھپایا۔

”جمعرات کی سہ پہر تک روڈریگز تم منصوبوں سے بھرے سوٹ کیس کے ساتھ برازیل واپس جا رہے ہوگے جسے ”منسوخ شدہ پروجیکٹس“ کہا جا سکتا ہے۔“

☆☆☆

کرنل عثمان اگلے دن دوبارہ ٹھیک وقت پر پہنچا...... وہی 8:45۔

ایڈورڈو نے صبح وزیرِ سپلائز اینڈ کوآپریٹو کے ساتھ گزاری۔ اس نے بعد میں اپنے پرائیویٹ سیکریٹری سے وزیر کی نااہلی پر تبصرہ کیا تھا۔

دوپہر وزیرِ محنت کے ساتھ غیر ہنرمند کارکنوں کی دستیابی اور ہنرمند کارکنان کی کمیابی کی مکمل جانچ پڑتال میں گزری۔ ایڈورڈو تیزی سے اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ متعلقہ وزراء کی ظاہری امید پرستی کے باوجود یہ ان کا سب سے مشکل ٹھیکا ہونے والا تھا جو اس نے کبھی لیے تھے۔ اگر پوری بین الاقوامی کاروباری دنیا اسے منہ کے بل گرتے دیکھتی تو پیسے سے زیادہ اس کی ساکھ کو نقصان ہوتا۔

شام کو اس کے عملے نے چند پرانے مسائل حل کرکے اور کچھ نئے نکال کر اسے دوبارہ رپورٹ دی۔ عارضی طور پر وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اگر موجودہ حکومت اقتدار میں رہی تو ادائیگی کے بارے میں کوئی سنجیدہ تشویش کی ضرورت نہیں کیونکہ صدر نے نئے شہر کو ترجیحی پروجیکٹ کے طور پر مختص کیا تھا۔ انہوں نے یہ افواہ بھی سنی تھی کہ اگر ہنرمند مزدوروں کی کمی ہوئی تو فوج سروس کور کا حصہ قرض دینے پر آمادہ ہوگی۔

اس رات ایڈورڈو جب سونے سے قبل اپنا ریشمی پاجامہ پہن رہا تھا تو اس کے خیالات پر جو قابض تھا، وہ ہنرمند مزدوروں کا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ مینوئل روڈریگز کی برازیل کے لیے فوری اور اچانک روانگی کے خیال پر ہنس رہا تھا۔ اس رات ایڈورڈو اچھی نیند سویا۔

وہ اگلی صبح نئی توانائی کے ساتھ اٹھا، نہایا اور ایک نیا سوٹ زیبِ تن کیا۔ چار دن بہت کارآمد ثابت ہو رہے تھے اور ایک تیر سے دو شکار بہ آسانی کیے جا سکتے تھے۔

8:45 پر وہ بے صبری سے کرنل کا انتظار کر رہا تھا۔ کرنل اس صبح اپنے مقررہ وقت پر نہیں آیا اور تب تک ظاہر نہیں ہوا جب تک اس کی چمنی پر رکھی گھڑی نے 9 کا گھنٹا

...یں بجھا دیا۔ ڈی سلویرا نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کو یہ پتا لگانے کے لیے بھیجا کہ وہ کہاں ہے جبکہ وہ خود غصے سے ہوٹل کے سوئٹ میں آگے پیچھے ٹہل رہا تھا۔ اس کا سیکریٹری چند منٹ بعد گھبراہٹ میں واپس آیا۔

"ہوٹل کو مسلح گارڈز نے گھیر لیا ہے۔" سیکریٹری نے اسے مطلع کیا۔

ایڈوارڈو بالکل بھی نہیں گھبرایا۔ وہ اپنی زندگی میں آٹھ بغاوتوں سے گزر چکا تھا، جن سے اس نے ایک سنہری اصول سیکھا تھا...... نئی حکومت کبھی بھی آنے والے غیر ملکیوں کو نہیں مارتی کیونکہ اسے ان کے پیسے کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ پچھلی حکومت کو۔

ایڈوارڈو نے ٹیلی فون اٹھایا لیکن کسی نے اسے جواب نہیں دیا تو اس نے ریڈیو آن کیا۔ ایک ٹیپ ریکارڈنگ چل رہی تھی۔

"یہ ریڈیو نائجیریا ہے...... یہ ریڈیو نائجیریا ہے۔ ایک بغاوت ہوئی ہے۔ جنرل محمد کا تختہ الٹ دیا گیا ہے اور لیفٹیننٹ کرنل ڈمکا نے نئی انقلابی حکومت کی قیادت سنبھال لی ہے...... ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے گھر پر رہیں...... چند گھنٹوں میں سب کچھ معمول پر آجائے گا...... یہ ریڈیو نائجیریا ہے...... یہ ریڈیو نائجیریا ہے...... ایک......"

ایڈوارڈو نے ریڈیو بند کردیا کیونکہ دو خیالات اس کے ذہن میں آئے۔ بغاوتیں ہمیشہ ہر چیز کو روک دیتی ہیں اور افراتفری کا باعث بنتی ہیں، اس لیے بلاشبہ اس نے چار دن ضائع کیے تھے...... لیکن اس سے بھی بدتر...... کیا اب اس کے لیے نائجیریا سے باہر نکلنا اور باقی دنیا کے ساتھ اپنا معمول کا کاروبار جاری رکھنا ممکن ہوگا؟

دوپہر کے کھانے تک ریڈیو پر فوجی موسیقی چل رہی تھی جس کے درمیان ریکارڈ شدہ پیغام چلتا تھا۔ ایڈوارڈو نے اپنے تمام عملے کو مامور کیا کہ وہ جو کچھ بھی پتا کرسکیں، کریں اور اسے براہِ راست رپورٹ کریں۔ وہ سب ایک ہی کہانی کے ساتھ واپس آئے کہ ہوٹل کو گھیرے ہوئے سپاہیوں سے گزرنا ناممکن تھا، اس لیے کوئی نئی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔

ایڈوارڈو نے مہینوں میں پہلی بار گالیاں دیں۔ اس کی تکلیف میں اضافہ کرنے کے لیے ہوٹل منیجر نے فون کرکے افسوسناک اطلاع دی۔

"افسوس کے ساتھ عرض ہے مسٹر ڈی سلویرا کہ آپ کو مین ڈائننگ روم میں کھانا، کھانا ہوگا کیونکہ اگلے نوٹس تک کوئی روم سروس نہیں ہوگی۔"

ایڈوارڈو کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ ڈائننگ روم میں پہنچ گیا۔ اسے مایوسی ہوئی کہ ہیڈ ویٹر نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی کہ وہ کون ہے اور اسے بے پروائی سے ایک چھوٹی میز پر بٹھا دیا جس پر پہلے ہی تین اطالوی قابض تھے۔

مینوئل روڈریگز اس سے صرف دو میزیں دور بیٹھا تھا۔ ایڈوارڈو کا بدن اس خیال سے ہی اکڑ گیا کہ وہ اس کی پریشانی سے لطف اندوز ہورہا ہے اور پھر یاد آیا کہ اسی صبح اسے بھی تو بندرگاہوں کے وزیر سے ملنا تھا۔

اس نے سست روی سے پیش کیے جانے کے باوجود اپنا کھانا جلدی جلدی کھایا اور جب اطالویوں نے اس کے ساتھ گفتگو کرنے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ سے اشارہ کرکے منع کردیا۔ جیسے ہی اس نے دوسرا کورس ختم کیا، وہ اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ اس کے عملے کے پاس صرف گپ شپ تھی اور وہ سرکاری احتجاج درج کرانے کے لیے برازیلی سفارت خانے سے رابطہ کرنے سے قاصر تھے۔

"ایک حکومتی احتجاجی خط ہمارا بہت بھلا کرے گا۔" ایڈوارڈو نے اپنی کرسی پر گرتے ہوئے سوال کیا۔ "تم اسے کس کو بھجواؤ گے، نئی حکومت کو یا پرانی کو؟" اس کے عملے کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ سارا دن اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا رہا۔ دور کہیں ہونے والی گولا باری کی آواز سے محض اس کے آرام میں خلل پڑا۔

اگلی صبح ایڈوارڈو اسی سوٹ میں ملبوس تھا جو اس نے اپنی آمد کے دن پہنا تھا۔ اس کا استقبال اس کے سیکریٹری نے اس خبر کے ساتھ کیا کہ بغاوت کچل دی گئی ہے۔

"تفصیل بتاؤ۔" ایڈوارڈو نے غیر معمولی دلچسپی سے پوچھا۔

"پرانی حکومت نے دوبارہ اقتدار حاصل کرلیا ہے لیکن نقصانات بہت زیادہ ہوئے ہیں۔ بغاوت میں مارے جانے والوں میں سربراہِ مملکت جنرل محمد بھی شامل تھے۔" جواب میں سیکریٹری نے بتایا۔

سیکریٹری کی خبر کی سرکاری طور پر تصدیق ریڈیو نائجیریا پر بعد میں اسی صبح ہوگئی۔ ناکام بغاوت کا سرغنہ ایک لیفٹیننٹ کرنل ڈمکا تھا۔ ڈمکا ایک درجن جونیئر افسروں کے ساتھ فرار ہوگیا تھا اور حکومت نے شام سے صبح تک کرفیو کا حکم دیا تھا، جب تک کہ مجرم پکڑے نہ جائیں۔

وہ نائجیریا سے جلد روانگی کے لیے اپنے ذہن میں منصوبے بنا رہا تھا جب نیوز کاسٹر نے ایک ایسا اعلان کیا

urdunovels.com

جس نے اسے اندر تک سرد کر دیا۔
"جب تک لیفٹیننٹ کرنل ڈمکا اور اس کے ساتھی مفرور ہیں، ملک بھر کے ہوائی اڈے اگلے نوٹس تک بند رہیں گے۔"

ایڈورڈو شدید غصے میں نیچے گیا۔ ہوٹل ابھی تک مسلح گارڈز کے گھیرے میں تھا۔ اس نے چھ خالی مرسیڈیز گاڑیوں کے بیڑے کو گھورا جو سپاہیوں کی رائفلوں سے صرف دس گز آگے کھڑی تھیں۔ ہر طرف سے آنے والی مختلف زبانوں کے شور سے بچ کر وہ واپس لابی میں گیا۔ ایڈورڈو نے اپنے اردگرد دیکھا، یہ ظاہر تھا کہ بہت سے لوگ رات بھر ہوٹل میں پھنسے رہے تھے اور لاؤنج یا بار میں سوتے رہے۔ اس نے لابی میں پیپر بیک ریک کو کچھ پڑھنے کے لیے چیک کیا لیکن لاگوس کے لیے ٹورسٹ گائیڈ کی صرف چار کاپیاں باقی تھیں، باقی سب کچھ بک چکا تھا۔ وہ مصنفین جنہیں برسوں سے نہیں پڑھا گیا تھا، اب مہنگے داموں ہاتھوں ہاتھ بک رہے تھے۔

ایڈورڈو اپنے کمرے میں واپس آیا جو تیزی سے جیل کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس نے دوبارہ برازیلی سفیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ کیا وہ ملک چھوڑنے کے لیے خصوصی اجازت حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اس کے پاس اپنا طیارہ تھا۔ سفارت خانے کا فون کسی نے نہیں اٹھایا۔

وہ دوپہر کے کھانے کے لیے جلدی نیچے گیا تو دیکھا کہ ڈائننگ روم ایک بار پھر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایڈورڈو کو کچھ جرمنوں کے ساتھ ایک میز پر بٹھایا گیا جو ایک ٹھیکے کے بارے میں فکرمند تھے، جس پر حکومت نے ناکام بغاوت سے پہلے پچھلے ہفتے دستخط کیے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا اب بھی اس معاہدے پر عمل کیا جائے گا۔ مینول روڈریگز چند منٹ بعد کمرے میں داخل ہوا اور اسے اگلی میز پر بٹھایا گیا۔

دوپہر کے دوران ڈی سلویرا نے قدرے دکھ کے ساتھ اگلے سات دنوں کے لیے اپنے شیڈول کا جائزہ لیا۔ اسے اس صبح پیرس میں وزیر داخلہ سے ملنے کے لیے ہونا چاہیے تھا اور وہاں سے اسٹیل بورڈ کے چیئرمین سے مشورہ کرنے کے لیے لندن جانا چاہیے تھا۔ مئی میں اس کی فیملی ویکیشن تک اگلے 92 دنوں کے لیے اس کا کیلنڈر مکمل طور پر بک تھا۔

"میں اس سال کی چھٹیاں نائجیریا میں منا رہا ہوں۔" اس نے ایک اسسٹنٹ سے طنزیہ انداز میں کہا۔

بغاوت کے بارے میں جو چیز ایڈورڈو کو سب سے زیادہ ناگوار گزر رہی تھی، وہ بیرونی دنیا کے ساتھ رابطے کا فقدان تھا۔ وہ معلومات کے کسی بھی نئے ٹکڑے کے لیے ہر گھنٹے ریڈیو نائجیریا سن رہا تھا۔ پانچ بجے اسے پتا چلا کہ سپریم ملٹری کونسل نے ایک نیا صدر منتخب کیا ہے جو اس رات نو بجے ٹیلی وژن اور ریڈیو پر قوم سے خطاب کرے گا۔

ایڈورڈو ڈی سلویرا نے وقت پر ٹیلی وژن خود ہی آن کیا۔ عام طور پر ایک اسسٹنٹ نو بجنے میں ایک منٹ پر اسے آن کرتا تھا۔

9 بجے قومی ترانہ بجانے کے بعد نیا سربراہ مملکت جنرل اوباسانجو مکمل ڈریس یونیفارم میں اسکرین پر نمودار ہوا۔ اس نے سب سے پہلے مرحوم صدر کی المناک موت اور قوم کے لیے افسوسناک نقصان پر بات کی پھر اس نے تمام غیرملکی مہمانوں سے معافی مانگی، جنہیں بغاوت کی کوشش سے تکلیف پہنچی تھی، لیکن یہ واضح کر دیا کہ شام سے صبح والا کرفیو تب تک جاری رہے گا جب تک کہ باغی لیڈروں کو ڈھونڈ کر انصاف کے کٹہرے میں نہ لایا جائے۔

اس نے اس بات کا اعادہ کیا کہ جب تک لیفٹیننٹ کرنل ڈمکا محفوظ حراست میں نہ آ جائے، تمام ہوائی اڈے بند رہیں گے۔ نئے صدر نے اپنا بیان یہ کہہ کر ختم کیا کہ مواصلات کی دیگر تمام شکلیں جلد از جلد دوبارہ کھول دی جائیں گی۔ قومی ترانہ دوسری بار بجایا گیا تو ایڈورڈو ان لاکھوں ڈالرز کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس ہوٹل کے کمرے میں قید ہونے کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے نکل سکتے تھے۔ اس کا پرائیویٹ طیارہ صرف چند میل دور ائرپورٹ پر بیکار کھڑا تھا۔ اس کے ایک سینئر منیجر نے شرطیں لگانا شروع کر دیں کہ حکام کو لیفٹیننٹ کرنل ڈمکا کو پکڑنے میں کتنا وقت لگے گا۔ اس نے ڈی سلویرا کو یہ بتانے کی حماقت نہیں کی کہ ایک مہینے پر شرط کتنی کم تھی۔

☆☆☆

ایڈورڈو اسی لباس میں نیچے ڈائننگ روم میں گیا جو اس نے ایک دن پہلے پہنا تھا۔ ایک جونیئر ویٹر نے اسے کچھ فرانسیسیوں کے ساتھ ایک میز پر بٹھایا۔ جب انہوں نے اسے اپنی گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کی تو ایڈورڈو نے انکار میں ہاتھ ہلایا جیسے وہ ان کی زبان سمجھنے سے قاصر ہو۔ اس وقت اسے فرانسیسی وزیر داخلہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا نہ کہ کچھ فرانسیسی کنویں کھودنے والوں کے ساتھ۔

اچانک ہیڈ ویٹر اس کے پاس نمودار ہوا اور میز پر جھکی

UrduNovels.com

ہوئی واحد نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے میتوئل روڈ ریگز کو وہاں بٹھا دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے واقفیت ظاہر نہ کرنے کا ناٹک کیا۔ ایڈوارڈو نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا کہ آیا اسے میز چھوڑ دینی چاہیے یا اپنے ہی جاری رکھنا چاہیے، جیسے اس کا سب سے پرانا حریف اب بھی برازیل میں ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ موخر الذکر حرکت زیادہ باوقار رہے گی۔

فرانسیسیوں نے آپس میں بحث شروع کردی کہ وہ کب لاگوس سے باہر نکل سکیں گے۔ ان میں سے ایک نے زور دے کر اعلان کیا کہ اس نے اعلیٰ ترین اتھارٹی سے سنا ہے کہ حکومت ہوائی اڈے کھولنے سے پہلے بغاوت میں ملوث آخری فرد کو بھی ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اس میں ایک مہینا لگ سکتا ہے۔

ایڈوارڈو اور روڈریگز نے کہا کہ وہ نہیں رک سکتے۔ جس پر ایک فرانسیسی نے کہا کہ انہیں ڈمکا کی گرفتاری تک رکنا پڑے گا۔

دونوں برازیلیوں نے سر جھکا کر خاموشی سے اپنا کھانا جاری رکھا۔ جب ایڈوارڈو فارغ ہوا تو وہ میز سے اٹھا اور روڈریگز کی طرف براہ راست دیکھے بغیر پرتگالی میں شب بخیر کہا۔ پرانے حریف نے جواب میں صرف اپنا سر خم کر دیا۔

اگلے دن کوئی نئی معلومات سامنے نہیں آئیں۔ ہوٹل بدستور فوجیوں کے گھیرے میں تھا۔ وہ رات کے کھانے کے لیے اکیلا نیچے گیا اور جیسے ہی ڈائننگ روم میں داخل ہوا، اس نے میتوئل روڈریگز کو کونے میں ایک میز پر تنہا بیٹھے دیکھا۔

روڈریگز نے اوپر دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے ہچکچاتا ہوا محسوس ہوا...... اور پھر اس نے ایڈوارڈو کو اشارے سے بلایا۔ ایڈوارڈو نے بھی روڈریگز کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھائے اور اس کے سامنے والی نشست سنبھالنے سے پہلے توقف کیا لیکن پھر بیٹھ گیا۔

روڈریگز نے اس کے لیے گلاس میں وائن انڈیلی۔ ایڈوارڈو جو شاذونادر ہی پیتا تھا، چند گھونٹ میں ہی پی گیا۔ ان کی گفتگو شروع میں کچھ رکاوٹ کا شکار رہی لیکن جیسے جیسے دونوں نے مزید وائن پی، وہ ایک دوسرے کی صحبت میں بے تکلف ہونے لگے۔ کافی آنے تک میتوئل، ایڈوارڈو کو بتا رہا تھا کہ وہ اس خدا کے دھتکارے ہوئے ملک کے ساتھ کیا کچھ کرسکتا ہے۔

"اگر تمہیں بندرگاہ کا ٹھیکا مل گیا تو کیا یہاں نہیں رکو گے؟" ایڈوارڈو نے دریافت کیا۔

آسان طریقہ

ٹرین میں ایک صاحب اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھے ٹانگ پر ٹانگ رکھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اپنا بڑا سا بیگ انہوں نے بیچ راستے میں رکھا ہوا تھا۔ مسافر اس سے ٹکرا ٹکرا کر گزر رہے تھے۔

ایک مسافر اسے ایک طرف ہٹانے لگا تو وہ صاحب فوراً اخبار چھوڑ کر اسے روکتے ہوئے بولے۔ "اے میاں! یہ کیا کررہے ہو؟ بیگ کو یہیں رکھا رہنے دو۔"

"جناب! لوگ اس سے ٹکرا ٹکرا کر گزر رہے ہیں۔ آپ اسے کہیں ایک طرف رکھیں یا مجھے رکھنے دیں۔" مسافر نے شائستگی سے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ صاحب فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ "اسے یہیں رکھا رہنے دو۔ میں بھلکو آدمی ہوں۔ اگر لوگ اس بیگ سے ٹکرا ٹکرا کر نہیں گزریں گے تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں اسے ٹرین میں ہی بھول جاؤں گا۔"

تسلی

خاور صاحب ایک مہینے کے لیے لندن جارہے تھے۔ ائرپورٹ جانے کے لیے وہ گھر سے نکلے تو کچھ لیٹ ہوچکے تھے۔ راستے میں گھڑی دیکھتے ہوئے وہ اپنے ڈرائیور سے مخاطب ہوئے۔ "عزیز! گاڑی تیز چلاؤ، کہیں میری فلائٹ نہ نکل جائے۔"

ڈرائیور جو پہلے ہی گاڑی تیز چلا رہا تھا، فوراً بولا۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صاحب! آپ کی فلائٹ نکلنے نہیں دوں گا کیونکہ بیگم صاحب نے کہا تھا کہ اگر آپ کی فلائٹ نکل گئی تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیں گی۔"

(مرسلہ: عنبرین احمد، ساہیوال)

آرڈر

حمید نے ریستوران میں بیٹھ کر کیک کا آرڈر دیا۔ ویٹر نے ان کے سامنے جو ٹکڑا لا کر رکھا وہ بہت ہی چھوٹا تھا۔ حمید نے ایک لقمے میں اسے کھانے کے بعد اشارے سے ویٹر کو بلایا اور کہا۔ "تم نے کیک کا جو نمونہ لا کر مجھے چکھایا تھا، وہ مجھے پسند آیا۔ اب تم باقی کیک بھی لے آؤ۔"

(مرسلہ: عاصم خان، کراچی)

"کوئی امکان ہی نہیں۔" روڈریگز نے کہا۔ اسے اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ ڈی سلویرا کو بندرگاہ کے ٹھیکے میں اس کی دلچسپی کا علم تھا۔

"میں نے بغاوت سے ایک دن پہلے ہی شارٹ لسٹ سے اپنا نام واپس لے لیا تھا۔ میرا ارادہ اسی جمعرات کی صبح واپس برازیل جانے کا تھا۔" اس نے ڈی سلویرا کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

"کیا بتا سکتے ہو کہ تم نے نام واپس کیوں لیا؟"

"بنیادی طور پر لیبر کے مسائل...... اور پھر بندرگاہوں پر جہازوں کا ہجوم۔ یہاں کام کرنا دشوار ترین ہے۔"

"میں سمجھ نہیں پایا ہوں۔" ایڈوارڈو نے کہا۔ حالانکہ وہ ہر بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن یہ جاننے کے لیے متجسس تھا کہ آیا روڈریگز نے کوئی ایسی باریک تفصیل پکڑی ہے جو اس کے اپنے عملے سے چھوٹ گئی ہو۔

مینوئل روڈریگز نے اس حقیقت کو ہضم کرنے کے لیے توقف کیا کہ وہ شخص جسے وہ تیس سال سے اپنا سب سے خطرناک دشمن سمجھتا رہا تھا، اب اس کی اندرونی معلومات سن رہا تھا۔ اس نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے ایک لمحے کے لیے صورت حال پر غور کیا۔ ایڈوارڈو اس دوران کچھ نہیں بولا۔

"شروعات اس بات سے کرتے ہیں کہ یہاں ہنرمند مزدوروں کی شدید کمی ہے اور اس کے اوپر یہ پاگل پن پر مبنی کوٹہ سسٹم۔"

"کوٹا سسٹم؟" ایڈوارڈو نے معصومیت سے پوچھا۔

"کنٹریکٹر کے ملک سے لوگوں کا وہ حصہ جسے حکومت نائجیریا میں کام کرنے کی اجازت دیتی ہے۔"

"یہ مسئلہ تو نہیں ہونا چاہیے۔" ایڈوارڈو نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"قانون کے مطابق آپ کو پچاس مقامی شہریوں کے مقابلے میں ایک غیر ملکی کو ملازمت دینی پڑتی ہے، لہٰذا میں پچاس ملین ڈالرز کے ٹھیکے کو منظم کرنے کے لیے اپنے صرف پچیس اعلیٰ ترین آدمی لا سکتا تھا۔ مجھے باقی ہر سطح پر نائجیرین لوگوں سے گزارہ کرنا پڑتا۔ حکومت اس منحوس نظام کے ساتھ اپنا ہی گلا کاٹ رہی ہے۔ غیر ہنرمند مزدور چاہے وہ کالے ہوں یا گورے، راتوں رات تجربہ کار انجینئر نہیں بن سکتے۔ یہ سب ان کے قومی وقار کا معاملہ ہے۔ کسی کو انہیں بتانا چاہیے کہ اگر وہ مناسب قیمت پر کام مکمل کروانا چاہتے ہیں تو وہ اس قسم کے وقار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ راستہ دیوالیہ پن کا یقینی راستہ ہے۔ اس پر مستزاد جرمنوں نے اپنے روڈ پروجیکٹس کے لیے تمام بہترین ہنرمند مزدوروں کو پہلے ہی گھیر رکھا ہے۔"

"لیکن......" ایڈوارڈو نے کہا۔ "ہم تو قوانین کے مطابق چارج کرتے ہیں، چاہے وہ کتنے ہی احمقانہ کیوں نہ ہوں۔ اس طرح تمام ممکنہ صورت حال کا احاطہ ہو جاتا ہے، خاص طور پر جب تک ہمیں یہ یقین ہو کہ ادائیگی کی ضمانت ہے۔"

مینوئل نے ایڈوارڈو کی روانی کو روکنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"یہ ایک اور مسئلہ ہے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا، حکومت نے ابھی پچھلے مہینے ایک بڑے اسٹیل کے معاہدے سے انکار کر دیا...... ایسا کر کے۔" اس نے وضاحت کی۔

"انہوں نے ایک نامور بین الاقوامی کمپنی کو دیوالیہ کر دیا۔ تو وہ میرے ساتھ بھی وہی چال چلنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں...... اور اگر وہ ادائیگی نہیں کرتے تو آپ کس پر مقدمہ کریں گے؟ سپریم ملٹری کونسل پر؟"

"اور بندرگاہ کا مسئلہ؟"

"بندرگاہ مکمل طور پر بھری ہوئی ہے، 170 جہاز اپنا سامان اتارنے کے لیے بے تاب کھڑے ہیں اور انتظار کا وقت چھ ماہ تک ہے۔ اس کے اوپر پانچ ہزار ڈالرز یومیہ کا ہرجانہ ہے اور صرف جلد خراب ہونے والی اشیائے خورونوش کو کوئی ترجیح دی جاتی ہے۔"

"لیکن اس قسم کے مسئلے کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔" ایڈوارڈو نے کہا۔

"رشوت...... یہ کام نہیں کرتی ایڈوارڈو! ایک شخص قطار کیسے پھلانگ سکتا ہے جب تمام 170 جہاز پہلے ہی ہاربر ماسٹر کو رشوت دے چکے ہوں؟"

ایڈوارڈو نے فوراً ہی اپنی سانس روکی لیکن کچھ نہیں کہا۔

"سوچا جائے تو......" روڈریگز نے بات جاری رکھی۔ "اگر صورت حال مزید خراب ہوئی تو ہاربر ماسٹر اس ملک کا واحد آدمی ہوگا جو سب سے زیادہ امیر ہو جائے گا۔"

اس کی بات سن کر تین دن میں پہلی بار ایڈوارڈو ہنسا۔

"میں تمہیں بتا رہا ہوں ایڈوارڈو! ہم سائبیریا میں نمک کی کان بنا کر اس سے زیادہ منافع کما سکتے ہیں۔"

ایڈوارڈو دوبارہ ہنسا اور دوسری میزوں پر کھانا کھانے والے بیٹھے اور روڈریگز کے عملے کے کچھ لوگ اپنے مالکان کو بے یقینی سے گھورنے لگے۔

"تم بڑی مچھلی کے چکر میں تھے، ابوجا کا نیا شہر؟" مینوئل نے کہا۔

"یہ درست ہے۔" ایڈوارڈو نے اعتراف کیا۔

"میں نے اپنی پوری طاقت لگا دی تھی تاکہ یہ یقینی بنا سکوں کہ وہ ٹھیکا تم ہی کو ملے۔" مینوئل نے آہستگی سے کہا۔

"کیا؟" ایڈوارڈو نے بے یقینی سے کہا۔ "کیوں؟"

"میرا خیال تھا کہ ابوجا پر ہیجیو ایمپائر کو اتنے سر درد دے گا کہ تم بھی اسے سنبھال نہیں پاؤ گے ایڈوارڈو......! اور اس سے شاید میرے لیے برازیل میں میدان کھلا رہ جائے۔ ذرا سوچو، جب بھی نائجیریا میں بجٹ کی کٹوتی ہوگی، تو سب سے پہلے کون سا سر کاٹا جائے گا؟ غیر ضروری شہر، جیسا کہ تمام مقامی لوگ اسے کہتے ہیں۔"

"غیر ضروری شہر؟" ایڈوارڈو نے دہرایا۔

"ہاں......اور اس سے کوئی مدد نہیں ملتی، جب تم کہتے ہو کہ تم ایڈوانس ادائیگی کے بغیر کام نہیں کرو گے۔ تم بھی اتنی ہی اچھی طرح جانتے ہو جتنا میں...... کہ اتنے بڑے منصوبے کو منظم کرنے کے لیے تمہیں یہاں اپنے سو بہترین آدمیوں کی کل وقتی ضرورت ہوگی۔ انہیں کھانے، تنخواہوں، رہائش، شاید ایک اسکول اور اسپتال کی بھی ضرورت ہوگی۔ ایک بار جب وہ یہاں بس جائیں گے تو تم انہیں ہر دو ہفتے بعد کام سے نہیں ہٹا سکتے کیونکہ حکومت چیک کلیئر کرنے میں تاخیر کر رہی ہے۔ یہ عملی طور پر ممکن نہیں ہے، اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔" روڈریگز نے ایڈوارڈو کے لیے وائن کا ایک اور گلاس انڈیلتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس بات کو مدِنظر رکھا تھا۔" ایڈوارڈو نے وائن کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے سوچا کہ سربراہِ مملکت کی حمایت کے ساتھ......"

"مرحوم سربراہِ مملکت۔"

"میں تمہاری بات سمجھ گیا مینوئل!"

"شاید اگلا سربراہِ مملکت بھی تمہاری حمایت کرے لیکن اس کے بعد آنے والے کا کیا ہوگا؟ نائجیریا میں گزشتہ تین سالوں میں تین بغاوتیں ہو چکی ہیں۔"

ایڈوارڈو ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔

"کیا تم تاش کھیلتے ہو؟"

"ہاں......کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مجھے یہاں رہتے ہوئے کچھ پیسے کمانا ہیں۔" مینوئل ہنسا۔

"تم میرے کمرے میں کیوں نہیں آتے؟" ڈی سلویرا نے بات جاری رکھی۔ "اگرچہ مجھے تمہیں خبردار کرنا چاہیے کہ میں ہمیشہ اپنے مخالف کو ہرا دیتا ہوں۔"

"شاید وہ ہمیشہ خود ہی ہارنے کا انتظام کر لیتے ہیں۔" مینوئل نے کہا اور اٹھا اور آدھی خالی وائن کی بوتل گردن سے پکڑ لی۔

دونوں ہنستے ہوئے ڈائننگ روم سے نکل گئے۔

☆☆☆

اس ڈنر کے بعد دونوں چیئرمین ہر روز دوپہر اور رات کا کھانا ساتھ کھانے لگے۔

ایک ہفتے کے اندر ان کا عملہ بھی ایک ہی میزوں پر کھا رہا تھا۔ ایڈوارڈو کو ڈائننگ روم میں بغیر ٹائی کے دیکھا جا سکتا تھا جبکہ مینوئل نے برسوں میں پہلی بار مناسب شرٹ پہنی تھی۔ دو ہفتوں کے اختتام تک دونوں حریفوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مکمل ٹینس، ایک گیمن اور برج کھیلا جس میں شرط سو ڈالرز فی پوائنٹ مقرر تھی۔ ہر دن کے اختتام پر ایڈوارڈو ہمیشہ مینوئل کا تقریباً دس لاکھ ڈالرز کا مقروض ہوتا جسے مینوئل خوشی خوشی ہوٹل کے تہہ خانے میں بچی ہوئی بہترین وائن کی بوتل کے بدلے معاف کر دیتا۔

اگرچہ لیفٹیننٹ کرنل ڈمکا کو تقریباً چالیس ہزار نائجیرین لوگوں نے مختلف جگہوں پر دیکھا تھا لیکن وہ اب بھی گرفت میں نہیں آیا تھا۔

جیسا کہ نئے صدر نے اصرار کیا تھا، ہوائی اڈے بند رہیں گے لیکن مواصلات کھول دیے گئے جس نے کم از کم ایڈوارڈو کو برازیل ٹیلی فون اور ٹیلیکس کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بھائی اور بیوی ہر گھنٹے پیغام بھیج رہے تھے اور ایڈوارڈو سے کسی بھی قیمت پر گھر واپس آنے کی التجا کر رہے تھے۔ دنیا بھر میں بڑے ٹھیکوں پر فیصلے اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے رکے ہوئے تھے، لیکن برازیل کے لیے ایڈوارڈو کا پیغام ہمیشہ ایک ہی ہوتا تھا۔

"جب تک ڈمکا مفرور ہے، ہوائی اڈے بند رہیں گے۔"

منگل کی رات کھانے کے دوران ایڈوارڈو نے مینوئل کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ برازیل ورلڈ کپ کیوں ہارا۔ مینوئل نے ایڈوارڈو کے اشتعال انگیز دعووں کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ کم علمی اور تعصب پر مبنی ہیں۔ یہ وہ واحد موضوع تھا جس پر وہ گزشتہ تین ہفتوں میں ایک بار بھی متفق نہیں ہوئے تھے۔

"معاف کیجیے گا سر!" ایڈوارڈو نے اوپر دیکھا تو اس کا پرائیویٹ سیکریٹری اس کے پہلو میں کھڑا اسے پریشانی سے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں......کیا مسئلہ ہے؟"

"برازیل سے ایک ضروری ٹیلیکس......سر!"

ایڈوارڈو نے پہلا پیراگراف پڑھا اور پھر مینوئل

urdunovels.com

سے چد منٹ کے لیے معذرت کی۔ مینوئل نے شائستگی سے سر ہلایا۔

ایڈوارڈو میز سے اٹھا اور جیسے ہی وہ ڈائننگ روم سے گزرا، سترہ دیگر مہمانوں نے ادھورا کھانا چھوڑ دیا اور تیزی سے اس کے پیچھے اوپر والی منزل پر اس کے سویٹ میں گئے، جہاں اس کا باقی عملہ پہلے سے جمع تھا۔ وہ کمرے کے کونے میں اکیلا بیٹھ گیا۔ جب وہ ٹیلیکس کو غور سے پڑھ رہا تھا تو کوئی نہیں بولا۔

اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ وہ کتنے دنوں سے لاگوس میں قید ہے۔

ٹیلیکس اس کے بھائی کارلوس کی طرف سے تھا اور اس کا مضمون پین امریکن روڈ پروجیکٹ سے متعلق تھا۔ ایک آٹھ لین والی شاہراہ جو برازیل سے میکسیکو تک پھیلے گی۔ پرنیچو نے اس حصے کے لیے ٹینڈر دیا تھا جو ایمیزون کے جنگل کے بیچ میں سے گزرتا تھا اور اس کی بینک گارنٹیوں پر دستخط اور تصدیق کل منگل کی دوپہر تک ہونا ضروری تھی، لیکن ایڈوارڈو بالکل بھول چکا تھا کہ یہ کون سا منگل ہے اور یہ بھی کہ دستاویز جس پر وہ اگلے دن کی ڈیڈ لائن تک دستخط کرنے کا پابند تھا، وہ آخر کون سی تھیں۔

”مسئلہ کیا ہے؟“ ایڈوارڈو نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری سے پوچھا۔ ”بینک آف برازیل پہلے ہی الفریڈو کے ساتھ ضامن کے طور پر کام کرنے پر راضی ہو چکا ہے۔ کارلوس کو میری غیر موجودگی میں معاہدے پر دستخط کرنے سے کیا چیز روک رہی ہے؟“

”انشورنس کے مسائل کی وجہ سے میکسیکن اب مطالبہ کر رہے ہیں کہ ٹھیکے کی ذمے داری مشترک کی جائے۔ انشورنس کمپنی لائیڈز آف لندن اب پورے خطرے کا احاطہ نہیں کرے گی، اگر صرف ایک کمپنی ملوث ہو۔ تفصیلات ٹیلیکس کے صفحہ نمبر سات پر درج ہیں۔“

ایڈوارڈو نے تیزی سے صفحات پلٹے۔ اس نے پڑھا کہ اس کے بھائیوں نے پہلے ہی لائیڈز پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن نتیجہ بے سود رہا تھا۔

اب میکسیکن حکومت اصرار کر رہی تھی کہ ٹھیکے میں کسی اگلی بین الاقوامی تعمیراتی کمپنی کو شریک کیا جائے جو لائیڈز کے لیے قابل قبول ہو۔ یہ سب بھی تبھی ممکن ہے اگر اگلے دن دوپہر کی ڈیڈ لائن تک قانونی دستاویزات پر دستخط ہو جائیں۔

”یہیں رکو۔“ ایڈوارڈو نے اپنے عملے سے کہا اور وہ اکیلا ڈائننگ روم میں واپس آیا۔ لمبا ٹیلیکس اس کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔

روڈریگز اسے اپنی میز کی طرف واپس بھاگ کر آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”تم اس وقت کسی مسئلے میں پھنسے ہوئے آدمی لگ رہے ہو۔“

”میں واقعی پھنسا ہوا ہوں۔“ ایڈوارڈو نے کہا۔ ”یہ پڑھو۔“ مینوئل کی تجربہ کار نظر ٹیلیکس پر دوڑ گئی۔ اہم نکات کو پڑھتے ہوئے اس نے جائزہ لیا۔

اس نے خود ایمیزون روڈ پروجیکٹ کے لیے ٹینڈر دیا تھا اور اب بھی اسے تفصیلات یاد تھیں۔ ایڈوارڈو کے اصرار پر اس نے صفحہ نمبر سات دوبارہ پڑھا۔

”میکسیکن ڈاکو......!“ اس نے ٹیلیکس ایڈوارڈو کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ خود کو سمجھتے کیا ہیں، ایڈوارڈو کو بتا رہے ہیں کہ اسے اپنا کاروبار کیسے چلانا چاہیے؟ انہیں فوراً جوابی ٹیلیکس کرو اور بتاؤ کہ تم دنیا کی سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کے چیئرمین ہو اور وہ جہنم میں جا سکتے ہیں، اس سے پہلے کہ تم ان کی احمقانہ شرائط سے اتفاق کرو۔ تم جانتے ہو کہ شاہراہ کے دوسرے حصے پر کام شروع ہونے کے لیے تیار ہونے کے ساتھ ساتھ اب ان کے لیے دوبارہ ٹینڈر جاری کرنے میں بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ لاکھوں کا نقصان اٹھائیں گے۔ ان کے جھوٹ کو بے نقاب کرو ایڈوارڈو!“

”میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو گے مینوئل......! لیکن اب کوئی بھی رکاوٹ صرف میرا وقت اور پیسا ضائع کر سکتی ہے، اس لیے میں ان کے مطالبے سے اتفاق کرنے اور ایک پارٹنر تلاش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”اتنے مختصر نوٹس پر کبھی کوئی نہیں ملے گا۔“

”مجھے مل جائے گا۔“

”کون؟“

ایڈوارڈو ڈی سلویرا صرف ایک سیکنڈ کے لیے ہچکچایا۔ ”تم...... مینوئل......! میں روڈریگز انٹرنیشنل کو ایمیزون روڈ کنٹریکٹ کا پچاس فیصد پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

مینوئل روڈریگز نے حیرت سے ایڈوارڈو کی طرف دیکھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے اپنے پرانے حریف کی اگلی چال کا غلط اندازہ لگایا تھا۔

”میرا خیال ہے اس سے وہ لاکھوں ریکور کرنے میں مدد مل سکتی ہے جو تم نے مجھ سے پچھلی ٹینس میں ہارے ہیں۔“

دونوں ہنسے، پھر روڈریگز کھڑا ہوا اور ان دونوں نے

urdunovels.com

سنجیدگی سے مصافحہ کیا۔

ڈی سلویرا بھاگتا ہوا ڈائننگ روم سے نکلا اور اپنے بینجر کے لیے ٹرانسفر کرنے کے لیے ایک ٹیلیکس لکھا۔

"دستخط کرو، شرائط قبول ہیں، پچاس فیصد پارٹنر روڈریگز انٹرنیشنل کنسٹرکشن، برازیل ہوگا۔"

"اگر میں یہ پیغام ٹیلیکس کرتا ہوں سر تو کیا آپ کو احساس ہے کہ یہ قانونی طور پر ہمیں پابند کردے گا؟"

"بھیج دو۔" ایڈورڈو نے کہا۔

ایڈورڈو ایک بار پھر ڈائننگ روم میں واپس آیا جہاں مینوئل نے ہوٹل کی بہترین شیمپین کی بوتل منگوائی تھی۔ ابھی وہ دوسری بوتل سنگوا رہے تھے اور مل کر ایک گانا گا رہے تھے کہ ایڈورڈو کا پرائیویٹ سیکریٹری دوبارہ اس کے پہلو میں نمودار ہوا۔ اس بار دو ٹیلیکس اس کے ساتھ تھے۔

ایک بینک آف برازیل کے صدر کی طرف سے اور دوسرا اس کے بھائی کارلوس کی طرف سے۔ دونوں ایمزون روڈ پروجیکٹ کے لیے حتمی پارٹنر کی تصدیق چاہتے تھے۔

ایڈورڈو نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کی طرف دیکھے بغیر شیمپین کی دوسری بوتل کھولی۔

"بینک کے صدر اور میرے بھائی کو روڈریگز انٹرنیشنل کنسٹرکشن کی تصدیق کردو۔" اس نے مینوئل کا خالی گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ "اور آج رات مجھے دوبارہ بالکل بھی تنگ مت کرنا۔"

"جی سر!" پرائیویٹ سیکریٹری نے کہا اور ایک اور لفظ کہے بغیر چلا گیا۔

کسی بھی آدمی کو یاد نہیں تھا کہ وہ اس رات کس وقت بستر پر گیا، لیکن ڈی سلویرا کو اگلی صبح سویرے اس کے سیکریٹری نے گہری نیند سے اچانک بیدار کیا۔

ایڈورڈو کو سیکریٹری کی دی گئی خبر ہضم کرنے میں چند منٹ لگے۔ لیفٹیننٹ کرنل ڈیما کو اس صبح تین بجے "کانو" میں پکڑ لیا گیا تھا اور اب تمام ہوائی اڈے دوبارہ کھل چکے تھے۔ ایڈورڈو نے فون اٹھایا اور تین ہندسے ملائے۔

"مینوئل اٹھ، تم نے خبر سنی؟ اچھا...... تو پھر تمہیں میرے ساتھ میرے 707 میں واپس اڑنا ہوگا ورنہ تمہیں یہاں سے نکلنے میں کئی دن لگ سکتے ہیں۔ ایک گھنٹے میں لابی میں پہنچو۔"

8:45 پر دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ایڈورڈو کے سیکریٹری نے دروازہ کھولا تو کرنل عثمان کو مستعد کھڑے پایا، بالکل ویسے ہی جیسے وہ بغاوت سے پہلے کے دنوں میں کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ تھا۔

ایڈورڈو نے لفافہ پھاڑا تو اس میں اس دن نئے سربراہِ مملکت جنرل اوباسانجو کے ساتھ دوپہر کے کھانے کی دعوت ملی تھی۔

"براہ کرم اپنے صدر کو میری معذرت پہنچا دیں۔" ایڈورڈو نے کہا۔ "اور یہ وضاحت کرنے کی مہربانی کریں کہ مجھے اپنے ملک میں اہم مصروفیات نمٹانا ہیں۔"

کرنل ہچکچاتے ہوئے واپس چلا گیا۔

ایڈورڈو نے وہی سوٹ، قمیص اور ٹائی پہنی جو اس نے نائیجیریا میں اپنے پہلے دن پہنی تھی اور لفٹ سے نیچے لابی میں گیا جہاں مینوئل اس کے ساتھ شامل ہوگیا۔ وہ ایک بار پھر جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔

دونوں چیئرمین ہوٹل سے نکلے اور سب سے آگے والی مرسیڈیز کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے اور چھ گاڑیوں کے قافلے نے ہوائی اڈے کا سفر شروع کیا۔ کرنل، جو اب ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا، اس نے پورے سفر کے دوران کسی بھی معزز برازیلی سے بات کرنے کی جرأت نہیں کی۔ بعد میں نئے صدر کو بتا سکتا تھا کہ دونوں آدمی ایمزون روڈ پروجیکٹ اور اس بات پر بحث میں مصروف دکھائی دے رہے تھے کہ ان کی دونوں کمپنیوں کے درمیان ذمہ داری کیسے تقسیم کی جائے گی۔

کسٹم کو بائی پاس کردیا گیا کیونکہ دونوں آدمیوں کے پاس اپنے علاوہ ملک سے باہر لے جانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

گاڑیوں کا بیڑا ایڈورڈو کے نیلے اور سلور 707 کے پہلو میں آکر رک گیا۔ دونوں کمپنیوں کا عملہ طیارے کے پچھلے حصے میں سوار ہوا، وہ بھی ایمزون روڈ پروجیکٹ پر بحث میں مگن تھا۔

کارپورل ڈرائیور گاڑی سے باہر کودا اور پچھلا دروازہ کھولا تاکہ دونوں چیئرمین سیدھے سیڑھیوں پر چڑھ کر طیارے کے اگلے حصے میں سوار ہو سکیں۔

جیسے ہی ایڈورڈو مرسیڈیز سے باہر نکلا، نائیجیرین ڈرائیور نے چستی سے سیلوٹ کیا۔

"خدا حافظ سر!" اس نے ایک بار پھر اپنے بڑے بڑے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

ایڈورڈو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"مجھے امید ہے......" کارپورل نے شائستگی سے کہا۔ "کہ نائیجیریا میں قیام کے دوران آپ نے بہت بڑی ڈیل کی ہوگی۔"

×××

urdunovels.com

وہ دسمبر کا ایک سرد دن تھا جب یہ کہانی شروع ہوئی۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ میری نظر اپنے پرانے آئینے پر پڑی۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے اس میں موجود عکس میں جنبش ہوئی ہے، حالانکہ میں کمرے میں اکیلا تھا اور ساکت بیٹھا تھا۔ میں ٹھٹک گیا اور غور سے دیکھا، پھر یہ سوچ کر کہ یہ محض وہم ہے، میں اٹھا اور بالوں میں کنگھا کرنے لگا۔

یہ پرانا آئینہ مجھے کوپن ہیگن کے شمالی حصے کی ایک ویران جاگیر کی غیر آباد عمارت میں ملا تھا، اس وقت وہ گرد وغبار اور جالوں سے اٹا ہوا تھا، میں اسے یہاں لے آیا۔ دو صدیوں کی حبس زدہ گرمیوں اور نمکین ہوا نے شیشے کی چمک دھندلا دی تھی اور اس کے سنہری فریم کے باریک نقش و نگار میں گرد جم چکی تھی مگر میں نے بڑی محنت سے اسے صاف کیا، فریم کو از سرِ نو جوڑا اور یوں وہ قدیم آئینہ اپنی کھوئی ہوئی شان دوبارہ حاصل کر کے میرے گھر کی زینت بن گیا۔

اب کئی برس گزرنے کے بعد میں ایک پر فضا پہاڑی مقام پر اپنے پرانے دوست براؤن کے نجی اسکول میں بحیثیت استاد کام کر رہا تھا اور اسکول کے رہائشی حصے میں مقیم تھا۔ میرے استعمال میں دو کمرے تھے جن کے درمیان

پھندا

جاوید بسام

کالے جادو کے بارے میں سبھی جانتے ہیں۔۔۔ اور اس کی تباہ کاریوں سے بھی واقف ہوں گے۔ اس کا استعمال ہمیشہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لیے ہی کیا گیا۔ وہ بھی ایسے ہی جادو کے زیرِ اثر اپنی دنیا سے کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔۔۔ جو ایک آئینے میں آباد تھی۔۔۔ وہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔۔۔ کیا اس کا استاد اسے حقیقی دنیا میں لا پاتا؟

جادوئی پھندے میں پھنسے ایک طالبِ علم کی کہانی

ایک راہداری تھی۔ میرا وہ آئینہ جسے میں ہمیشہ اپنے سامان میں سب سے پہلے رکھتا تھا، یہاں بھی میری پرداوی کی قدیم گلابی لکڑی کی میز پر جا سجا تھا۔

میری خواب گاہ کا دروازہ براہ راست دوسرے کمرے کے سامنے تھا، جہاں آئینہ رکھا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ جب میں اپنی الماری کے آئینے میں دیکھتا ہوں تو راہداری کے پار دوسرے آئینے کا عکس نظر آتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے آئینوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہو، ایک کھلتی ہوئی راہداری جو لامحدود لمبائی رکھتی ہو اور آج صبح مجھے لگا جیسے اس سنسان راہداری میں کوئی حرکت ہوئی ہے، مگر جیسا کہ میں نے کہا، میں نے اسے محض وہم سمجھ کر جھٹک دیا۔

جب میں تیار ہو کر ناشتا گاہ میں پہنچا تو طلبہ و طالبات نے سردی کی شکایت کی، معلوم ہوا کہ اسکول کا ہیٹر خراب ہو گیا ہے۔ میں خود سردی کے معاملے میں بہت حساس ہوں اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اس دن سبق ٹھنڈے کمرائے جماعت میں نہیں بلکہ اپنے کمرے کے آتش دان کے سامنے دیا جائے۔ یہ سنتے ہی طلبہ خوشی خوشی میرے کمرے کی طرف لپک آئے۔

دو گھنٹے بعد جب سبق ختم ہوا تو سب لڑکے لڑکیاں شور کرتے ہوئے باہر نکل گئے، سوائے رابرٹ گرینڈسن کے، جس نے کچھ دیر ٹھہرنے کی اجازت چاہی۔ میں نے اجازت دی تو وہ آگ کے سامنے آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

میں کوئی خط پڑھنے میں محو تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ذرا فاصلے پر دوسری کرسی پر جا بیٹھا، ٹھیک اس جگہ جہاں سے آئینہ بالکل سامنے نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ عجب انہماک سے دھندلے شیشے کو دیکھ رہا ہے۔ مجھے اپنا صبح والا واقعہ یاد آ گیا۔ وقت گزرتا گیا اور وہ اسی طرح بھویں چڑھائے متوجہ رہا۔ آخر میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے رابرٹ، تم اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟"

وہ ذرا چونک کر بولا۔ "سر! یہ آئینے کی لکیریں ہیں نا، لگتا ہے جیسے یہ سب لکیریں مل رہی ہیں اور سب ایک نقطے پہ جا کر ملتی ہیں۔ میں آپ کو دکھاتا ہوں۔" وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور آئینے کے قریب گیا، پھر اپنی انگلی نیچے بائیں کونے کے ایک نقطے پر رکھ دی۔

"یہاں، سر!" اس نے پلٹ کر کہا۔ انگلی وہیں رکھی ہوئی تھی۔

شاید اس نے ذرا زور سے دبا دیا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے اس نے انگلی جھٹکے سے کھینچ لی، جیسے بڑی مشقت سے چھڑائی ہو اور حیران نظروں سے شیشے کو گھورنے لگا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ الجھ کر بولا۔ "سر! میں...... میں نہیں جانتا مگر ایسا لگا جیسے...... جیسے کوئی اندر سے میری انگلی پکڑ کر کھینچ رہا ہو۔ یقین مانیں، بالکل ایسا ہی محسوس ہوا ہے۔"

پندرہ برس کے لڑکے سے ایسے جملے سننا غیر متوقع نہ تھے مگر اس کی سنجیدگی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ جگہ دوبارہ دکھائے۔

وہ جھک کر بولا۔ "سر! آپ شاید ہنسیں گے، مگر...... اب یہاں سے ویسا نہیں لگ رہا۔ وہ اثر صرف اس جگہ سے نظر آ رہا تھا، جہاں میں بیٹھا تھا۔"

میں دلچسپی سے اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ واقعی وہاں سے دیکھنے پر شیشے کی اندرونی لہریں یوں لگتی تھیں جیسے ایک مرکز پر مرتکز ہوں، جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے تاروں کو کھینچ کر باندھ رکھا ہو۔ جب میں اٹھ کر قریب گیا تو وہ منظر غائب ہو گیا۔ یہ اثر صرف ایک خاص زاویے سے دکھائی دیتا تھا۔ اس حصے میں میرا عکس دھندلا تھا، چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے پہلے کبھی یہ بات نوٹ کیوں نہیں کی۔

تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجی اور رابرٹ چلا گیا۔ میں آئینے اور اس عجیب نقطے کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ میں نے کھڑکی کے پردے ہٹائے اور راہداری کے پار جا کر الماری کے آئینے میں وہی نقطہ تلاش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے وہ نظر آ گیا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو لگا جیسے شیشے کے اندر ہلکی سی جنبش ہوئی ہو۔ میں نے گردن موڑ کر صحیح زاویہ بنایا تو [illegible] جیسے اندر سے کچھ لپک کر آیا۔ اب وہ حرکت واضح تھی، ایک گھومتی، بھنور سی لہر، جیسے خزاں کے پتے زینے پر چکر کھاتے گرتے ہیں، ایک دائرے میں مگر ساتھ ہی اندر گہرائی میں ایک ان[illegible] نقطے کی طرف۔

میں اس منظر سے سحر زدہ رہ گیا، پھر مجھے خیال آیا کہ شاید یہ محض نظر کا فریب ہو مگر رابرٹ کے الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگے...... "جیسے کوئی مجھے اندر کھینچ رہا ہو۔"

اور واقعی مجھے بھی لگا جیسے میں خود اس آئینے کے بھنور میں کھنچا جا رہا ہوں۔ اچانک ایک ہلکی سی سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ یہ بات واضح [illegible] یہاں کوئی ایسی چیز ہے جو توجہ چاہتی ہے۔ اس خیال نے جنم لیا کہ معاملے کی تہ تک پہنچا جائے تو مجھے رابرٹ گرینڈسن کا گھنٹی بجنے سے ذرا پہلے کا سوچ میں ڈوبا چہرہ یاد آ گیا۔ جب وہ

urdunovelsclub

راہداری میں جاتے اور جھجکتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں طے کیا کہ یہ لڑکا اس ''آئینے کے معمے'' کو سمجھنے میں میری مدد کرسکتا ہے۔ وہ ذہین، مشاہدہ کرنے والا اور تجسس پسند تھا۔ ان تینوں خوبیوں کے بغیر کوئی معما نہیں سلجھتا۔

مگر رابرٹ سے متعلق جو کچھ اگلے دن ہوا، اس نے عارضی طور پر میرے ذہن سے آئینے کا خیال ہی مٹا دیا۔ میں سارا دن کسی ذاتی کام کے سلسلے میں اسکول سے باہر رہا، جب شام ٹھیک پانچ بجے واپس آیا تو الوداعی تقریب شروع ہونے والی تھی۔ ایک ایسی تقریب جس میں شرکت ہر طالب علم کے لیے لازمی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ موقع ملتے ہی رابرٹ سے آئینے پر بات کروں گا، لیکن معلوم ہوا کہ اسکول کا سب سے وقت کا پابند لڑکا بلاوجہ غیر حاضر ہے تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔ اسی شام میرے دوست براؤن نے خبر دی کہ رابرٹ غائب ہوگیا ہے۔

اسے کمرے، لائبریری اور تمام معمول کی جگہوں پر تلاش کیا گیا مگر کچھ پتا نہ چلا۔ حتیٰ کہ اس کی تمام چیزیں، اس کا کوٹ تک وہیں موجود تھے۔ پھر باہر احاطے، پریڈ گراؤنڈ اور راستوں پر دیکھا گیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ قریب کے کیفے تک فون کیے گئے مگر وہاں بھی کوئی نشان نہ ملا۔ دوپہر سوا دو بجے کلاس ختم ہونے کے بعد کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ تیسری منزل کے زینے چڑھ کر اپنے کمرے تک گیا اور جیسے ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

یہ خبر پھیلتے ہی پورا اسکول اضطراب میں ڈوب گیا۔ بطور پرنسپل، براؤن پر سب سے زیادہ بوجھ تھا۔ ایک ایسی مثال جس نے اس کے منظم اور شاندار ادارے کی تاریخ میں کبھی جنم نہیں لیا تھا، اب اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ پریشان تھا۔ جلد ہی معلوم ہوا کہ رابرٹ اپنے گھر، مغربی پنسلوانیا بھی نہیں گیا۔ اردگرد کی برفیلی وادیوں میں تلاش کے لیے پارٹیاں روانہ کی گئیں مگر انہیں بھی کوئی سراغ نہ ملا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں گیا، اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟

اس کے والدین دوسرے دن اسکول پہنچے، انہوں نے بے مثال صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ ان کے چہروں پر صدمے کے آثار سب سے زیادہ گہرے تھے۔ براؤن ان سے مل کر جیسے دس برس بوڑھا ہوگیا تھا۔

چوتھے دن تک اسکول کے لیے یہ معاملہ ایک ناقابلِ فہم معما بن چکا تھا۔ آخرکار مسٹر اور مسز گرینڈسن بھاری دل سے واپس چلے گئے اور اگلی صبح کرسمس کی دس روزہ تعطیلات شروع ہوگئیں۔ طلبہ اور اساتذہ اس سال خوشی کے بجائے خوف اور اداسی کے سائے میں گھروں کو لوٹے۔

اب اس وسیع و عریض عمارت میں صرف براؤن، اس کی بیوی، چند ملازمین اور میں باقی رہ گئے تھے۔ ایک ویران سکوت میں لپٹی ہوئی عمارت، جس پر کسی ان دیکھی نحوست کا سایہ محسوس ہوتا تھا۔

☆☆☆

اس شام میں آتش دان کے سامنے بیٹھا رابرٹ کے غائب ہونے کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے قیاس آتے اور چلے جاتے۔ رات تک میرے سر میں شدید درد شروع ہوگیا، تھوڑا سا کھانا کھا کر میں دوسرے بلاکوں سے گزرتا ہوا اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔ میں سوچ میں گم تھا، گویا خیالات کی دبیز دیوار نے مجھے باقی دنیا سے کاٹ دیا تھا۔ میری آنکھ لگ گئی۔

جب گھڑی نے دس بجائے تو میں چونک کر جاگا۔ میں ٹھٹھرتے کمرے کے وسط میں کرسی پر بیٹھا تھا، آتش دان میں آگ کب کی بجھ چکی تھی۔ جسمانی تھکن کے باوجود میرے اندر اچانک ایک انوکھی توانائی جاگ اٹھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ رابرٹ کی گمشدگی کا بھید کھولنے کی امید اتنی کمزور نہیں جتنی دکھائی دیتی تھی، کیونکہ نیند سے بیدار ہوتے ہی میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال چمکا۔ رابرٹ جہاں کہیں بھی ہے، وہ مجھے پکارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہاں، مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہے...... اور اسے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ یہ یقین بظاہر عجیب لگتا تھا مگر میں نے مغربی جزائر میں کئی برس گزارے تھے، جہاں طرح طرح کے ناقابلِ فہم واقعات دیکھے تھے۔

اس رات دوبارہ نیند آنے سے پہلے میں نے پورے شعور سے کوشش کی کہ اپنے ذہن کو رابرٹ کی سمت کسی ''ذہنی رابطے'' کے لیے کھول دوں۔ ہم جانتے ہیں کہ لاشعور نیند کے عالم میں بیرونی نفسیاتی اثرات کے لیے سب سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اگر ہم ٹیلی پیتھی ''دماغی ترسیل'' کو ممکن مان لیں تو یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسی قوت نیند میں سب سے مؤثر طور پر کام کرتی ہے۔ لہٰذا اگر مجھے رابرٹ سے کوئی خاص پیغام موصول ہوتا تو وہ یقیناً گہری نیند کے عالم میں ہوتا۔ ممکن تھا کہ جاگنے پر میں وہ بھول جاتا مگر میں نے خوابوں کو یاد رکھنے کی مشق دنیا کے کئی تاریک کونوں میں کی تھی، لہٰذا مجھے امید تھی کہ کچھ نہ کچھ یاد رہ جائے گا۔

میں فوراً سو گیا۔ مجھے نیند میں مسلسل کئی خواب نظر آئے۔ جب میری آنکھ کھلی تو کھڑکی پر سے سامنے ابھار رہی تھی۔ خواب کی چند جھلکیاں اب بھی یادداشت میں تیر رہی تھیں۔ میرے ذہن میں رابرٹ گریڈسن کا عکس تازہ تھا۔ وہی چہرہ مگر اب اس پر ایک ہولناک رنگت چھائی ہوئی تھی۔ سیاہ، نیلے اور دلدلی سبز رنگ کا ایک پراسرار امتزاج۔ رابرٹ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر جیسے کوئی دیوار تھی جو ہم دونوں کے بیچ حائل تھی۔ ایک غیر مرئی فاصلہ، ایک ایسی رکاوٹ جو فہم سے بالا تھی۔

میں اسے جیسے دور سے دیکھ رہا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ میرے بہت قریب محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو سمجھ آیا کہ اس کے جسم کی پیمائش اپنے تناسب میں بدل گئی ہے جو حقیقی قوانین کے برعکس تھے۔ جتنا وہ مجھ سے "دور" ہوتا، اتنا ہی بڑا دکھائی دیتا۔ یوں گویا حقیقی فضا کے اصول الٹ گئے تھے، لیکن مجھے اس کے جسمانی حجم پر حیرت نہیں ہوئی بلکہ اس کی رنگت پر ہوئی۔ وہ رنگ جو خواب میں مانوس انسانی رنگوں کے برعکس غیر ارضی رنگوں میں بدل گئے تھے۔

کچھ دیر میں اس کی کوششیں آخرکار الفاظ میں ڈھل گئیں۔ آواز دھیمی تھی، بھاری اور جیسے کسی دور کے غار سے آرہی تھی۔ پہلے تو میں کچھ نہ سمجھ سکا، پھر آہستہ آہستہ چند جملے واضح ہونے لگے۔ یہی وہ موڑ تھا جہاں میرے خواب کے شعور نے "رابطہ" قائم کرلیا۔ وہ ذہنی رابطہ جو ناممکن لگ رہا تھا، اب حقیقت بن گیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم یہ مکالمہ کتنی دیر چلتا رہا، شاید گھنٹوں، کیونکہ وہ دور سے آتی آواز مسلسل مجھ سے کچھ بیان کر رہی تھی۔ اس نے جو باتیں کہیں، میں نے خواب میں اور جاگتے ہوئے فوراً اس پر یقین کرلیا کیونکہ ماضی میں میرا اکثر ماورائی قوتوں سے سامنا ہو چکا تھا۔

یہ بات البتہ باعث اطمینان تھی کہ جب رابرٹ کو یقین ہو گیا کہ میں اسے سمجھنے لگا ہوں تو اس کا چہرہ امید اور شکرگزاری سے روشن ہو گیا۔ اب جب میں اس کے پیغام کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو مجھے لفظوں کا بہت احتیاط سے انتخاب کرنا ہوگا کیونکہ یہ سب بیان سے زیادہ احساس سے تعلق رکھتا ہے۔

میرے خواب کے انکشاف نے میرے شعور میں ایک نیا ربط واضح کر دیا، ایک ایسا ربط جو پہلے دھندلا تھا۔ پرانے گرینائٹ کے شیشے کی وہ گھومتی لکیریں اور وہی گولائی میں بہتا ہوا دھواں سا منظر جس نے اس دسمبر کی صبح مجھے اور رابرٹ دونوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔

آخرکار میں نے طے کیا کہ جہان سے زیادہ عقل پر بھروسا کیا جائے۔ میں نے نتیجہ نکالا کہ وہ تصورات جنہیں گیروٹ نے اپنی ان دو لفظوں میں محض سوال کیا تھا ابہام کے لیے ایک واضح شکل اختیار کر گئے تھے۔ میرا وہ قدیم آئینہ دراصل ایک ایسی شے تھی جو جسمانی وجود کو اپنے اندر کھینچ سکتی تھی۔ جہاں مکان کے وہی اصول جن پر ہماری تین جہتی دنیا قائم ہے، سرے سے بدل جاتے تھے۔ سادہ لفظوں میں یہ آئینہ ایک پھندا تھا۔ ایک ایسا دروازہ جو ہمارے جیسوں جہان کے راستے کے لیے کھل جاتا تھا، گویا کسی غیر اقلیدی اندرونی خلا کی طرف کھلتا تھا۔ رابرٹ گریڈسن کسی نامعلوم طریقے سے اس خلا میں داخل ہوا اور شاید ہمیشہ کے لیے اس آئینے کی دنیا میں قید ہو گیا۔

عجیب بات یہ تھی کہ بیدار ہونے پر میرے ذہن میں لمحہ بھر کو بھی شک پیدا نہیں ہوا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جو انکشاف مجھ پر ہوا ہے، وہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ میں واقعی دوسری دنیا میں رابرٹ سے بات کر چکا ہوں اور یہ محض میرے تخیل کی پیداوار نہیں جو اس کی کشمکش یا آئینے کے اسرار سے متاثر ہو کر بنی ہے۔ یوں میرے سامنے ایک ایسی کہانی کھلنے لگی جو اپنی نوعیت میں حد درجہ غیر معمولی تھی۔

یہ واضح ہو گیا کہ جس صبح وہ غائب ہوا، رابرٹ اس قدیم آئینے کے سحر میں پوری طرح گرفتار تھا۔ اسکول میں سارا وقت وہ بس ایک ہی بات سوچتا رہا کہ جلدی سے میرے کمرے میں واپس جا کر آئینے کو دوبارہ دیکھے۔ دوپہر کے قریب دو بج کر بیس منٹ پہ اس کی چھٹی ہوئی۔ میں اس وقت اسکول میں نہیں تھا، شہر گیا ہوا تھا۔ رابرٹ یہ بات جانتا تھا کہ میں اس کے کمرے میں جانے پر اعتراض نہیں کروں گا۔ چنانچہ وہ سیدھا میرے کمرے میں آیا اور اس جگہ جا کھڑا ہوا جہاں ہم نے دیکھا تھا کہ شیشے کی لکیریں ایک نقطے پر مرتکز ہوتی ہیں۔ اچانک اسے ایک ناقابل مزاحمت جذبہ محسوس ہوا کہ ہاتھ بڑھا کر اس گھومتے ہوئے مرمری شیشے کو چھوئے۔ وہ جیسے اپنی مرضی کے خلاف ایسا کر بیٹھا اور جوں ہی اس نے انگلی لگائی، اسے وہی عجیب، کھینچنے والے کھنچاؤ کی کیفیت محسوس ہوئی جو اسے اس صبح بھی حیران کر گئی تھی۔ اس لمحے بغیر کسی انتباہ کے وہ آئینے کے اس پار کھینچ لیا گیا۔ یہ منتقلی ایک ہولناک جھٹکے کے ساتھ ہوئی۔ ایسا لگا جیسے اس کے جسم کی ہر ہڈی، ہر پٹھا، ہر رگ و ریشہ کھنچ گیا ہو، ٹوٹ گیا ہو اور اس کا جسم توڑ مروڑ کر کسی نادیدہ خلا میں جا گرا

ہو لیکن یہ کرب زیادہ دیر نہ رہا۔

رابرٹ نے بتایا کہ آئینے کی دوسری سمت اسے یوں لگا جیسے وہ ابھی ابھی پیدا ہوا ہو اور یہ احساس ہر حرکت میں تازہ ہوتا گیا۔ چلنے میں، جھکنے میں، سر موڑنے یا بولنے میں۔ اسے اپنا جسم نامانوس محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد یہ اجنبیت مٹنے لگی۔ اس کا وجود پھر سے ایک مربوط اکائی بن گیا، نہ کہ اجزا کی ایک بھری ہوئی بوری۔ تاہم اظہارِ ذات کے تمام طریقوں میں بولنا اس کے لیے سب سے مشکل رہا۔ شاید اس لیے کہ "کلام" ایک ایسا عمل ہے جس میں درجنوں عضلات، رگیں اور اوزار شامل ہوتے ہیں۔ اس کی ٹانگیں البتہ سب سے پہلے نئے ماحول سے ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

اس صبح جب میں جاگا تو میں نے اس ناقابلِ فہم تجربے پر غور کرنا شروع کیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا تھا، اسے اپنے عقلی ترازو میں تولنے لگا اور ساتھ ہی رابرٹ کو اس انوکھی قید سے نجات دلانے کے امکانات پر غور کرنے لگا۔

جوں جوں میں سوچتا گیا، کئی الجھی ہوئی باتیں رفتہ رفتہ کھلنے لگیں۔ سب سے پہلے مجھے "آئینے کی دنیا" کے غیر مانوس رنگوں کا بھید سمجھ میں آیا۔ رابرٹ کا چہرہ اور ہاتھ جن کی رنگت میں "دلدلی سبز" اور "سیاہ نیلاہٹ" کا عجیب امتزاج تھا، درحقیقت اس جہان کے الٹے رنگوں کا نتیجہ تھے۔ اس کی نیلی جیکٹ پہلے لیموں کی طرح زرد ہو چکی تھی۔ جبکہ پتلون ہمیشہ کی طرح سرمئی تھی۔ میں نے غور کرنے پر دریافت کیا کہ یہ سب اس الٹی بھری نسبت سے جڑا ہوا ہے جس کے باعث رابرٹ جتنا دور جاتا، اتنا ہی بڑا دکھائی دیتا تھا۔ وہی اصول یہاں بھی کارفرما تھے۔

آئینے میں قید تمام رنگ الٹ گئے تھے۔ طبیعیات میں نیلا اور پیلا، سرخ اور سبز...... یہ دونوں رنگوں کی مخالف جوڑیاں ہیں۔ جب یہ مل جائیں تو نتیجہ سرمئی نکلتا ہے۔ اسی لیے اس کی پتلون بدستور سرمئی رہی مگر نیلی جیکٹ زرد بن گئی اور جلد کی رنگت ایک عجیب مرکب رنگ میں ڈھل گئی۔

ایک اور راز اس کی گھٹی ہوئی آواز کا کھلا اور اس جسمانی بے ہنگمی کا بھی، جس کی وہ شکایت کر رہا تھا۔ ابتدائی طور پر میں حیران تھا مگر بہت سوچنے کے بعد سمجھ آیا کہ یہاں بھی وہی الٹ پھیر کام کر رہا ہے، جس نے رنگوں اور فاصلوں کو بدل دیا تھا۔ اگر مان لیا جائے کہ آئینے کی دنیا انعکاس کے قوانین کے مطابق چلتی ہے تو جو بھی اس میں داخل ہو، الٹ صورت میں ظاہر ہوگا۔ بازو، ٹانگیں حتیٰ کہ حواس کے جوڑے، ناک، کان، آنکھیں، سب کی جگہ بدل جائے گی۔ چنانچہ رابرٹ کے صوتی تار بھی الٹ گئے تھے اور یہی اس کے کلام کی الجھن کا سبب تھا۔

جوں جوں دن گزرتا گیا، میرا یقین اس خواب کی حقیقت پر کم ہونے کے بجائے پختہ ہوتا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی قدم اٹھانا ضروری ہے، مگر میں کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں کہتا کہ میں خواب کی باتوں پر ایمان لا رہا ہوں تو وہ ہنستے یا میری دماغی حالت پر شک کرتے۔ آخر میں کیا مدد مانگتا؟ میرے پاس تو صرف ایک خواب تھا۔ میں نے طے کیا کہ ابھی کسی بھی منصوبے کے بارے میں سوچنا قبل از وقت ہے۔ پہلے مجھے مزید معلومات درکار ہوں گی اور وہ معلومات صرف خواب کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی تھیں۔

رات کے کھانے پر میں نے پوری ذمے داری سے اپنی اندرونی ہلچل چھپائے رکھی تاکہ براؤن اور اس کی بیوی کو کچھ اندازہ نہ ہو اور کھانے کے فوراً بعد میں سونے کے لیے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہی گہری نیند میں میرے ذہن میں ایک مبہم منظر ابھرنے لگا۔ آخر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہی تصویر، وہی فضا مگر اب وہ منظر پہلے سے زیادہ واضح تھا...... اور جب رابرٹ نے بولنا شروع کیا تو اس دفعہ میں نے اس کے زیادہ تر الفاظ آسانی سے سن لیے۔

اس رات کے خواب میں میری صبح کی تمام قیاس آرائیاں درست ثابت ہوئیں۔ اگرچہ گفتگو ختم ہوتے ہی میں بیدار نہیں ہوا۔ رابرٹ کچھ خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تصدیق کی کہ اس کے چار بعدی قید خانے میں ہر رنگ اور فاصلے واقعی الٹ گئے تھے۔ سیاہ سفید بن گیا، فاصلہ بڑھ گیا اور سارا تناسب الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ رابرٹ نے یہ بھی بتایا کہ آئینے کی دنیا میں انسانی جسم کا نظام ہماری عام زندگی سے بالکل مختلف ہے۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہاں خوراک کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

اگلی رات پھر خواب کے ذریعے میرا اس سے رابطہ ہوا۔ اب وہ مزید منظم ہو گیا تھا۔ اگرچہ کبھی کبھی اس کی بات تھکن، خوف یا کسی نامعلوم مداخلت کے باعث ادھوری رہ جاتی تھی۔ میں یہاں وہ سب بیان کر رہا ہوں جو رابرٹ نے ان مختصر اور مبہم خوابوں میں بتایا اور ساتھ ساتھ وہ حقائق بھی جو اس کی رہائی سے متعلق براہِ راست تھے۔ یہ ذہنی ترسیل ٹکڑوں میں، ادھوری اور بے ربط تھی مگر میں نے ممکن

دن تک جاگ کر ہر لفظ، ہر اشارے کو بار بار پرکھا، انہیں ترتیب دیا، جانچا اور ایک نیم جنون کی کیفیت میں تجزیہ کیا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ صرف اسی طرح میں رابرٹ کو انسانی دنیا میں واپس لاسکتا ہوں۔

رابرٹ کی قید کی دنیا کوئی رنگا رنگ، لامحدود اور عجائبات سے بھری ہوئی وادی نہ تھی۔ درحقیقت وہ ہماری رنگین دنیا کے چند محدود حصوں کی ایک غیر مانوس عکس بندی تھی جو انتہائی عجیب اور بگڑی ہوئی روشنی میں نظر آتی تھی۔ یہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی، غیر مادی اور ناہموار دنیا تھی۔ ایسی دنیا جو بظاہر ایک دوسرے سے بے تعلق مناظر پر مشتمل ہو، جو ایک دوسرے میں مدغم ہوتے جاتے تھے۔ ان مناظر کے اجزا کی حیثیت اس جسمانی وجود (رابرٹ) سے بالکل مختلف تھی جو آئینے کے اندر کھینچ لیا گیا تھا۔ یہ مناظر ایسے تھے جیسے خواب کے مناظر ہوں یا پھر کسی کلیڈو اسکوپ کی رنگ بدلتی تصویریں۔

وہاں روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر بہت ہلکی تھی۔ رنگوں کا باہمی تضاد، سبز اینٹوں کی دیواریں، پیلے آسمان پر سیاہ اور سرمئی بادل، درختوں کے سفید مائل تنے اور گھاس کی دہکتی ہوئی سرخی عام مناظر کو بھی ایک ہیولائی روپ دے رہی تھی۔ دن اور رات کی باری ہماری دنیا کے برعکس انداز میں ہوتی یعنی جب یہاں دن ہوتا، وہاں رات اتر آتی اور جب یہاں اندھیرا چھاتا تو آئینے کی دنیا روشنی سے بھر جاتی تھی۔

ابتدا میں رابرٹ کو آئینے کے مناظر کی یکسانیت اور ویرانی نے پریشان کیا، پھر اس پر انکشاف ہوا کہ یہ سب مقامات دراصل وہی ہیں جو آئینے میں برسوں تک منعکس ہوتے رہے۔ ہر منظر کسی دروازے یا کھڑکی کے فریم سے گھرا ہوتا۔ گویا خود آئینہ ان نظاروں کو اپنے اندر قید کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہو، مگر یہ عکس مادی نہیں تھے۔ آئینہ ان چیزوں کو ان کے جسمانی وجود سمیت نہیں کھینچتا، بلکہ صرف ان کی عارضی تصویری روح جذب کرتا تھا۔

نظری اعتبار سے آئینے میں قید شخص چند لمحوں میں دنیا کے کسی بھی گوشے میں جا سکتا تھا بشرطیکہ وہ جگہ کبھی آئینے میں منعکس ہوئی ہو۔ یہ ان مقامات پر بھی صادق آتا تھا جہاں آئینہ زیادہ دیر نہ رہا اور جن کے عکس دھندلے یا تاریک تھے۔ ان مناظر کے پار ایک بے حد وسیع سرمئی شفق کا جہان پھیلا ہوا تھا جہاں روشنی اور اندھیرے کی سرحدیں مدغم تھیں۔ رابرٹ وہاں جانے سے خوفزدہ رہتا کہ کہیں ان دنیاؤں کے حلق اور آئینے کے درختوں میں ہمیشہ کے لیے کھو نہ جائے۔

رابرٹ نے بتایا کہ وہ اپنی قید میں اکیلا نہیں ہے، اس کے ساتھ اور بھی لوگ ہیں، سب پرانے زمانے کے لباسوں میں ہیں۔ ایک گول مٹول درمیانی عمر کا شخص جس نے وگ اور گول گھٹنے تک پاجامہ پہنا ہوا تھا، اگرچہ بڑی روانی سے بولتا مگر لہجے میں ایک واضح اسکینڈے نیویائی تاثر تھا۔ ایک نہایت حسین ننھی لڑکی، جس کے سنہری بال آئینے کی دنیا میں گہرے نیلے نظر آتے تھے۔ دو لوگ، غالباً حبشی، جن کے بڑے نقوش ان کی چمکیلی رنگت سے بے حد مضحکہ خیز تضاد رکھتے تھے۔ ایک جوان عورت، ایک ننھا بچہ جو شاید ابھی بولنا بھی نہیں جانتا تھا اور آخر میں ایک دبلا پتلا مفکر ذہین جس کی شکل سے ذہانت جھلکتی تھی مگر چہرے پر رحم یا نرمی نہ تھی۔ گویا علم اور شرارت ایک ہی قالب میں ڈھل گئے تھے۔

اس ذہین کا نام ایگزل ہولم تھا۔ وہ سترھویں صدی کے لباس میں ملبوس تھا، اوپر سے چست اور نیچے سے پھیلا ہوا لمبا کوٹ، ریشمی پاجامہ اور بڑی بھری ہوئی وگ۔ اس چھوٹے سے گروہ میں وہ سب سے نمایاں تھا کیونکہ وہی دوسروں کی قید کا ذمے دار تھا۔ یہ وہی ہولم تھا جو بیک وقت کالا جادو اور شیشہ سازی دونوں میں مہارت رکھتا تھا اور جس نے صدیوں پہلے یہ عجیب و غریب مکانی قید خانہ تخلیق کیا تھا، جہاں اب وہ خود، اس کے غلام اور وہ تمام لوگ جنہیں اس نے لالچ یا فریب سے اندر بلایا، ہمیشہ کے لیے قید ہو چکے تھے یا کم از کم جب تک آئینہ سلامت تھا، انہیں اندر ہی رہنا تھا۔

ہولم سترھویں صدی کے آغاز میں کوپن ہیگن میں پیدا ہوا۔ وہ شیشہ پھونکنے اور سانچے میں ڈھالنے کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ اس کے بنائے ہوئے بڑے بڑے آئینے فن کے نمونے سمجھے جاتے تھے، مگر یہی بے باک ذہن جو اسے یورپ کا بہترین شیشہ ساز بناتا تھا، اسے مادی ہنر سے آگے علم و وجود کی سرحدوں تک لے گیا۔ اسے انسان کی محدود عقل اور قوتوں سے بیزاری تھی۔ چنانچہ اس نے اندھیری راہوں کا انتخاب کیا اور وہاں ایسی کامیابی پائی جو کسی انسان کو نصیب نہیں ہونی چاہیے۔ وہ ابدی زندگی کا ذائقہ چکھنا چاہتا تھا اور آئینہ اس کی راہ بن گیا۔ ہماری صدی میں آئن اسٹائن نے جسے "چوتھی بعد" کا مطالعہ قرار دیا، وہ دراصل ہولم نے سترھویں صدی میں پہلے ہی شروع کر دیا تھا۔ اسی نے دریافت کیا کہ موت کو جزوی طور پر روکا جا سکتا ہے، بشرطیکہ انسان کائنات کے کسی پوشیدہ مرحلے میں داخل ہو جائے۔ اس کے خیال میں روشنی کا انعکاس تمام بعدوں کی سمتوں کا ایک عالمگیر دروازہ تھا۔ چنانچہ اس نے ایک نایاب اور قدیم

... نے ... اپنی ... ائی صرف کر دی۔ ... چند جو رنگوں کو جذب کرتا ہو یا اس کا کوئی کھوا، جسے بعض قدیم تحریروں میں "لوکی کی آنکھ" کہا گیا ہے۔ تقدیر نے اس پر مہربانی کی۔ جب اس نے اپنے طے کردہ طریقے سے اس "آنکھ" کا مطالعہ کیا تو اس پر یہ انکشاف ہوا کہ زندگی یعنی شکل اور شعور کا تسلسل آئینے کی اس ... میں لامحدود عرصے تک برقرار رہ سکتا ہے، بشرطیکہ عکس پیشہ بھی ٹوٹنے یا زائل نہ ہو۔

آخر ہولم نے ایک منفرد آئینہ تخلیق کیا۔ ایسا آئینہ جو نایاب بھی تھا اور بیش قیمت بھی۔ اس نے بڑی مہارت سے اس میں "لوکی کی آنکھ" کا کیمیائی جوہر پیوست کر دیا تھا جو اس نے بڑی تلاش کے بعد حاصل کیا تھا۔ یوں اس نے اپنی پناہ گاہ اور چند اوزار تیار کر لیے تھے۔

پھر اس نے گزرگاہ کے طریقے اور اس نئی زندگی کی شرائط پر غور شروع کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب وہ اس آئینے کی دنیا میں داخل ہو تو اس کے ساتھ کچھ خادم اور چند ساتھی بھی ہوں۔ چنانچہ تجربے کے آغاز کے لیے اس نے ویسٹ انڈیز سے لائے گئے اپنے دو وفادار حبشی غلاموں کو سب سے پہلے اس شیشے کے اندر بھیج دیا۔ وہ لمحہ کیسا رہا ہوگا جب ہولم نے اپنی تھیوری کی پہلی ٹھوس تصدیق اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوگی؟ میں صرف اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔ وہ یقیناً علم و عمل کا یکتا آدمی تھا اور یہ بخوبی سمجھتا تھا کہ اگر آئینے کی دنیا میں رہنے والا اپنی قدرتی عمر سے زیادہ عرصہ وہاں رہے تو واپسی کی کوشش کرتے ہی اس کا جسم لمحے بھر میں ریزہ ریزہ ہو جائے گا، لیکن اگر آئینہ سلامت رہے تو اس کے قیدی ہمیشہ کے لیے وقت سے آزاد ہو جائیں گے۔ نہ انہیں بھوک لگے گی، نہ پیاس، نہ بڑھاپا۔

اپنے اس قید خانے کو زیادہ قابلِ برداشت بنانے کے لیے ہولم نے اپنی کتب، نوشتے، فرنیچر اور چند مانوس اشیا آئینے کی دنیا میں منتقل کر دیں۔ وہ جانتا تھا کہ آئینے میں عکس محض عکس نہیں، حقیقی معنوں میں چھوڑی نہ جا سکیں گی بلکہ خواب کے پردے کے مانند اس کے گرد پھیل جائیں گی۔ سن 1687 میں اس کا اندر جانا ایک تاریخی موڑ ... کے نشے اور دہشت کے احساس سے لبریز۔ اگر ذرا سی بھی رکاوٹ آ جاتی تو ہولم ہمیشہ کے لیے کسی نامعلوم کثیر الجہتی تاریکی میں کھو جاتا۔

نصف صدی تک وہ اپنے محدود غلاموں کے حلقے میں تنہا رہا مگر بعد میں اس نے اپنی ٹیلی پیتھک بصارت کو کام

کر لیا۔ ایسی قوت جو اسے آئینے کے آس پاس کے بیرونی مناظر دکھا سکتی تھی۔ اسی قوت کے ذریعے وہ مخصوص انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ یوں رابرٹ اس پراسرار کشش کے زیرِ اثر آئینے کے "دروازے" پر ہاتھ رکھنے کے شوق میں اندر کھینچ لیا گیا تھا۔

ہولم اور اس کے ساتھی شیشے کے پیچھے ایک عجیب زندگی بسر کر رہے تھے۔ چونکہ وہ آئینہ ایک صدی تک اس ویران طویلے کی پتھریلی دیوار کے سامنے پڑا رہا تھا جہاں سے میں نے اسے پایا تھا، اس لیے رابرٹ اس طویل برزخ میں داخل ہونے والا پہلا انسان تھا۔ اس کی آمد ایک سنجیدہ اور انوکھا واقعہ تھی کیونکہ وہ بیرونی دنیا کی خبر لایا تھا۔ ایسی دنیا کی خبر جو ان قیدیوں کے لیے ناقابلِ تصور ہو چکی تھی اور خود رابرٹ بھی سترھویں اور اٹھارویں صدی کے لوگوں کو دیکھ کر سخت حیرت زدہ تھا۔

رابرٹ نے زیادہ تر معلومات ہیر تھیلے سے حاصل کیں۔ وہی کول منول ڈین جو اسکینڈے نیوی لہجے میں انگریزی بولتا تھا۔ وہ جلد ہی لڑکے سے مانوس ہو گیا اور سارا وقت اسی

متحدہ عرب امارات میں مقیم
اردو قارئین کے لیے خوشخبری
جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)
کے چاروں رسائل
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت
ایک فون کال کے فاصلے پر
آپ کال کریں، مطلوبہ رسالے آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔
اردو بک ورلڈ ایف زیڈ ای۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زاید آر ڈی، ای 311 شارجہ
971504805734
URDU BOOKS WORLD FZE
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

کے ساتھ باتوں میں گزارتا۔ دوسرے قیدیوں کو بھی رابرٹ سے انس ہو گیا۔ خود ہولم بھی اس پر خاصا مہربان تھا۔ اسی سے رابرٹ نے آئینے کے پھندے کی نوعیت اور اس میں داخل ہونے کے طریقے سیکھے۔ البتہ وہ احتیاط برتتا کہ جب ہولم پاس ہو تو مجھ سے ٹیلی پیتھک رابطہ نہ کرے۔ دو بار ایسا ہوا کہ ہماری ذہنی گفتگو کے دوران ہولم کی صورت اچانک نمودار ہوئی اور رابرٹ نے بلا تامل فوراً خاموشی اختیار کرلی۔

جب میں رابرٹ سے ہمکلام ہوتا تو اس کی دنیا کو نہیں دیکھ پاتا تھا۔ اس کا تصور میرے سامنے بس جسم کے خاکے اور لباس کے خطوط پر مشتمل ہوتا تھا۔ اگر رابرٹ، ہولم جتنا طاقتور ذہنی رابطہ رکھتا تو وہ اپنی ذات سے جدا پورے مناظر میرے سامنے پیش کرسکتا تھا۔

ان تمام کشمکش ایام میں، میں بے تابی سے رابرٹ کو بچانے کا راستہ ڈھونڈتا رہا۔ چوتھے دن یعنی اس کی گمشدگی کے نویں دن بالآخر ایک حل سامنے آیا۔ اگرچہ وہ نہایت سادہ مگر خطرناک تھا۔ اگر میں ناکام رہتا تو ناقابلِ بیان تباہی ہو سکتی تھی۔

منصوبہ اس بنیادی علم پر قائم تھا کہ آئینے کی دنیا سے کوئی شخص خود سے باہر نہیں آسکتا۔ اگر ہولم اور اس کے ساتھی ہمیشہ کے لیے شیشے میں مقید ہیں تو نجات صرف باہر سے ممکن ہے۔

مجھے یہ بھی سوچنا تھا کہ اگر کسی طرح دروازہ کھول دیا جائے تو باقی قیدیوں کا کیا انجام ہوگا؟ اور سب سے بڑھ کر ہولم کا۔ رابرٹ نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ خوفناک تھا۔ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ ہماری دنیا میں آئے اور اپنی شیطانی قوت کو استعمال کرے۔ ٹیلی پیتھک پیغامات یہ نہیں بتاتے تھے کہ اگر آئینہ ٹوٹے تو ان صدیوں پرانے اسیران کا کیا بنے گا۔ ایک اور مسئلہ بھی تھا کہ کامیابی کے بعد میں رابرٹ کو معمول کی زندگی میں کیسے واپس لاسکوں گا؟

☆☆☆

مگر جب میں نے فیصلہ کرلیا کہ یہ جوا کھیلنا ہی ہے، تو میں اسکول کی لیبارٹری سے ایک بڑا محدب عدسہ لایا اور آئینے کے اس مرکز کے ہر درسے کو غور ... جہاں وہ گروابی حلقے ... رحمانی دیتی تھی۔ زیادہ امکان یہ تھا کہ یہی حصہ وہ قدیم شیشہ تھا جسے ہولم نے اپنے جادوئی داخلے کے لیے استعمال کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود میں پرانے اور نئے شیشے کی سرحد کو واضح طور پر نہ پہچان سکا۔ میں نے کئی گھنٹے

نے ہولم کے فریم کے کنارے کو نشان زد کیا اور نیلی مومی پنسل سے اس کا خاکہ کھینچا۔ ایک تقریباً کامل بیضوی شکل ابھر آئی۔ اس کے بعد میں بازار گیا جہاں سے میں نے شیشہ کاٹنے والا ایک آلہ خریدا، جس کی مدد سے آئینے کے اس جادو زدہ حصے کو باقی شیشے سے کاٹ کر الگ کرنے کا میرا ارادہ تھا۔

میں نے اس تجربے کے لیے وقت کا انتخاب خوب سوچ سمجھ کر کیا۔ ایک ایسا لمحہ جو رابرٹ کی تقدیر کا فیصلہ کرے گا۔ آخرکار میں نے رات کے ڈھائی بجے کا وقت طے کیا۔ اول تو اس گھڑی مجھے مکمل تنہائی میسر آتی، دوم یہ کہ رابرٹ آئینے میں دوپہر ڈھائی بجے ہی داخل ہوا تھا۔ یہ مطابقت شاید اتفاقی تھی مگر میری فطری بصیرت نے کہا کہ یہی درست گھڑی ہے۔

آخرکار گمشدگی کے گیارھویں روز سحر سے کچھ پہلے، میں نے بیڈروم کے تمام پردے گرا دیے، ہال کا دروازہ بند کیا اور اپنا کام شروع کیا۔ سانس روکے میں نے مخفی، نیلی پنسل کی لکیر پر رکھی اور ایک آزمائشی چوٹ لگائی۔ پرانا، آدھ انچ موٹا شیشہ میرے متوازن دباؤ سے چرچرا اٹھا۔ میں نے پورا دائرہ مکمل کیا، پھر دوبارہ اس پر گزرا، اس بار مخفی کو اور گہرا دباتے ہوئے۔

پھر میں نے پوری احتیاط سے بھاری آئینہ میز سے اٹھایا، جس پر وہ مدت سے رکھا تھا اور اسے الٹا کر دیوار سے لگا دیا۔ پیچھے دو پتلی لکڑی کی جڑی ہوئی پٹیاں آہستگی سے الگ کیں، پھر شیشہ کاٹنے والے آلے کے ہتھے سے کٹے حصے پر ہلکی چوٹ لگائی۔ پہلی ہی ضرب سے بیضوی ٹکڑا اپنے فریم سے الگ ہو کر قالین پر جا گرا۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تیزی میرے لیے غیر متوقع تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ اب کیا ہوگا، مگر میں ہر صورت حال کے لیے تیار تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور جب میں گھٹنے زمین پر ٹیک کر چہرہ اس سوراخ کے قریب لایا تو اچانک ایک سڑی ہوئی، گھٹن بھری بو نے میرا سانس روک دیا۔ ایسی بو جو میں نے کبھی نہ سونگھی تھی۔ میری نگاہ دھندلا گئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی غیر مرئی قوت میرے جسم کو پیس رہی ہو۔ مجھے یاد ہے میں لڑکھڑا کر اٹھا اور قریب کے پردے کو تھامنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے کنڈے سے اکھڑ گیا اور میں بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔

جب ہوش آیا تو میں قالین پر پڑا تھا اور میری ٹانگیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں وہی ناقابلِ برداشت بدبو

کھلی ہوئی تھی۔ آنکھوں کی دھند صاف ہوئی تو میں نے
رابرٹ کو دیکھا۔ وہ گوشت پوست میں، اپنی اصل رنگت
کے ساتھ میرے سامنے، میری ٹانگیں اوپر کیے ہوئے کھڑا
تھا کہ خون سر کی طرف دوڑ سکے۔
ایک لمحے کے لیے میں بو کی شدت اور اس حیرت
ومسرت کے امتزاج سے جو میرے دل پر چھا گئی تھی، کچھ نہ
بول سکا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میں حرکت کر سکتا ہوں۔
میں نے ہاتھ اٹھا کر کمزور سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"بس بچے...... اب چھوڑ دو...... شکریہ۔ میرا خیال ہے
اب میں ٹھیک ہوں۔ یہ بو...... غالباً اسی نے مجھے چکرا دیا
تھا۔ ذرا کھڑکی کھولو مگر پورے پردے نہ ہٹانا۔"
میں بمشکل اٹھ کھڑا ہوا۔ خون کی گردش آہستہ آہستہ
بحال ہو رہی تھی۔ میں نے قریب کی کرسی کے پشتے کا سہارا
لیا۔ مجھے اب بھی چکر آ رہے تھے مگر کھڑکی سے آتی سرد، چبھتی
ہوا نے جلد ہی ہوش بحال کر دیے۔ میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ
گیا اور رابرٹ کی طرف دیکھا۔
"باقی لوگ کہاں ہیں...... اور تم کو کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔
رابرٹ لمحہ بھر ساکت کھڑا رہا، پھر بڑی سنجیدگی سے
بولا۔ "سر! وہ سب ختم ہو گئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے
دیکھا، سب ایک ایک کر کے غائب ہو گئے۔ اب اس آئینے
میں کچھ نہیں بچا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔
میں نے اسے کمبل لا کر دیا اور خود بھی ساتھ بیٹھ گیا،
پھر تسلی کے لیے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔
"اب سب ٹھیک ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔
جلد ہی ہم دونوں سنبھل گئے۔ میں نے اسے اسکول
واپس آنے کے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ واقعے کے
تجسس اور سچ کو معقول بہانے کے پیچھے چھپانے کی ضرورت
تھی۔ اس نے جلدی جلدی اپنی تجربات کی تمام تفصیلات سنانا
شروع کیں۔
جب میں نے شیشہ توڑا تو رابرٹ میری خواب گاہ
کے منعکس منظر میں تھا۔ جوں ہی پھندا ٹوٹا، وہ ہماری تین
جہتی دنیا میں آ گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی آزادی کو سمجھ
پاتا، اس نے میرے گرنے کا شور سنا۔ وہ دوڑ کر قریب آیا تو
مجھے بے ہوش پایا۔
میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ ہم دونوں نے
کس مہارت سے یہ ساری حقیقت چھپانے کا منصوبہ بنایا۔
بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ایک دن صبح سویرے میں اسے
گاڑی میں چھپا کر نکل گیا۔ دوپہر تک ہم ادھر ادھر گھومتے
رہے پھر واپس پلٹے۔ راستے میں ہم دونوں نے اپنی فرضی
کہانی پوری طرح یاد کر لی تھی۔ جب ہم اسکول پہنچے تو
براؤن اور اس کی بیوی رابرٹ کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ میں
نے بتایا کہ میں کسی کام سے شہر گیا تھا، واپس آتے ہوئے
راستے میں مجھے رابرٹ پیدل آتا نظر آیا تو میں نے اسے
گاڑی میں بٹھا لیا۔
رابرٹ نے اپنی داستان یوں سنائی کہ اس دن وہ
یونہی چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک گاڑی اس کے پاس آ کر
رکی۔ وہ کسی جگہ کا پتا پوچھ رہے تھے۔ رابرٹ نے انہیں
بتایا، لیکن وہ سمجھ نہیں سکے۔ انہوں نے درخواست کی کہ وہ
انہیں وہاں تک لے چلے۔ رابرٹ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستے
میں دوسرے آدمی نے نہ جانے اسے کیا سنگھایا کہ وہ بے
ہوش ہو گیا۔ اسے ہوش آیا تو وہ جنگل کے درمیان ایک لکڑی
کی چوکی میں قید تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ وہاں چلے آئے اور
اسے پانی اور بسکٹ کے ڈبے دے دیے، پھر ایک آدمی بولا۔
"ہم کچھ دن میں واپس آئیں گے جب تک تم
خاموشی سے یہاں رہتے رہو۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔
رابرٹ دیر تک چیختا چلاتا رہا مگر اس جگہ میں کوئی
نہیں آتا تھا۔ دس دن تک وہ وہاں بند رہا۔ جب کھانا پینا ختم
ہو گیا تو اس نے بڑی مشکل سے دروازہ توڑا اور وہاں سے
فرار ہو گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ دو دن
تک پیدل چلتا رہا، آخر اس کی مجھ سے ملاقات ہو گئی۔
رابرٹ بیمار تھا اور بہت کمزور ہو گیا تھا۔
براؤن نے فوراً رابرٹ کے والدین سے رابطہ کیا۔
کہانی اس نے بلا تامل مان لی تھی کیونکہ رابرٹ کی نحیف
حالت کسی اور سوال کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ یہ طے پایا
کہ رابرٹ کچھ عرصے اسکول ہی میں آرام کرے گا۔
براؤن کی بیوی جو سابق نرس تھی، اس کی تیمارداری پر راضی
ہو گئی تھی۔
میں اکثر اس سے ملنے جاتا۔ یوں مجھے موقع ملا کہ جو
باتیں اس نے خواب میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے مجھے بتائی
تھیں، ان کی خالی جگہیں پُر کر سکوں۔ کبھی کبھی ہم دونوں اس
واقعے کی حقیقت پر شک کرنے لگتے، سوچتے کہ شاید ہم کسی
وہم یا نادیدہ جادو کے اسیر ہو گئے تھے، شاید آئینے کی پُراسرار
سحر انگیزی نے ہمیں کسی اجتماعی فریب میں مبتلا کر دیا تھا مگر
ہر بار ایک سبب یا ہمیں شک سے یقین کی طرف واپس
لے آتی۔ مجھے رابرٹ کے الٹے رنگوں والے چہرے،
بھاری آواز اور اسے ماضی کے صدیوں پرانے انسانوں کی

خوابناک شان و شوکت، وہ بے جان مناظر اور سب سے بڑھ کر وہ مرگ زدہ بدبو جو آئینے کے شگاف سے اٹھی تھی، کبھی نہیں بھول سکتی تھی...... اور پھر کم از کم دو ثبوت ایسے تھے جو اس واقعے کی سچائی کو مزید تقویت دیتے تھے۔ ایک ثبوت میری ان تحقیقات سے حاصل ہوا جو میں نے ہولم کے بارے میں کیں۔ واقعی ایسا شخص ماضی میں موجود تھا۔ اس کے بارے میں مجھے کافی تحریری ریکارڈز ملے تھے۔ کوپن ہیگن کا وہ شیشہ ساز واقعی ایک سیاہ جادوگر کے طور پر مشہور تھا۔ اس کی پراسرار گمشدگی دو صدی تک لوگوں کے لیے عقیدت انگیز بحث کا موضوع بنی رہی۔ وہ شخص ہر وجود کو سمجھنے اور انسان کی تمام حدود سے آگے بڑھنے کی جنون کی حد تک خواہش رکھتا تھا، اسی لیے بچپن سے ہی اس نے ممنوعہ علوم اور خفیہ فنون میں اپنا دل لگا لیا تھا۔ اس کے مقاصد عجیب و غریب تھے جو کبھی پوری طرح سمجھے نہ جاسکے مگر سب مانتے تھے کہ ان میں بدبختی اور ظلمت پوشیدہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے دو حبشی خادم جلد ہی گونگے ہو گئے اور پھر ایک دن خود ہولم کے ساتھ ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

ہولم کے ذہن میں ایک نئی دیوانگی نے جنم لیا تھا یعنی ”آئینے کے ذریعے لافانی ہونے“ کا خواب۔ یہ افواہیں عام تھیں کہ اس نے اپنے اس منصوبے کا مرکزی جزو کہاں سے حاصل کیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا کہ اس نے کسی غیر ملکی میوزیم سے تراش خراش اور مرمت کے بہانے چرا لیا تھا۔ وہ ایک بیضوی، چمکدار اور چھلنے والے معدنی پتھر کی تختی تھی جسے ”لوکی کی آنکھ“ کہا جاتا تھا۔ لوک داستانوں کے مطابق اسے جادوئی خواص حاصل تھے۔ اپنے مالک کے دشمنوں کو دیکھنے کی صلاحیت یا مستقبل قریب کی خبریں دینے کا ہنر اسے آتا تھا۔ تمام ماہرین اس کی کہن سالی اور ناقابلِ تصور طاقتوں پر متفق تھے۔ اسی وجہ سے ہولم کے اس تجربے کی خبر انہیں خوفزدہ کر گئی جس میں وہ لوکی کی آنکھ پر مبنی ایک عظیم آئینہ تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر پھر ایک دن ہولم غائب ہو گیا۔ اس کی تمام جائداد نیلام کر دی گئی۔ بیشتر لوگوں کے نزدیک یہ ایک دیو مالائی حکایت تھی لیکن میرے لیے یہ ثبوت تھا، ان حیرت انگیز واقعات کا جن کا سامنا میں نے اور رابرٹ نے کیا تھا۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد جب رابرٹ کی حالت خاصی بہتر ہو چکی تھی، ایک دن وہ میرے کمرے کے آتش دان میں لکڑیاں ڈال رہا تھا کہ میں نے اس کی حرکات میں ایک عجیب بے ڈھنگا پن محسوس کیا۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میز پر رکھی دوات اٹھا کر لائے۔ مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوئی جب میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کے بجائے بائیں ہاتھ سے اسے اٹھایا ہے۔

پھر میں نے مسز براؤن کے اسٹیتھو اسکوپ کی مدد سے دریافت کیا کہ اس کا دل اب سینے کے دائیں جانب دھڑک رہا ہے۔ میں نے کچھ عرصے تک یہ دریافت اس سے چھپائے رکھی تا کہ وہ پریشان نہ ہو۔

رابرٹ جب آئینے میں داخل ہوا تو ایک عام انسان کی طرح دائیں ہاتھ والا اور جسم کی قدرتی ترتیب و ساخت میں تھا لیکن وہ لوٹا بائیں ہاتھ والا بن کر، اپنی اندرونی بناوٹ کے ساتھ الٹی سمت میں ڈھلا ہوا اور میرا خیال ہے کہ یہ کیفیت اس کے ساتھ زندگی بھر باقی رہے گی۔

اب شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ یہ محض وہم یا فریب نظر نہ تھا۔ رابرٹ کی جسمانی تبدیلیاں ٹھوس اور ناقابلِ تردید تھیں۔ اگر وہ آئینے کے اندرونی عالم سے کسی قدرتی راستے سے واپس آتا تو شاید اس کا بدن پوری طرح پلٹ جاتا اور ہر چیز معمول پر آجاتی مگر چونکہ اس کی نجات جھٹکے اور تباہی کے عالم میں ہوئی، تو یہ تضاد پیدا ہو گیا۔

میں نے ہولم کا جال صرف کھولا نہیں تھا، بلکہ اسے توڑ ڈالا تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آئینے سے نکلتے وقت رابرٹ نے کوئی اذیت محسوس نہیں کی تھی، جیسی کہ داخل ہوتے وقت ہوئی تھی۔ میں سوچتا ہوں، اگر اس وقت شگاف کا کھلنا ذرا سا بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا تو اس کے لیے اس الٹی رنگت والے بدن کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا دشوار ہوتا۔ دل اور اندرونی اعضا ہی نہیں، بلکہ یہ تبدیلی اس کے لباس پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ جیبیں، بٹن، سب کچھ آئینے کی سمت میں الٹے ہو گئے تھے۔

اب لوکی کی آنکھ میرے پاس ہے۔ میں نے اسے اس قدیمی آئینے میں دوبارہ نصب نہیں کیا۔ یہ اب میری میز پر بطور پیپر ویٹ استعمال ہوتی ہے۔ میرے دوست اسے شیشے کے کام کا پرانا نمونہ سمجھتے ہیں، شاید ایک صدی پرانا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ لوکی کی آنکھ ایک ایسا شاہکار ہے جو انسانی تہذیب میں ناقابلِ قیاس حد تک قدیم اور لامحدود خصوصیات کی حامل ہے۔ میں اپنے دوستوں کی اس غلط فہمی کو درست کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔

✖✖✖

دمشق کے سردار ابو جلاس عبدی قریشی کے کئی غلام تھے۔ ان میں سے ایک کا نام حارث تھا۔ حارث کا باپ ابوالرحمان دمشق سے دور موضع حولہ میں رہتا تھا۔ اس کی یہ بدقسمتی تھی کہ وہ خود تو غلام تھا مگر اس کا باپ آزاد۔ دونوں الگ

حارث کذاب

ضیاء تسنیم بلگرامی

دمشق کا عابد و زاہد جس کے تقویٰ اور پرہیز گاری کا ایک زمانہ قائل تھا۔ وہ ایک رئیس کا غلام بھی تھا۔ رئیس نے اس کو اس لیے آزاد کر دیا کہ وہ اس کے سچ اور پرہیز گاری سے متاثر تھا۔ اس کا ایمان چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم تھا۔ پھر شیطان کی نظرِ انتخاب اس پر پڑی۔ ابلیس نے اس کے کان میں کچھ پھونک دیا اور ایسا مشاہدہ کرا دیا کہ وہی کبر اور غرور جو ابلیس کے لیے وبالِ جان بن گیا تھا، حارث میں حلول کر گیا۔ پھر اس نے بھی وہی کام شروع کر دیا جو اس کا آقا ابلیس ایک عرصے سے کرتا چلا آرہا ہے۔ حارث نبی بن بیٹھا اور اپنے پیچھے امتیوں کا ہجوم اکٹھا کر لیا۔ شیطان نے آخر کار اسی کو تنہا چھوڑ دیا۔

ایک جھوٹے مدعی نبوت
کے حالات و سوانح

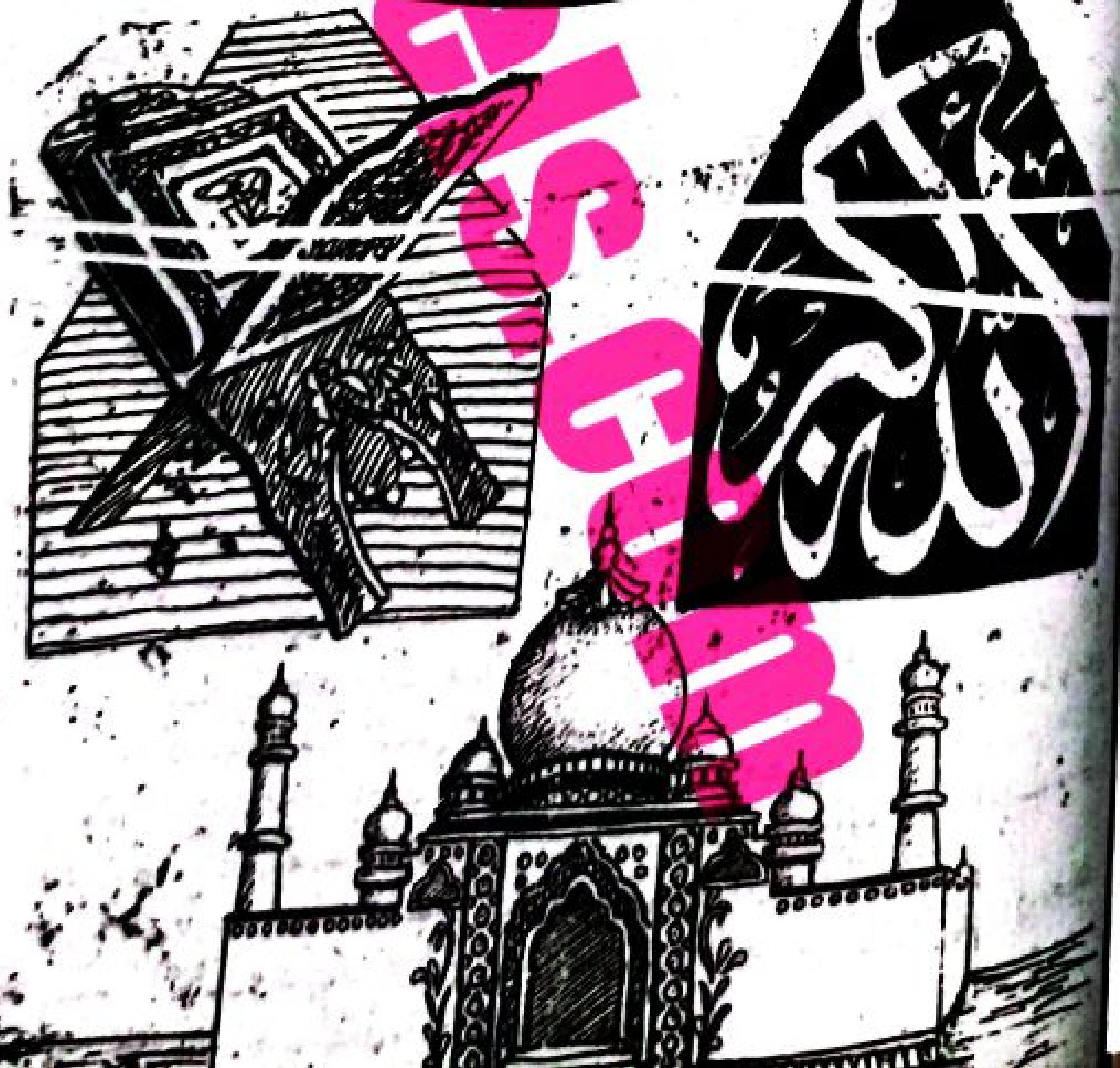

الگ رہتے تھے۔ حارث طبعاً نیک اور کم گو تھا۔ اس کا مالک ابوجلاس اس کی خاموشی اور عزلت پسندی سے خاصا متاثر تھا۔ اس نے بار ہا یہ دیکھا کہ جب حارث فارغ ہوتا تو نماز میں مشغول ہو جاتا۔ وہ کسی کے خلاف کبھی اپنی زبان نہ کھولتا۔ دوسروں سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ ابوجلاس کچھ عرصے سے اس کی حرکات و سکنات اور عادات و اطوار پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کو بڑی حیرت تھی کہ حارث کیسا انسان ہے جو کسی کی اچھائی یا برائی میں شامل نہیں ہوتا۔ اسے یہ شبہ بھی تھا کہ حارث مکار ہے اور اپنی مکاری پر خاموشی اور بردباری کا خول چڑھا رکھا ہے۔

ابوجلاس نے اپنے ایک غلام سے پوچھا۔ "یہ حارث کیسا انسان ہے؟"

غلام نے جواب دیا۔ "بہت عمدہ، ہم لوگ اس کی برائیاں تلاش کرتے ہیں مگر مایوسی اور حیرت کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتے ہیں۔"

ابوجلاس نے کہا۔ "لیکن ہم اس کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔"

غلام نے پوچھا۔ "آپ اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

ابوجلاس نے پوچھا۔ "اس وقت حارث کہاں ہے؟"

غلام نے جواب دیا۔ "وہ فرصت کے اوقات میں نوافل ادا کرتا رہتا ہے چونکہ اس وقت بھی نماز کا کوئی وقت نہیں ہے اس لیے وہ نفلیں پڑھ رہا ہے۔"

ابوجلاس نے آہستہ سے کہا۔ "تو میرا ایک کام کر سکتا ہے؟"

غلام نے جواب دیا۔ "آپ مالک ہیں اور میں غلام۔ آپ مجھ سے اجازت لے رہے ہیں کہ میں آپ کا کام کر سکتا ہوں یا نہیں۔"

ابوجلاس نے کہا۔ "تو حارث سے میری برائیاں کر اور وہ تیری باتوں کا جو جواب دے اس سے مجھے مطلع کر۔"

غلام اپنے مالک کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ "میں آپ کی برائی کروں، مگر کیوں؟"

ابوجلاس نے اسے سمجھایا۔ "میں حارث کے کردار کو باہر لانا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اس کی سادگی اور خاموشی پر شبہ ہے۔"

غلام کو اندیشہ تھا کہ اس طرح اس کا مالک اسے کسی چکر میں پھانسنا چاہتا ہے۔ وہ اس کام پر آمادہ نہیں نظر آ رہا تھا۔

ابوجلاس نے اسے سمجھایا۔ "میں تجھ سے جو کہہ رہا ہوں وہ کر۔ ہو سکتا ہے کہ میں تیرے اس کام کے صلے میں تجھے کسی ایسی شے سے نواز دوں جس سے تو زندگی بھر لطف اندوز ہوتا رہے۔"

غلام نے جواب دیا۔ "میں آپ کا یہ کام کر دوں گا مگر میں ڈرتا ہوں کہ آپ مجھ سے اس کام کے سلسلے میں کہیں ناراض نہ ہو جائیں کیونکہ مجھے حارث [illegible] کے اندر سے باہر [illegible] کچھ کرنا پڑے اور وہ باتیں آپ کے کانوں تک پہنچیں اور آپ مجھ سے ناراض ہو جائیں اور میں [illegible] سمجھوں۔"

ابوجلاس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "حارث میرا [illegible] بھی ہے۔ میں نے اس کی پرورش اپنے بیٹے کی طرح کی ہے اس لیے اس کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گا اور رہ گئی یہ بات کہ میں تیری کسی بات سے ناراض ہو جاؤں گا تو یہ وسوسہ بھی اپنے دل سے نکال دے۔"

حکم حاکم مرگ مفاجات، اسے اپنے مالک کی خواہش پوری کرنی پڑی۔ غلام دوسرے ہی دن فجر کی نماز کے بعد حارث سے ملا۔ وہ اس وقت بے حد غمزدہ اور افسردہ تھا۔ غلام نے اس کا سبب پوچھا۔ "کیا بات ہے، کیا ابوجلاس نے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی کہ تو اس سے افسردہ ہو گیا؟"

حارث نے جواب دیا۔ "ابوجلاس تو بہت شریف انسان ہے، میں اس کی کیا شکایت کروں گا۔"

غلام نے ادھر ادھر دیکھ کر حارث کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں کہا۔ "کل ابوجلاس نے تیری بڑی برائیاں کیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ حارث نہایت مکار انسان ہے۔ اس کی خاموشی اس کی مکاری کا ثبوت ہے۔"

حارث نے کہا۔ "لیکن میں تجھ سے متفق نہیں ہوں۔ میں نے بچپنے سے جوانی تک ایک آزمائشی دور گزارا ہے اور میں نے ہر ہر قدم پر ابوجلاس کو ایک بہترین انسان پایا ہے اس لیے اب میں اس پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا۔"

غلام نے کہا۔ "ابھی کل کی بات ہے کہ ابوجلاس تیرے بارے میں کہہ رہا تھا کہ حارث کو اس کی کام چوری کی وجہ سے سزا ملنی چاہیے اور مجھے ڈر ہے کہ ابوجلاس تجھے کوئی بدترین سزا دینے والا ہے۔"

حارث پر اس شکایت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جواب دیا۔ "میں کام چور نہیں اور نہ ہی یہ الزام مجھ پر ثابت ہو سکتا ہے اس لیے کوئی سزا دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

غلام نے کہا۔ "بہر حال تو کچھ بھی کہے لیکن ابوجلاس ایک برا آدمی ہے اور ہم سب کو یہ کوشش کرنا چاہیے کہ اس کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے اور میں اس سلسلے میں تیرے کام آ سکتا ہوں۔"

حارث نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ "جس حال میں بھی اللہ رکھے، میں خوش ہوں اور ابوجلاس ایک اچھا آدمی ہے۔ تو معلوم نہیں کیوں اس پر الزام لگائے چلا جا رہا ہے۔"

غلام نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ "تجھے تیری غیر معمولی عبادتوں نے پست ہمت کر دیا ہے۔ تجھے برا آدمی بھی اچھا لگتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابوجلاس بہت برا آدمی ہے۔ اس نے ہم انسانوں کو غلام بنا رکھا ہے حالانکہ ہم اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے۔ اگر تو ذرا سی ہمت کر جائے اور میرا ساتھ دے دے تو میں ابوجلاس کو اپنی راہ سے ہٹا سکتا ہوں۔"

حارث نے جواب دیا۔ "جب مجھے اپنے آقا ابوجلاس سے کوئی شکایت ہی نہیں تو میں تیرا ساتھ کیا دوں گا۔" ان دونوں کی باتیں ابوجلاس بھی چھپ کر سن رہا تھا۔

غلام نے کہا۔ "مگر میں اپنی کوششیں جاری رکھوں گا اور آزادی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اگر پکڑا گیا تو اپنے جرم میں تجھے بھی شامل کر لوں گا کیونکہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ساتھ نہ دینے والوں کو زبردستی کھینچ کر اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔"

حارث نے کہا۔ "تو اپنے افعال کا خود ذمے دار ہے اور میرا اللہ گواہ ہے کہ میں تیرے برے ارادوں اور برے کاموں میں شامل نہیں۔"

غلام نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور کہا۔ "دوسرے میری مدد کرنے کو تیار ہیں۔ میں نے ان سے معاملہ طے کر لیا ہے۔"

حارث نے پوچھا۔ "مگر تیرا ارادہ کیا ہے اور تو مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتا ہے؟"

غلام نے جواب دیا۔ "آقا ابوجلاس ہر منگل کو شکار کھیلنے جاتا ہے اور دو دن گھر سے غائب رہ کر گھر واپس آتا ہے تو بہت تھکا ہوا ہوتا ہے اور گھوڑے بیچ کر گہری نیند سو جاتا ہے۔ میں اسے بے خبری میں قتل کر دوں گا اور ہم سب بھاگ کر آذربائیجان چلے جائیں گے اور وہاں سے کہیں اور۔"

حارث نے جواب دیا۔ "افسوس کہ میں اس منصوبے میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا مگر میں تیری شکایت آقا ابوجلاس سے نہیں کروں گا۔"

غلام نے کہا۔ "تب پھر تو ایسا کر کہ چند دنوں کے لیے یہاں سے کہیں اور چلا جا۔"

حارث نے وعدہ کر لیا۔ "ٹھیک ہے، میں کہیں اور چلا جاؤں گا مگر میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو اپنے ارادے سے باز آ جا۔"

بات یہیں پر ختم ہو گئی۔ دوسرے دن منگل تھا۔ حارث نے اپنے آقا ابوجلاس سے درخواست کی کہ شکار میں اسے بھی ساتھ رکھا جائے۔ ابوجلاس اپنے غلام حارث کو شکار پر اپنے ساتھ لے گیا۔ جب ابوجلاس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کسی شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑاتا تو حارث بھی اپنے گھوڑے پر سوار ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہوتا۔ ابوجلاس نے شکار میں کئی جانور ہلاک کر دیے۔ جب یہ لوگ جنگل میں عارضی چولہے روشن کر کے شکار کو بھوننے لگے تو حارث ان سے الگ ہو گیا اور بھنے ہوئے گوشت کو کھانے میں شرکت سے انکار کر دیا۔ ابوجلاس نے حیرت سے کہا۔ "حارث! کیا تو دو دن تک بھوکا رہ سکتا ہے؟"

حارث نے جواب دیا۔ "نہیں، ابھی میں اپنے نفس پر اتنا قابو نہیں رکھتا۔"

ابوجلاس نے کہا۔ "میں تین دن تک شکار کے پیچھے بھاگتا رہوں گا اور تو میرے ساتھ رہے گا۔ یہاں شکار کیے ہوئے جانوروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملے گا پھر تو اپنا پیٹ کس طرح بھرے گا؟"

حارث نے جواب دیا۔ "جس اللہ نے مجھے پیٹ دیا ہے، اسی نے اس کا رزق بھی اتارا ہے اور میں اپنے اللہ پر یقین کامل رکھتا ہوں کہ وہ مجھے بھوکا نہیں رکھے گا۔"

ابوجلاس نے شکار کیے ہوئے جانوروں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ اتنے بہت سارے جانور کون کھائے گا۔ اس لیے کھانے میں ہمارے ساتھ تو بھی شامل ہو جا۔"

حارث نے پوچھا۔ "میرے آقا! میں آپ سے ایک سوال کروں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

ابو جلاس کے ساتھی حیران تھے کہ اس کا غلام حارث اس سے کس حد تک بے تکلف ہے۔ کھانے میں وہ شریک نہیں ہو رہا اور فضول باتیں کر رہا ہے۔ ابو جلاس کے ایک ساتھی نے حارث کو ڈانٹ دیا۔ ''تو کیسا غلام ہے کہ اپنے مالک کی بات نہیں مانتا اور اس سے فضول باتیں کرتا رہتا ہے حالانکہ ہمارے غلام ہم سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کر سکتے۔''

حارث نے کہا۔ ''اس کے باوجود میں آپ لوگوں سے ایک سوال کروں گا۔''

ابو جلاس مسکرا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تو اپنا سوال ان سب سے نہیں، مجھ سے کر کیونکہ تیرا تعلق ان سب سے نہیں، صرف مجھ سے ہے۔''

حارث نے ابو جلاس سے پوچھا۔ ''میرے آقا! آپ اتنے بہت سارے جانوروں کا شکار کیوں کرتے ہیں؟''

ابو جلاس نے جواب دیا۔ ''شکار کا گوشت کھانے کے لیے اور اپنا شوق پورا کرنے کے لیے۔''

حارث نے کہا۔ ''جانوروں کا گوشت تو آپ کو شہر میں شکار کیے بغیر بھی مل جاتا ہے۔ رہ گیا شوق تو جانداروں کو بلاوجہ ہلاک کر کے شوق پورا کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔''

ابو جلاس کے ایک ساتھی نے حارث کو دو طمانچے رسید کر دیے۔ ابو جلاس نے آگے بڑھ کر اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔ ''یہ تو نے کیا کیا؟''

ساتھی نے جواب دیا۔ ''یہ آپ کا غلام ہے اور آپ سے گستاخ لب و لہجے میں باتیں کر رہا ہے۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔''

ابو جلاس نے کہا۔ ''جب میں اس کی جسارتیں برداشت کر رہا ہوں تو تم سب کیوں نہیں برداشت کر سکتے۔'' اور ابو جلاس نے حارث سے کہا۔ ''اپنی بات جاری رکھ، تو اور کیا کہنا چاہتا ہے؟''

حارث نے کہا۔ ''محض شوق کی خاطر جانوروں کو بلاوجہ ہلاک کر دینا آپ کو زیب نہیں دیتا جبکہ میں کئی دن سے یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ اتنے جانوروں کا شکار کرتے ہیں جتنے کھا نہیں سکتے اور اپنے شکار کے بیشتر جانور یونہی چھوڑ کر مزید شکار کے لیے آگے بڑھ جاتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ بات اللہ کو بھی ناپسند ہوگی۔'' حارث کی باتوں کا ابو جلاس پر بڑا اثر ہوا اور وہ شکار سے واپس آ گیا۔

ابو جلاس کو اپنے غلام پر شبہ ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے غلام سے حارث کو آزمانے کے سلسلے میں جو کام لینا چاہا تھا، غلام اس پر سنجیدگی سے عمل کرنے والا ہے۔ ابو جلاس کا خیال تھا کہ حارث غلام کا ساتھ نہ دینے کے بعد اس کا ذکر ابو جلاس سے ضرور کرے گا لیکن حارث نے غلام کی باتوں کا کوئی ذکر نہ کیا۔ آخر اس نے حارث سے خود ہی پوچھ لیا۔ ابو جلاس، حارث کو اپنی حویلی کے اندرونی حصے میں لے گیا اور غلام کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم دونوں نے مجھے ہلاک کر کے فرار ہو جانے کا منصوبہ بنایا ہے؟''

حارث نے جواب دیا۔ ''منصوبہ میں نے نہیں، اس غلام نے بنایا تھا جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں۔ وہ اپنے منصوبے میں مجھے شامل کرنا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔''

ابو جلاس نے کہا۔ ''اگر تو اس میں شامل نہیں تھا تو اس خطرناک منصوبے کا ذکر مجھ سے کیوں نہیں کیا؟''

حارث نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ سوچا تھا کہ جب وہ آپ پر کوئی وار کرے گا تو میں آپ کو بچاؤں گا اور اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کروں گا۔''

ابو جلاس نے حارث کو بتایا۔ ''شاید آج رات وہ میری خواب گاہ میں داخل ہو کر مجھے قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں دیکھوں گا اس وقت تو مجھے کس طرح بچائے گا۔''

حارث نے جواب دیا۔ ''میرے آقا! میں اس دنیا کے مطلب کا آدمی نہیں ہوں۔ اللہ کی یاد مجھے ہر وقت اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا اللہ مجھے اس آزمائش سے کامیاب نکالے گا۔''

اس رات ابو جلاس نے اپنی خواب گاہ میں بستر پر تکیوں کو شال میں لپیٹ کر اس طرح رکھ دیا کہ دیکھنے والا یہی سمجھے کہ ابو جلاس سو رہا ہے اور خود دوسرے کمرے سے غلام کا جائزہ لینے لگا۔ نصف شب کو غلام کئی دوسرے غلاموں کے ساتھ ابو جلاس کی خواب گاہ کی طرف بڑھا۔ خواب گاہ کے دروازے پر حارث پہلے سے موجود تھا۔ غلام نے حارث کو یہاں دیکھا تو بہت خوش ہوا اور کہا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تو میرا ساتھ ضرور دے گا۔''

حارث نے جواب دیا۔ "میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ تجھے تیرے ارادوں سے باز رکھوں۔"

غلام نے حارث کے دونوں خالی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو اپنے ان خالی ہاتھوں سے اپنے آقا کی حفاظت کرے گا؟"

حارث نے جواب دیا۔ "میں یہاں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میرا اللہ بھی ہے۔ میں اللہ کے بھروسے پر یہاں خالی ہاتھ آیا ہوں۔"

غلام نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "حارث کو پکڑ کر باہر لے جاؤ، ہم یہاں اپنا کام شروع کرتے ہیں۔"

دو غلاموں نے حارث کو پکڑنا چاہا، حارث نے ان کا مقابلہ کیا اور شور کرنے لگا۔ ابوجلاس اپنے ساتھیوں سمیت نمودار ہوا اور انہیں حکم دیا۔ "غلاموں کو گرفتار کرلیا جائے اور جو مزاحمت کرے، اسے قتل کردیا جائے۔"

غلام پکڑے گئے اور حارث کو عزت و احترام سے ابوجلاس کے سامنے پہنچایا گیا۔ ابوجلاس، حارث سے بے حد خوش تھا۔ وہ حارث کو اپنے خاندان کے ایک فرد کی طرح اس کمرے میں لے گیا جہاں وہ اپنے انتہائی معزز دوستوں کو بٹھایا کرتا تھا۔ ابوجلاس نے حارث کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "میں تجھ پر احسان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تو نے مجھ پر احسان کیا ہے۔"

حارث نے انکسار سے جواب دیا۔ "میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا، صرف اپنی ذمے داری پوری کی ہے۔"

ابوجلاس نے اس رات سے حارث کے ساتھ خصوصی رویہ رکھنا شروع کردیا۔ غلاموں کو قید کردیا گیا اور قاضی کے سامنے ان کا مقدمہ دائر کیا گیا اور گواہ کے طور پر حارث اور اپنے چند دوسرے آدمیوں کو پیش کیا گیا لیکن ابوجلاس بار بار حارث سے پوچھ رہا تھا۔ "میں تجھ سے کیا سلوک کروں کہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔"

حارث ہر بار یہی جواب دیتا رہا۔ "میں نے اپنی ذمے داری پوری کی تھی اس لیے خود کو کسی اجر یا انعام کا مستحق نہیں پاتا۔"

ابوجلاس نے کئی دنوں کے غوروفکر کے بعد اپنے ایک دوست کے مشورے پر حارث کو اپنی غلامی سے آزاد کردینے کا فیصلہ کیا۔ جب حارث کو یہ بتایا گیا کہ وہ آزاد کیا جارہا ہے تو وہ کسی حد تک خوش بھی ہوا مگر کچھ زیادہ نہیں۔ ابوجلاس کو اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اپنی آزادی سے خوش کیوں نہیں ہوا؟ اسے اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ اس کے احسان سے حارث کو خوشی نہیں ہوئی۔ اس نے حارث سے پوچھا۔ "کیا میں تجھ سے پوچھ سکتا ہوں کہ تو اپنی آزادی سے خوش کیوں نہیں؟"

حارث نے جواب دیا۔ "میرے آقا! میں یہاں آپ کی سرپرستی میں اللہ کی یاد میں مشغول رہا کرتا تھا اور ساری ذمے داریاں آپ کو پوری کرنی پڑتی تھیں۔ اب آزادی کے بعد یہ ساری ذمے داریاں میرے سر آپڑیں گی۔ اب میں اللہ کی یاد میں کس طرح مشغول رہوں گا۔ میری مثال تو اس پرندے جیسی ہے جس کی پوری زندگی پنجرے میں گزری ہو اور آخر عمر میں اسے پنجرے سے آزاد کردیا جائے اور وہ پرندہ کھلی فضا کے مزے اور لطف سے بیگانہ ہوچکا ہو۔ میں سوچتا ہوں کہ آزادی سے اس کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

ابوجلاس نے کہا۔ "میں یہ سب نہیں جانتا۔ اب تو آزاد ہے۔ جو تیرے جی میں آئے کر، میرا اس سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔"

حارث آزادی کے بعد بھی کئی دن تک ابوجلاس کے ساتھ ہی رہا اور آخرکار اس نے حویلی سے نکل کر دمشق کے باہر جبلِ قاسیون کی راہ لی کیونکہ اس پہاڑ کی عظمت اور بزرگی کا بڑا چرچا تھا۔ ابوجلاس نے اپنے کئی آدمی حارث کے پیچھے روانہ کیے تاکہ وہ یہ دیکھیں کہ حارث کہاں جاتا ہے، کیا کرتا ہے اور اشیائے خوردونوش کا انتظام کس طرح کرتا ہے لیکن ان آدمیوں کے لیے حارث کا پیچھا کرنا مشکل ہوگیا کیونکہ حارث جلدی جلدی اپنی جگہیں بدلتا رہا۔ وہ کبھی کسی جگہ ہوتا اور کبھی کسی اور جگہ۔ اس نے پہاڑی غاروں میں عبادت کرنا شروع کردی۔ اب اس کی زندگی میں تزکیۂ نفس اور عبادت، ریاضت کے سوا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ وہ جبلِ قاسیون کے پہلو میں واقع گاؤں برزہ میں گیا۔ یہی وہ گاؤں ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے تھے اور یہیں وہ پہاڑ بھی ہے جہاں بہت سے پیغمبروں نے چڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگی تھیں۔ گاؤں برزہ میں ایک تنگ و تاریک غار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسی غار میں پیدا ہوئے تھے اور یہیں سے انہوں نے سورج، چاند اور ستاروں کا مشاہدہ کرکے یہ اعلان کیا تھا کہ لوگو، یہ ہمارے رب نہیں ہوسکتے کیونکہ انہیں زوال اور فنا سے گزرنا پڑتا ہے جبکہ ہمارا رب وہ ہے جسے نہ تو زوال ہے اور نہ فنا۔ یہاں غار کے باہر لوگوں نے ایک مسجد تعمیر کردی ہے جس کا بلند مینار بہت دور سے نظر آتا ہے۔ حارث نے اس مسجد کو اپنی عبادت اور ریاضت کے لیے پسند کیا۔ وہ دن میں کسی کسی وقت ادھر ادھر نکل جاتا اور محنت مشقت کرکے خوراک کا انتظام کرتا اور پھر عبادت و ریاضت میں مشغول ہوجاتا۔ اس کی راتیں شب بیداری میں گزرتیں اور دن کے بیشتر اوقات عبادت، ریاضت میں۔ وہ جبلِ قاسیون کے غاروں میں بھی یکسوئی سے بیٹھا غور کرتا رہتا

کہ انسان کو دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے، زندگی کا مقصد کیا ہے، یہ کائنات، زمین اور یہ آسمان کیوں پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ چاند، یہ ستارے اور یہ سورج کیوں بنائے گئے ہیں؟ وہ شب و روز اسی فکر میں گزارتا رہا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ یہاں کے مشہور قبرستان میں ستر ہزار انبیائے کرام کی قبریں ہیں۔ اس نے گھوم پھر کر اس وسیع و عریض حصے میں قبریں ہی قبریں دیکھیں۔ جگہ جگہ قبریں، قبروں کے آثار اور قبروں کی نشانیاں تھیں۔ وہ ان قبروں کے درمیان بھی عبادتیں کرتا رہا اور دعائیں مانگتا رہا۔

"اے اللہ العالمین! میں تیرا عاجز و ناتواں بندہ ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتا جبکہ مجھے بہت کچھ جاننا چاہیے تھا۔ اب میں تیری عبادت کرتا ہوں اور وہ سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

وہ جب اس قسم کی دعائیں مانگتا تو یہ بھول جاتا کہ اس کی راہنمائی کے لیے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی تشریف لا چکے ہیں اور قیامت تک کے لیے قرآن پاک چھوڑ گئے ہیں۔

آبادی کے جو لوگ حارث کو اس حال میں دیکھتے تو وہ بڑے متاثر ہوتے۔ ایک صوفی نے حارث کو اس حال میں دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔ "تو غاروں اور پہاڑوں میں کسے تلاش کرتا پھر رہا ہے؟"

حارث نے جواب دیا۔ "اپنے رب کو۔ اس رب کو جس نے سورج، چاند، ستارے اور کائنات پیدا کی ہے، ہر شے کو تخلیق کیا، جو پانی برساتا ہے، ہوائیں چلاتا ہے اور جس نے ہمارے لیے اناج اور پھل پھول پیدا کیے۔ میں اسے تلاش کرتا ہوں۔"

صوفی نے جواب دیا۔ "تو جسے پہاڑوں، غاروں اور قبرستانوں میں تلاش کر رہا ہے، وہ تو تیری رگِ گلو سے بھی قریب تر ہے۔ کیا تو قرآن پاک نہیں پڑھتا؟"

حارث نے ایک شانِ استغنا سے جواب دیا۔ "میں اسے کسی کی مدد اور تعاون کے بغیر پانا چاہتا ہوں۔ آخر انبیائے کرام کو وہ کسی کی راہنمائی کے بغیر ہی ملا تھا۔"

صوفی کو اس کی سوچ پر دکھ ہوا۔ اس نے کہا۔ "تو ان ویرانوں سے نکل اور کسی استادِ کامل کو تلاش کر کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اس طرح تو خود بھی تباہ و برباد ہوگا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبے گا۔"

حارث نے حقارت سے جواب دیا۔ "اے شخص! میں نہیں جانتا کہ تو کون ہے لیکن یہ جانتا ہوں کہ تو فضول انسان ہے کیونکہ تو مجھے ان شہروں کی طرف واپس بھیجنا چاہتا ہے جہاں ہر طرف برائیاں ہی برائیاں پھیلی ہوئی ہیں، جہاں ترغیب اور تحریص کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں دوبارہ وہاں گیا تو تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔"

صوفی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تباہی اور بربادی کا راستہ تو یہ ہے جس پر تو چل رہا ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تیری راہنمائی کروں مگر تیرا مرض لاعلاج معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تجھ پر رحم فرمائے۔"

حارث نے ذرا سی دیر کے لیے آنکھیں بند کیں اور جو دوبارہ کھولیں تو صوفی غائب تھا۔ حارث نے ادھر اُدھر دوڑ کر صوفی کو تلاش کیا مگر وہ نہیں ملا پھر جیسے اس پر القا ہوا کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے۔ "اے حارث! وہ شخص جسے تو صوفی سمجھ رہا تھا، تیرا ہی نفسِ لوامہ تھا جو تجھے گمراہی سے نکالنے کے لیے بشکلِ تجسیم تیرے روبرو آ کھڑا ہوا تھا۔" لیکن اسی لمحے حارث کو یہ خیال ہوا کہ وہ جس راہ پر چل رہا ہے، وہی صراطِ مستقیم ہے اور اسی راہ پر چل کر وہ خدا تک پہنچ سکتا ہے اور وہ راستہ جس کی نشاندہی صوفی کر گیا ہے، اسے گمراہی اور ضلالت کی طرف لے جائے گا۔ وہ جبلِ قاسیون کے غار میں روپوش ہو گیا اور کئی دن تک صرف اس پر غور کرتا رہا کہ یہ صوفی کون تھا اور وہ کیا کہہ رہا تھا۔ نفسِ امارہ اور نفسِ لوامہ میں شدید جنگ جاری تھی۔ نفسِ مطمئنہ دور کھڑا ان کی جنگ دیکھ رہا تھا۔ آخر نفسِ امارہ نے نفسِ لوامہ کو شکست دے دی اور حارث کو یہ یقین دلایا کہ صوفی تجھے آبادیوں میں بھیج کر گمراہ کر دینا چاہتا تھا مگر تو نے اس کی بات نہ مان کر خود کو بچا لیا۔

حارث نے پھر دعا کی۔ "اے اللہ! میں تجھ سے مدد چاہتا ہوں کہ مجھے نبیوں کی فراست عطا فرما۔ وہ فراست جو براہِ راست تجھ سے حاصل ہوتی ہے۔ میں کسی انسان کی راہنمائی اور فراست سے بچنا چاہتا ہوں۔ تیرے پاس فرشتوں کی فوج موجود ہے۔ تو ان میں سے کسی ایک فرشتے کو میرے پاس بھیج دیا کر جو مجھے وہی باتیں بتا دیا کرے جو تو بتانا چاہے۔ میں انسانوں کے بتائے ہوئے راستے پر نہیں چل سکتا۔"

وہ آوارہ و سرگرداں جبلِ قاسیون میں پھرتا رہا اور مناجات کرتا رہا۔ مولد ابراہیم کے مغرب میں تقریباً ایک میل دور ایک غار کہف الدم واقع ہے۔ حارث اسی غار میں کئی گھنٹے حالت مراقبے میں بیٹھا رہا اور عالم تصور میں کسی فرشتے کا منتظر رہا لیکن اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں کھولتا تو غار کا اندھیرا تھا اور آنکھیں بند کرتا تو بینائی کا اندھیرا۔ وہ

باہر آکر غار سے باہر نکلا تو ہر طرف سورج کی روشنی موجود تھی۔ غار کے اوپر چٹان میں سیاہی کی ایک لکیر دور تک چلی گئی تھی۔ لکیر نہایت چوڑی تھی اور اس نے آدھے پہاڑ کو اپنی زد میں لے لیا تھا۔ اس نے ایک شخص سے پوچھا۔ ''اے شخص! یہ کہف الدم کی چٹان پر سرخی مائل سیاہ نشان کس چیز کا ہے؟''

وہ شخص کچھ دیر تک حارث کی شکل دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ''تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

حارث نے جواب دیا۔ ''میں یہاں کچھ تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔''

راہ گیر نے پوچھا۔ ''آخر تو کسے تلاش کر رہا ہے؟''

حارث نے جواب دیا۔ ''اسے جسے نبیوں نے فرشتوں کی مدد سے پایا اور اسے جسے دنیا بھر کے فلسفی، عالم اور طالبانِ حق تلاش کرتے رہے مگر نہ پا سکے۔''

راہ گیر کو حارث کی باتیں اچھی لگیں، اس نے پوچھا۔ ''کہاں کا رہنے والا ہے اور تو کہاں سے یہاں آیا ہے؟''

حارث نے جواب دیا۔ ''میں جبلِ قاسیون سے تین چار فرسخ دور دمشق کا رہنے والا ہوں لیکن آبادیوں کے فسق و فجور، ریاکاری، مکاری اور بدکرداری سے پیچھا چھڑا کر یہاں چلا آیا اور اب میں کسی کی راہنمائی کے بغیر اسے پانا چاہتا ہوں جو انبیاء اور مرسلین کو انسانوں کی راہنمائی کے لیے اس دنیا میں بھیجتا رہا ہے۔''

راہ گیر نے اس پر افسوس کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تو گمراہی کے پہلے مرحلے میں ہے۔ تجھے اپنی منزلِ مقصود کے لیے کسی راہنما کو تلاش کرنا چاہیے۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تیری یہ بیماری تجھے قعرِ ہلاکت تک لے جائے گی۔''

حارث نے کہا۔ ''اے شخص! میں نے تجھ سے کچھ پوچھا تھا اور تو مجھے کوئی اور جواب دے رہا ہے۔ مجھے تو تو یہ بتا کہ کہف الدم کی چٹان پر سرخ سیاہی مائل نشان کس چیز کا ہے؟''

راہ گیر نے طنز کیا۔ ''تو یہ سوال اللہ سے کر اور وہ اس کا جواب کسی فرشتے کے ذریعے تجھ تک پہنچا دے گا۔ ایک عاجز اور نادان انسان تیری کیا راہنمائی کرے گا؟''

حارث نے کہا۔ ''میں اللہ سے جس قسم کی راہنمائی کا طالب ہوں، وہ فرشتوں ہی کے ذریعے الہام کی جا سکتی ہے اور میں تجھ سے جو سوال کر رہا ہوں، اس سے میرے سوا ایک زمانہ واقف ہے اور اس میں اللہ سے مدد چاہنا اور فرشتوں کو تکلیف دینا ایک فعلِ عبث ہے۔''

زائر نے جواب دیا۔ ''یہ خون ہابیل کا ہے جسے اس کے بھائی قابیل نے قتل کر دیا تھا۔ یہ دنیا کا پہلا انسانی خون تھا جو ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو قتل کر کے بہایا۔ یہ آدھی چٹان ہابیل کے خون سے داغدار ہو گئی ہے۔ یہ خون پہلے تو سرخ رہا ہوگا پھر امتدادِ زمانہ سے خون کی سرخی سیاہی میں بدلتی چلی گئی۔''

حارث پر ان باتوں کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ دیر تک خون کی گہری اور چپٹی چوڑی لکیر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور پھر جہاں یہ لکیر ختم ہو گئی تھی، وہاں بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے اللہ سے شکایت کرنے لگا۔ ''اے اللہ! میں تجھ سے مقاماتِ بلند کا طالب ہوں اور تو مجھے انسانوں کے حوالے کر رہا ہے۔ تیرے فرشتے کب حرکت میں آئیں گے کہ میری راہنمائی کریں؟''

زائر دور کھڑا چیخ رہا تھا۔ ''تو وہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ واپس آ جا کہ میں تجھ کو بقیہ وہ ساری باتیں بتاؤں جو تو نہیں جانتا۔''

حارث چپ چاپ اٹھا اور زائر کے پاس چلا گیا۔ زائر نے اس کی دلجوئی کی، اسے ایک پگڈنڈی کی طرف لے چلا اور کہا۔ ''یہی وہ پگڈنڈی ہے جس پر قابیل چل پھر کر اپنے بھائی ہابیل کو تلاش کر رہا تھا اور جب ہابیل پہاڑ پر نظر آ گیا تو قابیل نے اسے قتل کر دیا پھر یہی وہ پگڈنڈی ہے کہ جس پر چل کر اپنے بھائی کی لاش کو کاندھے پر لاد کر سامنے کے غار کہف الدم میں لے گیا تھا اور یہیں کہیں ایک کوے کی راہنمائی سے اپنے بھائی کی لاش کو دفن کر دیا تھا۔''

حارث کو زائر کی معلومات سے بڑا فائدہ پہنچ رہا تھا اور اس فائدے اور معلومات میں بڑی لذت تھی، بڑا مزہ تھا، بے حد لطف تھا۔ اس نے زائر سے درخواست کی۔ ''تو کچھ دیر میرے ساتھ رہ کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ تو یہاں کے چپے چپے سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہاں کی ہر ہر شے سے اس طرح آگاہ ہے گویا تو ساری عمر یہیں رہا ہے۔ اللہ تیرا بھلا کرے، یہ جو ایک کچھ نظر آ رہی ہے پگڈنڈی کے کنارے، تو اس کے بارے میں کیا جانتا ہے؟''

زائر نے جواب دیا۔ ''اس مسجد کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہاں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ایوبؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے نمازیں ادا کیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنابِ رسولِ مقبول ﷺ نے بھی یہاں نماز ادا کی تھی۔''

حارث کی حیرت اور معلومات میں غضب کا اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس نے دیکھا اس مسجد کے برابر سے سیڑھیاں اوپری چٹان کی طرف جارہی تھیں۔ اس نے زائر سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ اوپر چلے۔ زائر اس کے ساتھ ان سیڑھیوں کے ذریعے اوپری چٹان پر پہنچ گیا۔ یہ سنگی چٹان اتنی بڑی تھی کہ اس پر ایک شاندار مسجد کے علاوہ ایک آبادی بھی نظر آرہی تھی۔ اس مسجد میں زائر کے ساتھ حارث بھی داخل ہوگیا۔ یہ خاصی بڑی مسجد تھی۔ مسجد کے چاروں طرف لکڑی کی جالیاں تھی جس کے سوراخوں سے ہوا اندر کی فضا کو ٹھنڈا رکھے ہوئے تھی اور اسی جالی سے حجرے بنائے گئے تھے۔ ان حجروں میں دور دور سے آنے والے زائر قیام کرتے تھے۔

حارث نے پوچھا۔ ”یہاں آبادی سے دور پہاڑی چٹان کی اس مسجد میں ان حجروں کا کیا کام جبکہ پاس ہی ایک آبادی بھی موجود ہے؟“

زائر نے جواب دیا۔ ”دور سے آنے والے جو شخص اس مسجد کی زیارت کے لیے آتے ہیں، وہ مسجد کے انہی حجروں میں قیام کرتے ہیں۔ یہ نہایت مقدس اور محترم حجرے ہیں کیونکہ اللہ کے عظیم بندوں نے ان حجروں میں قیام کیا ہے۔“

حارث نے اب حجروں میں گھوم پھر کر ان بزرگوں کی خوشبو محسوس کی جو یہاں قیام کرچکے تھے۔ زائر نے ایک غار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس غار کے در کو جمعرات کے دن کھول دیا جاتا ہے اور روشنی کی جاتی ہے۔“

حارث نے یہاں کی ایک ایک چیز کو نہایت توجہ اور غور سے دیکھا۔ اسے ایک عجیب قسم کی فرحت اور تازگی محسوس ہورہی تھی۔ زائر اسے پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا۔ یہاں بھی ایک غار تھا۔ زائر نے حارث کو بتایا۔ ”یہ وہ غار ہے جہاں حضرت آدمؑ نے حواؑ کے ساتھ کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔“

حارث پر وجد کی کیفیت طاری تھی اور وہ یہاں پوری دنیا اور علائق دنیا کو بالکل فراموش کرچکا تھا۔ وہ خود کو حضرت آدمؑ اور حواؑ کے ساتھ کھڑا ہوا محسوس کررہا تھا۔ اس نے زیرلب کہا۔ ”اے اللہ! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ٹھیک اس جگہ کھڑا ہوں جہاں میرے برابر آدمؑ اگر موجود ہوتے تو کھڑے ہوتے۔ کیا تو مجھے یہ شرف نہیں بخش سکتا کہ جس صف میں آدمؑ اور دوسرے پیغمبر کھڑے ہوں، اسی صف میں کسی جگہ مجھے بھی کھڑا کردیا جائے۔“

زائر اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور اسے حارث کی باتوں پر اعتراض ہوا، کہا۔ ”یہ تو کیسی کفر کی باتیں کررہا ہے۔ کیا تو خود کو نبوت کے منصب پر فائز دیکھنا چاہتا ہے؟“

حارث نے جواب دیا۔ ”میں غیر معمولی انسان ہوں، کیا تو میری ذات میں وہ بڑا پن نہیں محسوس کررہا جو روز ازل اللہ نے میری ذات میں ودیعت کردیا تھا؟“

زائر نے کہا۔ ”میں نے تجھے جبلِ قاسیون کے اہم حصوں کی سیر کرادی، اب ایک نہایت اہم جگہ میں تجھے اور دکھانا چاہتا ہوں۔ آ، میرے ساتھ آ۔“

زائر، حارث کو لے کر نیچے اترا اور ایک نئے غار میں لے گیا، پوچھا۔ ”جانتا ہے اس غار کا کیا نام ہے؟“

حارث نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا۔ اس وقت تو، تو میرا معلم ہے، معلم بھی اور راہنما بھی۔“

زائر نے کہا۔ ”اس غار کو کہف الجوع کہتے ہیں۔ یہاں ستر نبی قحط سے اس لیے ہلاک ہوگئے تھے کہ ان کے پاس صرف ایک روٹی تھی اور وہ یہ روٹی ایک دوسرے کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔ کسی نے بھی دوسروں کا خیال کرتے ہوئے یہ روٹی نہیں کھائی اور وہ سب بھوک سے ہلاک ہوگئے۔“

حارث نے کہا۔ ”جب انہتر نبی بھوک سے ہلاک ہوچکے تھے تو آخری نبی کے لیے خدا نے یہ موقع فراہم کردیا تھا کہ وہ روٹی کھا کر خود کو مرنے سے بچالے۔“

زائر نے کہا۔ ”اس آخری نبی کو اس کی غیرت نے روٹی نہ کھانے پر مجبور کردیا تھا۔“

حارث نے یہاں کے چپے چپے پر انبیائے کرام کی خوشبو محسوس کی۔ وہ زور زور سے سانس لینے لگا۔ زائر اسے ایک اور نئی جگہ لے گیا۔ اب حارث کو تکان محسوس ہونے لگی تھی۔ اب وہ حارث کو جس پہاڑی کی طرف لے جارہا تھا، وہ شہر کے مغرب میں واقع تھی۔ یہاں پہاڑی سے پہلے باغات کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ باغوں میں لوگ خوشیاں منارہے تھے۔ یہ سنگی زائر بھی باغات کے اس پار پہاڑی کی طرف جارہے تھے۔ زائر حارث کو ایک پہاڑی پر لے گیا۔

حارث نے بے چینی سے پوچھا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے۔ میں اسے پاس سے دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہوں، مجھے اس میں کچھ

بی کشش محسوس ہو رہی ہے۔"

زائرا اسے پہاڑی پر لے گیا اور بتایا۔ "اس جگہ کو ربوہ کہتے ہیں۔ اس کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔ حضرت مسیح اور ان کی والدہ مریم یہیں رہتے تھے اور یہ بہت ہی دلکش جگہ ہے۔"

اس کے بعد زائرا اسے ایک بلند محل کی طرف لے گیا جس کی بے شمار سیڑھیاں بہت بلندی تک چلی گئی تھیں۔ زائر نے بتایا۔ "حضرت مریم یہاں رہا کرتی تھیں، یہ بھی بڑی ایمان افروز جگہ ہے۔"

حضرت مریم کا حجرہ قدرے چھوٹا تھا۔ اس کے سامنے ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ زائر نے بطور خاص اس مسجد کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مسجد حضرت خضر کی ہے۔ وہ اس مسجد میں بطور خاص نماز ادا کرتے تھے جہاں چھوٹے چھوٹے آہنی کواڑ لگا دیے گئے ہیں۔ مسجد اور اس کا حوض ہر وقت پانی سے بھرا رہتا ہے۔ مسجد کی دیوار میں پن چکی لگی ہوئی ہے۔ پانی اس پر سے بہہ کر نیچے چلا جاتا ہے۔" زائرا اسے سب کچھ بتاتا رہا اور آخر میں پوچھا۔ "تو مجھے جانتا ہے؟"

حارث نے جواب دیا۔ "بس میں یہ جانتا ہوں کہ تو زائر ہے، یہاں کے چپے چپے سے واقف ہے اور اتنا علم رکھتا ہے کہ کسی راہنما کی ضرورت تیری موجودگی میں باقی نہیں رہتی۔"

زائر نے کہا۔ "عصر کا وقت ہو چکا ہے، آ، اور حضرت خضر والی مسجد میں عصر کی نماز ادا کر لیں۔"

جب یہ دونوں حضرت خضر کی مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ زائر کو دیکھ کر سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ اس شخص نے امامت کی، سب نے اس کے پیچھے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد زائر نے ایک چھوٹی سی تقریر کی اور بتایا۔ "لوگو! گمراہی سے بچو، تمہارے دماغوں میں کبر و نخوت بھری ہوئی ہے۔ اپنی ذات سے اور اپنے وجود سے اسے نکال باہر کرو، کام کے آدمی بن جاؤ گے ورنہ تمہاری گمراہی تمہارے اور تمہارے ماننے والوں کو عذاب میں گرفتار کر دے گی۔"

زائر نے حارث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے دیکھو، اسے زعم ہے کہ یہ اس دور کا بہت بڑا آدمی ہے۔ عالم، فاضل، زاہد، متقی، دیانت دار، ایماندار...... اور یہ اپنی اوصاف کے بدلے ایک ایسا منصب حاصل کرنا چاہتا ہے جو نبوت کے مساوی ہو۔"

حارث نے زائر کو ٹوکا۔ "شاید تو مجھے نہیں جانتا۔ اگر تو میرے بارے میں جاننا چاہتا ہے تو دمشق میں میرے آقا ابو جلاس کے پاس جا اور اس سے میرے بارے میں پوچھ۔ میری دیانت داری، میرا تقویٰ، میری پرہیزگاری، میرا زہد اور میری ایمانداری ضرب المثل ہے۔"

زائر نے کہا۔ "تو اپنی جن باتوں پر نازاں ہے، ان میں علوم کا کوئی ذکر نہیں۔ تو وہ سب نہیں جانتا جو ایک عام آدمی جانتا ہے۔ میں نے تجھے جبل قاسیون کی سیر کرائی اور یہاں کی ایک ایک متبرک جگہ کی زیارت کرائی۔ کیا تو ان سب سے واقف تھا؟"

حارث نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں ان چیزوں سے واقف نہیں تھا اور ان کا جاننا میرے لیے ضروری بھی نہیں تھا۔ مجھے اپنے اللہ پر ناز ہے۔ وہ اپنے فرشتوں کے ذریعے مجھے جو کچھ بتائے گا، وہ میرے لیے بہت کافی ہوگا مگر ایک انسان کی معلومات میرے لیے قابل فخر نہیں ہو سکتیں۔"

زائر کو حارث پر افسوس ہو رہا تھا۔ "افسوس کہ تو نے خود کو تباہ کر لیا۔ میں تیرے پاس اس لیے آیا تھا کہ تجھے تباہی سے بچاؤں مگر تیری قسمت۔ تو جس چیز کی خواہش کر رہا ہے، وہ تجھے مل جائے گی۔"

وہاں جو زائرین موجود تھے اور ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے، وہ ان سے واقف نہیں تھے۔ ان میں سے ایک نے زائر سے پوچھا۔ "یہ شخص کیا کہتا ہے؟"

زائر نے جواب دیا۔ "یہ کسی ایسے فرشتے کا منتظر ہے جو اللہ اور اس کے درمیان رابطے کا فریضہ انجام دے۔"

(جاری ہے)

مضمون کے مآخذ

تاریخ طبری، امام طبری۔ تاریخ ابن خلدون، علامہ ابن خلدون۔ المہ تلبیس ابو القاسم رفیق دلاوری۔
الفرقان بین اولیا الرحمان و اولیا الشیطان، شیخ ابن تیمیہ

تریاق

فرح بخاری

دوسرا حصہ

معاشرہ جب اخلاقی انحطاط و دیگر برائیوں کا شکار ہوجائے تو تباہی یقینی ہے... ایسے میں فرد واحد بھی اس کے سدھار میں اپنا کردار ادا کرسکتا ہے... اور پھر اسی طرح قافلہ بنتا جاتا ہے... اس نوجوان میں بھی کچھ کر گزرنے کا حوصلہ تھا... اس کے ارادے مضبوط اور عزم چٹانی تھا... الجھی گتھیوں کو سلجھانا اس کا پیشہ تھا... مگر خود اس کی زندگی کے کچھ باب الجھے ہوئے تھے جنہیں سلجھانے کے لیے ہی وہ کمر کس کر اور سینہ تان کر میدان میں اترا تھا اور اسے ہر حال میں منزل پر کامیابی سے پہنچنا تھا۔

الجھے معمے سلجھانے والے ایک پُرعزم نوجوان کی داستان

کالج، یونیورسٹی کے طلبا و طالبات میں نشے کو فروغ دینے والے انٹرپاک ریکٹ کے ایکسپوز ہونے پر اسجد علی کا بہت بڑا ٹھہرا تھا۔ اگلے چند دن چھوٹی موٹی مزید کچھ باتیں اور فائل ورک مکمل کرنے میں لگ گئے۔ اس دوران کچھ باتیں تھیں جو اسجد کے دماغ کو لگاتار الجھا رہی تھیں اور جانے سے محض ایک دن پہلے بالآخر ایک نتیجے پر پہنچتے ہوئے اس نے خرم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"مجھے اب واپس جانا ہے، ایک اور کام آن پڑا ہے۔"

"اوہ......بس......!" خرم کے لیے یہ غیر متوقع تھا۔ دل بن کر دکھی ہوا کہ اتنی جلدی اسجد واپس بھی جا رہا تھا۔ بس اتنے مختصر وقت کی دوستی۔

"ہاں، لیکن جلد واپس آؤں گا۔" اس نے مسکرا کر اضافہ کیا تو خرم نے چونک کر دیکھا۔

"واؤ......گڈ......! پر کیسے؟"

"ایک اور مشن ملا ہے، وہ بھی یہیں قریب کا ہے۔"

"یار! تو واپس کیوں لے جا رہے ہو؟"

"میری والدہ وہاں اکیلی ہیں۔ سوچتا ہوں انہیں بھی یہیں لے آؤں۔"

"ہاں، اچھا خیال ہے۔ روز روز کا آنا جانا مشکل کام ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے۔ اچھا خیر، تم سے ایک اور بات ڈسکس کرنا تھی۔ ان فیکٹ مشورہ طلب کرنا تھا۔"

"ہاں، شیور!"

"میں نے جب اس منشیات والے مشن کی فائل چیک کی تھی، تب بہت سوچنے پر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ چھوٹی مچھلیوں پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بیک گراؤنڈ پر کام پھر بھی چلتا رہتا ہے اور چھوٹے موٹے مجرم گرفتار کر کے ایک فارمیلٹی پوری کر دی جاتی ہے اور فائل بند۔"

"بالکل، مجھے یاد ہے۔ ہماری یہی بات ہوئی تھی، ہمارا مقصد ماخذ تک پہنچنا تھا۔"

"اس سوچ کے تحت چلنے پر ہمیں ہمارا مقصد بھی

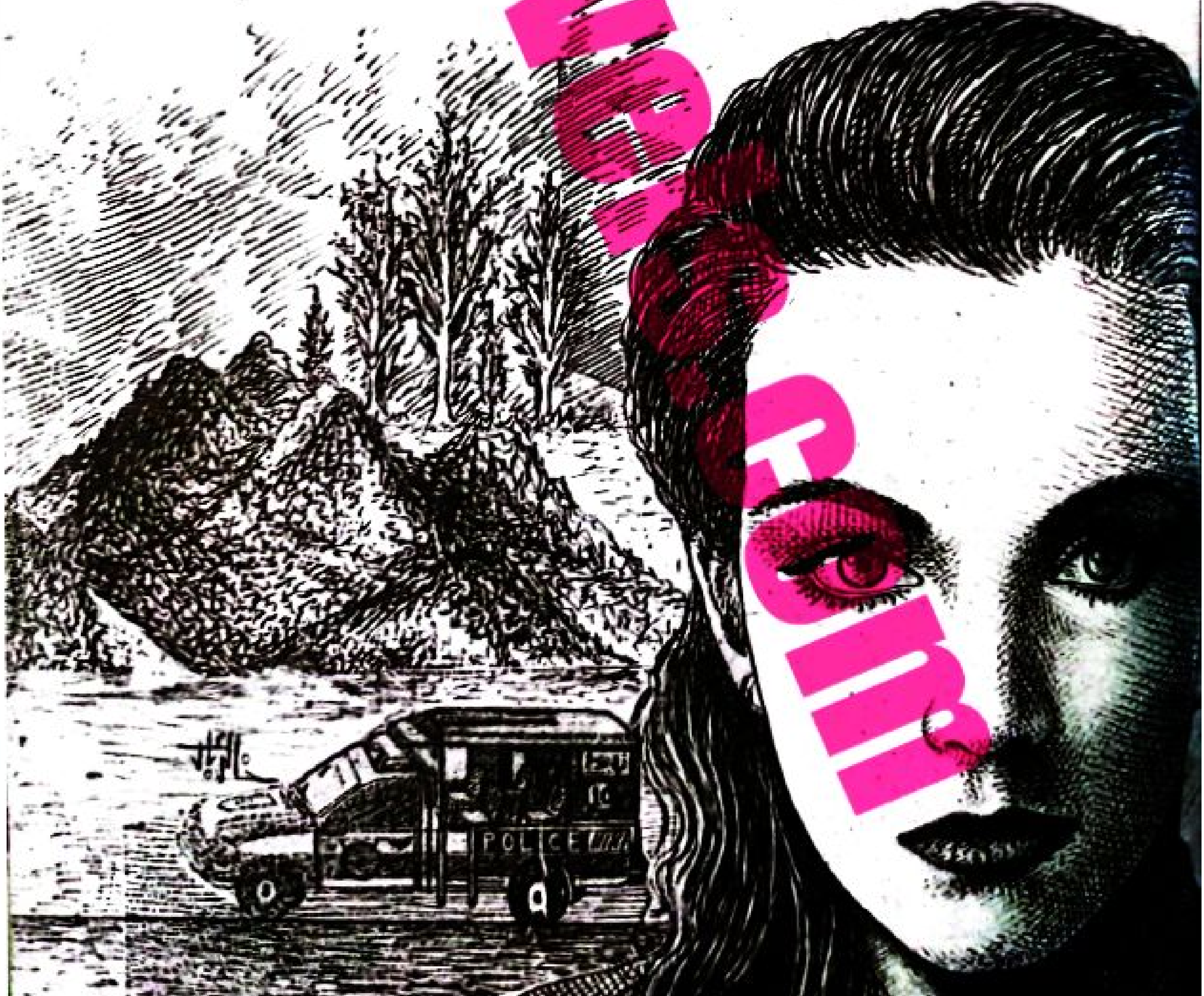

حاصل ہو گیا اور توقع سے زیادہ جلدی کیونکہ ہم نے درمیان میں آنے والے چھوٹے موٹے مجرم یکسر اگنور کیے اور اپنا فوکس نہ دکھائی دینے والے ہاتھوں پر رکھا۔"

"بالکل۔ اس طرح واقعی ان تک پہنچنا آسان ہو گیا تھا۔"

"لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ منشیات فروشی کا یہ دھندا تو بہت دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کوئی ایک ریکٹ، ایک گینگ تو نہیں جو ایسے مذموم عزائم پورے کرنے میں لگا ہے۔"

"ہاں، بالکل۔ یہ تو ہے۔"

"تو جن چھوٹے مجرموں کو ہم نے چھوڑ دیا، ان میں سے کئی ہیں جنہیں اس نشے کی لت پڑ چکی تھی، کئی ایسے ہیں جنہوں نے اسے کمائی کا ذریعہ بنالیا تھا۔ تو سوچو کہ کسی ایک ریکٹ کے پکڑے جانے پر وہ تو باز نہیں آجائیں گے۔ وہ کسی اور ذریعے سے اپنا کام چلاتے رہیں گے۔ پھر تو کالج، اسکولز، یونیورسٹیز اس عذاب کا شکار ہی رہیں گے۔"

"ہوں...... بات تو تمہاری ٹھیک ہے اسجد! لیکن اس کا کیا کر سکتے ہیں؟"

"یہی بتانے آیا ہوں۔" اسجد نے گلا کھنکھارا۔ "میں اپنی معیت میں ان سب مجرموں پر کیس درج کرنا چاہتا ہوں جو ان اداروں میں موجود ہیں۔ کچھ اسٹوڈنٹس ہیں، کچھ نچلا عملہ، جس پر تم نے کام کرنا ہوگا۔ یعنی وہ ایک پولیس کیس ہوگا۔"

"او کے۔" خرم نے سمجھ کر سر ہلایا۔

"میرا کالج اور ایک لیڈیز ہاسٹل کی شکایت تو مع ثبوتوں کے موجود ہے میرے پاس۔ کالج میں کینٹین والا اور چند ایک لڑکے جن کے متعلق کسی سے معلوم ہوا تھا۔ اس کی ساری تفصیل میں شکایت کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔"

"او کے۔ ابھی لکھ لیتے ہیں۔" خرم نے پین سنبھالا۔

"میری کوئی مدد درکار ہوتو میں خود بھی کچھ دنوں تک واپس آرہا ہوں۔ میرا مقصد بس اتنا ہے کہ جو بچے بھی اس میں ملوث ہیں، نہ صرف ان کی آنکھیں کھلیں بلکہ ان کے گھر والوں کو بھی معلوم ہونا چاہیے ان کی ایسی سرگرمیوں کے متعلق۔"

"صحیح کہہ رہے ہو۔ یہ سلسلہ اب رکنا چاہیے اور ظاہر ہے کہ کم ہوتے ہوتے ہی ایک دن رکے گا...... نکلنا کب ہے؟" خرم کو کچھ خیال آیا۔

"کل صبح۔ ان شاء اللہ۔"

"او کے۔ تو آج کی شام ہمیں دے دو...... اگر تمہیں اور مصروف نہیں ہونا تو۔"

"اور کہاں مصروف ہونا ہے۔ تمہارے شہر میں سوائے تمہارے میرا کون ہے۔" اس نے جملہ تو اچانک پھینکا پر ایک آہ بھی بے اختیار منہ سے نکل گئی۔ خرم نے چونک کر دیکھا لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسجد اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

اسجد نے کالج کے پرنسپل سے ان کی رہائش گاہ پر ایک تفصیلی ملاقات کی۔ مشن شروع ہونے پر دونوں نے جان بوجھ کر کسی قسم کا رابطہ نہ کیا تھا لیکن اب مشن کی کامیابی کے بعد پرنسپل صاحب نے اسے خود دعوت دی تھی۔ اسجد نے جو باتیں خرم سے ڈسکس کیں، وہی پرنسپل صاحب سے بھی کہیں اور انہوں نے بھی تائید کی۔ کالج کے بچوں کو وارننگ دیے بنا فائدہ نہیں تھا۔ لڑکیوں کے نام البتہ اسے کاشف سے معلوم ہوئے تھے۔

اسجد کے پاس چار نام لکھے ہوئے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ سرمئی آنکھوں والی صباحت، ماریہ، نورینہ یا گل افشاں میں سے کون سی تھی، لیکن اسے اب کیا کرنا تھا جان کر۔ بس وہ چاروں نام رپورٹ میں لکھوا دیے، کیونکہ سارے ہاسٹل کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ وہاں کئی اور لوگ بھی مقیم تھے۔

خرم نے پہلے کالج کے قریب بارہ لڑکوں کو ریڈ پڑوا کر تھانے طلب کیا، ان کے والدین کو بلایا گیا۔ کینٹین والا سراج بھی ملوث نکلا تھا۔ کچھ بچوں کو وارن کیا گیا، کچھ کو بے دخل کیے بنا چارہ نہیں تھا۔ لیڈیز ہاسٹل کے مالک خلیق الرحمن اور بیوی عائشہ کو طلب کیا گیا۔ ان کے پاس بھی شکایات تھیں لیکن ہاسٹل کی ریپوٹیشن پر نام نہ آئے، اس لیے خود بھی شکایات کو دبائے ہوئے تھے لیکن اب چونکہ معاملہ ہی اوپن ہو گیا تھا لہٰذا انہیں بھی تعاون کرنا پڑ گیا۔ عائشہ میڈم نے اپنی طرف سے بھی تحقیقات کیں اور معلوم ہوا کہ یہی چار لڑکیاں ملوث تھیں۔ تبھی انہیں ہاسٹل سے نکال دیا گیا۔ وہ بھی حوالات میں تھیں۔ اسجد بھاری دل لیے اسلام آباد روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

"ماشاء اللہ! بہت مبارک ہو۔" ماں نے پیار سے ماتھا چوما۔ اسجد اپنے مشن سے کامیاب لوٹا تھا۔

"سب آپ کی دعائیں ہیں اماں!" اس نے ماں کو ایک جذب سے اپنے گلے لگایا۔ کتنے دن ان کے نرم لمس سے دوری میں گزارے تھے۔ کچھ جذباتی لمحوں میں ان کی

کی بھی بہت شدت سے محسوس کی تھی۔

''کیا بتا رہے تھے، دوبارہ جانا ہے۔ اب یہ کیا بات ہے؟'' وہ خفا خفا سی اندر آگئیں۔

''جی بالکل، لیکن اس بار اپنی ماں کو ساتھ لے جاؤں گا۔''

''ساتھ...... کہاں؟'' وہ منہ کھولے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں جس پر وہ ہنس دیا۔

''خود ہی پوچھا کرتی تھیں، کیا میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی...... تو دیکھ لیں، اسی کا بندوبست کر آیا ہوں۔''

''بتا بھی دو...... کیسا بندوبست؟''

''پہلے آپ ٹائم دیکھیں۔'' اس نے ابرو وال کلاک کی جانب اٹھائی تو روشن آرا تبھی سے اس کی آنکھوں کے تعاقب میں دیکھنے لگیں۔

''ڈیڑھ بجا ہے...... کیوں، کیا ہوا؟'' وہ اسے سادگی سے ٹائم بتانے لگیں۔ اسجد نے ہنس کر ہتھیلی ماتھے پر ماری۔

''بھوکا ہوں میری ماں! پہلے کھانا کھلائیں تاکہ باقی کی تفصیل بتانے کے قابل ہو سکوں۔''

''اوہ ہاں۔'' روشن آرا کا بند دماغ تو آدھے راستے میں کھل گیا۔ جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ اسجد بھوک کے معاملے میں بڑا ہی بے صبرا تھا۔ وقت پر کھانا نہ ملنے پر اس کا مزاج بری طرح چڑچڑا ہو جاتا تھا اور اس کا بھی کیا قصور تھا۔ یہ عادت تو اس نے اپنے باپ سے لی تھی۔

کھانا نکالنے کے دوران روشن آرا مسکرا رہی تھیں۔ کبھی کبھار پرانے دن بھی کیسے ایک ویڈیو کی طرح سامنے کھل جاتے تھے۔ روشن آرا کو شادی کے شروع میں ہی ایک بات تو اچھی طرح سمجھ آگئی تھی کہ اس گھر میں کھانے کے ذائقے کی اتنی اہمیت نہ تھی جتنا کہ وقت کی تھی۔ اس کے میاں کو کھانے سے بس اس حد تک دلچسپی تھی کہ وہ مقررہ وقت پر مل جائے اور اگر کبھی بھولے بھٹکے دیر ہو جاتی تو اف اللہ...... وہ ہنستے ہوئے کھانے کی ٹرے اسجد کے سامنے رکھ رہی تھیں۔

''تمہارے بابا نے ایک دن گرم کھانے کی ٹرے صرف اس لیے دھکا دے کر دور گرا دی تھی کہ وہ کھانا ان تک اتنا لیٹ کیوں پہنچا۔''

''میں اس بات کا مطلب آسانی سے سمجھ سکتا ہوں۔'' اس نے ماں کی بات سنتے ہوئے ہنس کر فوراً گرم روٹی نکالی۔ ''میرا اپنا بھی حال ہوتا ہے۔ بھوک لگی ہو تو ''دیر'' مجھے توڑ پھوڑ پر مجبور کرنے لگتی ہے۔''

''مجھے نہ بتاؤ۔'' روشن آرا نے ہنس کر اس کے سر پر چپت لگائی۔ ''بڑے مظاہرے دیکھ چکی ہوں بچپن میں۔''

''مانتی ہیں نا۔ پر اب سدھر گیا ہوں۔''

''پردیس سدھار دیتا ہے بیٹا! یہ توڑ پھوڑ کے چونچلے ماں کے سامنے تو چلتے ہیں، کوئی اور کہاں سہتا ہے۔'' وہ کھانا دے کر خود بھی اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

''اچھا بتاؤ، کیا کہہ رہے تھے، اب تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''ایک اور کام ملا ہے، وہ بھی وہیں پشاور کے نزدیک کا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس میں وقت زیادہ لگ سکتا ہے۔ پھر ابھی ابھی جس مشن سے لوٹا ہوں، اس میں بھی مجھے دوبارہ بلایا جا سکتا ہے۔ آپ جانتی ہیں، آپ کی وجہ سے پریشان رہتا ہوں۔ پھر ہم دونوں کا ایک دوسرے کے سوا ہے ہی کون۔ بہتر ہے جہاں بھی ہوں، ساتھ ہوں۔'' وہ ساتھ ساتھ بڑی رغبت سے کھانا بھی کھا رہا تھا۔

''ہاں...... لیکن......!'' وہ کچھ سوچ کر ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

''کیا بات ہے، پریشان کیوں لگ رہی ہیں؟'' اسجد کا ہاتھ کھانے سے رک گیا۔ وہ پریشانی سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ روشن آرا نے ایک نظر تعجب سے اسجد کو دیکھا پھر اس کے سر پہ چپت لگائی۔

''بچے ہو آج بھی۔ اتنا کیوں پریشان ہو گئے؟ ارے بدھو! میں تو اس سوچ میں پڑ گئی تھی کہ اب تمہاری دلہن کہاں سے ڈھونڈوں گی؟ یہاں کئی جاننے والوں کے ذمے لگا چکی تھی۔ اس کا کیا ہوگا؟''

''اف اللہ!'' وہ مصنوعی انداز میں گھورتا پھر کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔ ''مجھے بچہ کہہ رہی ہیں۔ خود بھی بچوں سے کیا کم ہیں۔ اب یہ بھی کوئی ٹینشن لینے والی بات ہے۔ جتنی وہ جہاں بھی ہے، جیسی ہے، خود بخود سامنے آ جائے گی۔''

''اچھا خیر، اب گھر بیٹھے بھی نہیں مل جایا کرتی۔'' انہوں نے بھی خفگی سے ہاتھ لہرایا۔

''اچھا ویسے کیسی دلہن ذمے لگا رکھی تھی، وہ بھی بتا میری پسند جانے؟''

''ہوں......!'' روشن آرا نے گھورا۔ ''تم میری پسند سے علیحدہ چلو گے؟''

''ہو بھی سکتا ہے۔'' اس نے کندھے اچکا کر بات کو طول دیا۔ مقصد ماں کو چھیڑنا تھا اور وہ تو ایسی سادہ مزاج عورت تھیں، ہنسی مذاق تو ان کے سر سے گزر جاتا تھا۔ دیر تک نصیحت کیے گئیں۔ وہ بھی مسکرا کر سنتا رہا۔ اتنی پیار بھری

جھڑکیوں کے لیے تو ترس رہا تھا۔

☆☆☆

خلیل احمد ایک پرائیویٹ اسپتال میں دواؤں اور دیگر میڈیکل کے سامان کا نگران اور سپلائر تھا۔ اچھا خاصا کما لیتا تھا لیکن اس پر بھی زیادہ راضی نہ تھا۔ اپنی اس لالچی طبیعت کے باعث رقم کا گھپلا کرتے پکڑا گیا۔ کرپشن ثابت ہونے پر اسپتال کی انتظامیہ نے ہی اس پر کیس کردیا۔ خلیل احمد نے کیس سے نکلنے کے لیے ایک وکیل ہائر کیا لیکن یہ اقدام پچھلے سے زیادہ مہنگا ثابت ہوا۔ وکیل نے چابکدستی دکھاتے ہوئے کرپشن کی فائل ہی غائب کردی تاکہ اپنے کلائنٹ کی کرپشن کے نشان مٹادیے جائیں لیکن اسپتال کا اونر شمال خان بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا اور اس مرتبہ اس نے بجائے اس شاطر وکیل پر سامنے سے وار کرنے کے، ایک دوست کے مشورے پر سراغ رساں کو ہائر کیا تاکہ وکیل کے شکنجے سے وہ چوری شدہ فائل کسی طرح نکلوائی جاسکے۔ شمال خان کو اس کے اسی ریٹائرڈ ایس پی دوست احمد علی نے امجد کا نام تجویز کیا۔ امجد کے ماموں اور احمد علی طویل عرصہ ساتھ کام کرچکے تھے۔ احمد علی بہت قریب سے جانتا تھا کہ امجد نے کس طرح اپنے ذاتی شوق اور ذہانت کے بل پر اس فیلڈ میں اپنا ایک بھروسے مند نام بنایا تھا اور اب شمال خان نے فائل چوری کے کیس کے لیے امجد کو ہائر کرلیا تھا۔ امجد اپنے اگلے مشن پر لوئر دیر وکیل جبار احمد کے پیچھے اس چوری شدہ فائل کی کھوج پر نکل رہا تھا۔

☆☆☆

”پلیز، پاپا! منع مت کریں۔ آپ ہی بتائیں، اب اتنی لمبی سمر بریک ملی ہے۔ گھر پر بور نہیں ہوجاؤں گی۔ آپ کے تو کورٹ کے کام ہی ختم نہیں ہوتے۔“

”ارے بیٹا! تو پھوپو کے ہاں چلی جاؤ یا پھر توقیر انکل کے گھر اسلام آباد ہو آؤ۔“

”نو...... ویری بورنگ۔“ اس نے منہ بسورا تو جبار احمد مسکرا کر بیٹی کے نزدیک آیا۔

”اچھا اگر میرے رشتے دار بورنگ ہیں تو اپنی ماں کے رشتے داروں کی طرف چلی جاؤ۔“

”تو وہ بھی کیوں نہیں؟“ نورینہ کا منہ بگڑا ہوا ہی تھا۔

”بالکل نہیں۔“ جبار احمد نے ایک مرتبہ پھر رد کیا۔

”مجھے نہیں پتا اس میں کون کون لوگ شامل ہیں، کہاں جانا ہے، کیا کرنا ہے؟ تم یا تو کزنز کو یہاں بلالو، ورنہ انہی کے پاس جانے کا پروگرام بنالو۔“

”اوکے پاپا!“ اس کا موڈ ہنوز آف تھا لیکن بالآخر باپ کی بات مان ہی لی۔

”یس، گڈ گرل! اوکے۔ میں پھر چلتا ہوں۔ تمہارے پاس پورا دن ہے۔ کچھ اچھا سا پلان کرو۔ شام کو بتا دینا مجھے۔“

”ہوں۔“ نورینہ نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

”کچھ سوچتی ہوں۔“

”بائے بیٹا!“ جبار ہاتھ ہلا کر باہر نکل گیا۔ نورینہ ہتھیلی پر موبائل جھٹکتے کسی سوچ میں پڑ گئی۔

پشاور میں ہوئے واقعے کی اطلاع اس کے گھر بھی بھجوائی گئی تھی۔ اس کے پاپا اور صباحت کے انکل کی کوششوں سے ان سب کو اگلے روز ہی ضمانت مل گئی تھی۔ ایک رات البتہ حوالات کی ہوا بھی کھانا پڑی جو کہ نورینہ کی زندگی کی بدترین رات تھی۔ ہاسٹل والی میڈم تو ان سب کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ اس کے بابا نے اپنے ایک دوست کے ہاں یہ کہہ کر چند دن کے لیے اسے چھوڑا کہ ہاسٹل میں پڑھائی اچھی طرح نہیں ہو پارہی۔ طفیل انکل کو اس پر ہوئے کیس کا علم بھی نہیں تھا۔ تبھی وہ پندرہ سولہ دن وہاں ٹک پائی۔ جیسے تیسے پیپرز دیے تھے اور پھر بڑا ہی بوجھل بھاری دل لیے وہ سب ایک دوسرے سے ایسے علیحدہ ہوئیں کہ شاید سب کے پیرنٹس نے ان کو باقیوں سے ملنے سے منع کردیا تھا۔

گھر آکر نورینہ بھی باپ کی طرف سے سخت رویے کی توقع کررہی تھی لیکن بابا نے بس چند ایک نصیحتیں کیں اور آئندہ ایسی بری صحبت سے بچنے کی تنبیہ کرتے ہوئے اسے گھر بٹھادیا۔ اگلا سمسٹر آخری تھا۔ جبار نے سوچا، تب کی تب دیکھی جائے گی کہ نورینہ کو کہاں رکھنا ہے اور ایسی بری سہیلیوں سے کیسے بچانا ہے۔

اس نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اب کی صورت حال پر توجہ دی۔ تین ماہ کا طویل وقت کسی ایسی اچھی مصروفیت میں گزارنا تھا کہ چند دن پرانی تلخ یادوں سے بھی کسی طرح نجات حاصل ہوسکتی۔ ردا و فاریہ اس کی ماموں زاد تھیں۔ ٹیکسلا میں رہتی تھیں۔ نورینہ کا انہیں ٹیکسلا سے بلوانے کو من نہیں ہورہا تھا۔ اسے تو اس سمر بریک میں بس اپنی مرضی کا کچھ کرنا تھا۔

اسلام آباد سے ایک پرائیویٹ ٹرپ گلگت اور قراقرم تک جارہا تھا اور نورینہ کو تو بس گھومنا تھا۔ کھلی وسیع وعریض فضاؤں کو گھنٹوں تکتے جانا تھا۔ اگرچہ وہ لوئر دیر میں رہتی تھی

جو بذاتِ خود وسیع و عریض بھی تھا، سرسبز بھی، ٹھنڈا بھی لیکن ان نظاروں سے وہ اوب چکی تھی۔ اسے اور آگے جانا تھا۔ اسے گھنے جنگلات، زیادہ اونچے پہاڑوں، مزید شور مچاتے پانیوں کی طرف سفر کرنا تھا۔ اس کا جی چاہتا وہ فیری میڈو دیکھے، کیمپنگ کے مزے لے اور ایک دن ہمالیہ سر کرلے۔ مگر...... اس نے کندھے گراتے ہوئے ذہنی حقیقت کو ماتھا سکوڑ کر دیکھا۔ بابا نے کہیں بھی جانے سے صاف منع کر دیا تھا اور وجہ بھی ظاہر ہے وہی حال میں گزرا واقعہ بنا تھا۔ بابا کسی قسم کا کوئی رسک ہرگز نہیں لینا چاہتے تھے۔

سر کھجاتے ہوئے اس نے موبائل اٹھایا۔ اسے گزشتہ کی ہنگامہ خیزی تو کسی قیمت پر چاہیے ہی نہیں تھی۔ بابا کو کال کر کے بازار جانے کا بتایا اور نجیب کاکا کے ساتھ بازار آگئی اور اپنی مرضی کا سامان خرید لائی۔ کلاک کی طرف دیکھا تو بارہ بج گئے تھے۔ اس نے سامان مخمل پر رکھا اور کچن میں گھس گئی۔ بابا کے آنے سے پہلے کھانا تیار کرنا تھا۔ پینٹنگ کا سامان جس کی خاطر وہ بازار گئی تھی، الگ یہی رہا تھا کہ اب اگلے روز ہی پُرسکون ماحول میں وہ اس پر کام شروع کر سکتی تھی۔ پینٹنگ اس کا ایک دیرینہ شوق تھا جس پر باقاعدہ طبع آزمائی کا اسے کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی فیصلہ کیا کہ کسی کو بھی انوائٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بس اکیلے میں اچھا وقت گزارنا ہے۔ اب کام کاج کے بعد اسے پینٹنگ کے لیے نیٹ سے کچھ آئیڈیاز لینے تھے اور پھر اگلی صبح سے کچھ نیا شروع کرنا تھا۔ فی الحال اس کے لیے یہ سوچنا بڑا دل گدگدانے والا احساس تھا کہ وہ رنگوں سے کھیلنا شروع کر رہی ہے۔

☆☆☆

"امی کے بعد پہلی مرتبہ ایسا کابلی پلاؤ کھایا ہے۔ واللہ!" وہ سچ مچ ہی انگلیاں چاٹ رہا تھا۔ امجد اس کے بھدے پن کو نوٹس کر دیکھ رہا تھا۔

"اب اگر میں یہ کہوں آنٹی کہ ایسی کھیر صرف میری امی بناتی تھیں تو آپ سمجھیں گی میں مسکا لگا رہا ہوں۔" خرم اب کھیر سے انصاف کر رہا تھا۔

امجد اسے اپنے گھر لایا تھا۔ ابھی تین روز پہلے ہی وہ اور اس کی امی پشاور آئے تھے۔ خرم کی مدد سے اس نے خوب دیکھ بھال کر ایک اچھا مکان کرائے پر لیا تھا۔ سامان وغیرہ وہ اسلام آباد والے مکان سے لوڈ کروا لائے تھے۔ دو دن گھر کی سیٹنگ اور صفائی وغیرہ میں لگ گئے۔ امجد نے اپنی امی کی دیکھ بھال کے لیے اپنے ایک پرانے خادم چاچا رفیق اور اس کی بیوی کو گاؤں سے بلوا لیا تھا۔ ان کی آمد سے ماں کی حفاظت کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا کیونکہ وہ ہر لحاظ سے نہایت بھروسے مند تھے۔ تیسرے روز امجد نے رات کے کھانے پر خرم کو اپنے گھر بلایا۔ روشن آرا نے صفیہ کی مدد سے خود کوکنگ کی تھی۔

"مسکا نہیں سمجھوں گی لیکن اگر کھیر کے بعد میرے ہاتھ کی چائے نے بھی تمہیں اپنی امی کی یاد دلائی تو آئندہ مجھے آنٹی کے بجائے "امی" کہنا پڑے گا۔"

"فوراً سے پہلے "امی" مان لو، کیونکہ امی کو یہاں لایا ہی تمہارے بھروسے ہوں۔" امجد نے اپنی ٹانگ اڑائی جس پر خرم سے پہلے اس کی امی نے رد عمل دیا اور بیٹے کی پیٹھ پر حسبِ عادت ایک دھپ لگا دی۔

"ابھی کہے گا کل صبح نکل رہا ہوں، ضروری کام ہے۔"

"ضروری کام اور چیز ہوتا ہے میری ماں! میری تو جاب ہے نکلنے کی، باہر رہنے کی۔ کل صبح ہی جا رہا ہوں۔ نیا کام ملنا بھی نعمت ہوتا ہے۔"

"کہاں جا رہے ہو امجد؟" خرم کو ابھی تک اس سے بات چیت کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

"زیادہ دور تو نہیں۔ یہیں فی الحال تو لوئر دیر جانا ہے لیکن پھر چار گھنٹے کا سفر ہے۔ روزانہ گھر آنا تو پھر بھی ممکن نہیں۔"

"اس مرتبہ اپنی کار پر جاؤ۔ اب کیا پبلک ٹرانسپورٹ کے دھکے کھاؤ گے۔" روشن آرا نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"لیکن پھر آپ کیا کریں گی؟ گھر میں بھی تو سو طرح کے کام ہوتے ہیں۔"

"اب کوئی زیادہ مسئلہ نہیں ہے۔ وہاں کھوٹہ میں بازار دور تھا، یہاں تو رفیق بتا رہا تھا یہیں پاس ہی ایک مال ہے۔ گروسری بھی سب مل جاتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آنٹی! ہلکی پھلکی واک بھی ہو جائے گی اور ویسے بھی میں ہوں نا، آپ جب چاہے مجھے بتا دیا کریں۔"

"ہاں۔ صحیح کہہ رہا ہے۔" روشن آرا بیگم نے بھی تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ ان دونوں کے لیے چائے بنانے اٹھ گئیں اور وہ ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتوں میں لگ گئے۔

☆☆☆

"کیا اطلاع ہے؟" ضمیر جان نے اپنی آنکھیں سامنے بیٹھے دلبر خان پر جما رکھی تھیں۔

"جی خان! بات یہ پتا چلی ہے کہ جبار احمد صبح نو بجے ڈیوٹی پر جاتا ہے، تین بجے واپس آتا ہے۔ اس کا ایک لڑکی

ہے۔ گھر پر کوئی نہیں ہوتا۔ ایک بوڑھا نوکر ہے۔ وہی ڈرائیور بھی ہے اور چوکیدار بھی۔ باہر کے کام کاج بس وہی کرتا ہے۔ لڑکی اندر اکیلی ہوتی ہے۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھتی بھی ہے۔ پشاور جاتی ہے لیکن ابھی آج کل ادھر گھر پر ہی ہے۔ اس کا پڑھائی کی چھٹیاں ہیں، تین مہینے کا۔"

"ہوں...... بیوی نہیں ہے...... اور کوئی لڑکا؟"

"نہ خان! بس یہی ہے۔"

"ہوں...... تو مطلب...... یا تو جبار مرے گا...... یا پھر لڑکی کی جان مصیبت میں آئی ہے۔" ضمیر جان سوچتے ہوئے ڈاڑھی کھجا رہے تھے۔ اب سے پہلے کسی بدلے، انتقام کی آگ میں انہوں نے کسی عورت کو کبھی نہیں جھونکا تھا۔ پر یہاں کچھ مشکل درپیش آ گئی تھی۔ جبار کو مروا دینا تو آپشن میں شامل تھا ہی نہیں۔ اسے تو وکیل کو سبق سکھانا تھا تو لامحالہ اب وکیل کی بیٹی کی جان عذاب میں مبتلا ہونے والی تھی۔ اس کے سوا چارہ بھی کوئی نہیں تھا کیونکہ ضمیر جان نے اپنے فورتس بھی تو واپس لینے تھے۔

"کسی بندے کو لگا دو۔ ان سب کی صبح سے شام کی روزانہ کی روٹین معلوم کر کے دو، اس کے بعد کچھ پلان کرتے ہیں۔"

"جی خان!" دلبر سر جھکا کر پیچھے کو ہٹتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"سلام صاحب!" آدمی نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر ادب سے سلام کیا۔ جبار احمد اس وقت اپنے چیمبر میں بیٹھا تھا۔ ہلکا سا سر ہلا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ آنے والا حلیے سے ایک کم پڑھا لکھا احمول بندہ لگ رہا تھا۔ شلوار قمیص کے ساتھ واسکٹ، چترالی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ کالی گھنی ڈاڑھی اور لمبی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔

"جی...... فرمایئے۔" جبار احمد مکمل متوجہ تھا۔

"صاحب! میرا نام نصیب جان ہے۔ وہ ایک کیس آن پڑا ہے گلے میں۔ کسی نے آپ کا بتایا، آپ تو سیانے ہیں۔ کوئی کیس ہارتے نہیں یعنی کہ...... ماشاءاللہ۔" آدمی کا انداز چاپلوسی جیسا تھا۔ جبار نے بھی فخر سے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

"سب اللہ کا خاص کرم ہے۔ آپ بتائیں، کیسا کیس آن پڑا ہے؟"

"بس سر جی! بیوی بڑی بدزبان اور فسادن ہے۔ دن بھر کا تھکا ہارا بندہ بیچارہ کیا کرے۔ گھڑی بھر کا سکون نہیں گھر میں، بلڈ پریشر کا الگ مریض ہوں، غصہ چڑھ جاتا ہے۔ کیا کروں مجبور ہوں۔"

"ہوں...... تو ہوا کیا ہے؟" جبار کو تمہید سے کچھ اخذ نہیں کر رہا تھا۔

"بس سر جی! ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔ اب مار کھا کر چپ ہوتی ہے تو میں کیا کروں؟"

"ہوں...... تو کہاں مار دیا؟" جبار کرسی پر گھومتے ہوئے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"گھٹنے پر زور سے لگ گیا ڈنڈا۔ ایکسرے میں آیا کہ گھٹنے کی ہڈی میں کوئی گیپ آ گیا ہے۔ اب بستر پہ پڑی ہے، چل نہیں سکتی۔ پیشے سے استانی ہے۔ اسکول کی چھٹی کی تو کسی نے سوشل ورک والی عورتوں کو بتا دیا۔ انہوں نے کیس ٹھوک دیا ہے۔ اب میں کام کاروبار والا بندہ ہوں۔ کسی طرح اس کیس سے نکلوا دیں۔"

"ہاں۔ یہ بڑا مسئلہ ہے۔" جبار نے تاسف سے سر ہلایا۔ "ہر فساد کی جڑ یہی عورتیں ہوتی ہیں اور مظلوم بھی یہی کہلاتی ہیں۔"

"ہاں، لیکن ہمارا تو سر جی ڈبل مصیبت ہے۔ کبھی آنکھ کو روتی ہے، کبھی گھٹنے کو۔"

"آنکھ کو کیا ہوا؟" جبار کو بڑے اچانک ہی "بارہ گھنٹا، پھوٹے آنکھ" والا محاورہ یاد آیا اور اس نے اپنی ہنسی روک لی۔

"ارے بس صاحب! چلاتی ہی جا رہی تھی۔ سمجھانے سے تو چپ ہی نہیں کرتی، سامنے اسٹیل کا گلاس رکھا تھا، ہم نے دے مارا۔ آنکھ پر بھی پٹی بندھا ہے۔"

"ہوں...... بچے وچے ہیں؟"

"ہاں صاحب! تین چھوٹے بچے ہیں...... اور صاحب! خشک میوے کا کاروبار ہے میرا۔ اب اوپر گلگت جانا ہے، سامان لوڈ کروا کر لانا ہے۔ ان عورتوں نے شہر سے باہر نکلنے پہ پابندی لگوا دیا ہے۔ کچھ کرو صاحب!"

"کچھ کرنے کا فیس تگڑا ہے خان جی!" جبار نے جب دیکھا کہ یہ تو کوئی موٹی اسامی ہے تو مدعا بھی فوراً ظاہر کر دیا۔

"آپ حکم کرو صاحب! کتنا فیس...... لیکن کام کیسے ہوگا؟" وہ خود بھی سوچ میں پڑ گیا جس پر جبار ہنس دیا۔

"کام تو ایسے ہوگا برادر کہ تمہاری بیوی یہ کیس معذرت کے ساتھ خود واپس لے لے گی۔" اس نے آنکھ دبا کر واضح کیا جس پر نصیب جان اش اش کر اٹھا۔

"صاحب! سنا تھا آپ کو جادو آتا ہے، پر دیکھ بھی

بالکل خوش کردیا صاحب...... تو کب لاتا ہے فیس؟"

"ابھی دے دو اگر ہے تو۔"

"صاحب! کتنا فیس؟"

"بس تمہارے لیے ستر ہزار۔"

"اچھا صاحب! پھر کل لے آتا ہوں، ابھی تو اتنا نہیں ہے۔ باقی ڈیل تو ڈن ہوا نا؟"

"ہاں ہاں، آف کورس۔" وکیل نے کندھے اُچکائے تو وہ ایک مرتبہ پھر ماتھے پر ہاتھ لے جاتے ہوئے سلام کر کے باہر نکل آیا۔

اس کی کار عدالت کی بلڈنگ سے دور کھڑی تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کر کے بڑے روڈ پر ڈالی، رخ ایک مقامی ہوٹل کی طرف تھا۔ موبائل ساتھ والی سیٹ پر رکھ کر ریکارڈنگ آن کردی۔ اس کی اور وکیل کی ساری گفتگو اس میں ریکارڈ ہورہی تھی۔ امجد نے گھنی داڑھی دو انگلیوں کی چٹکی میں لے کر ہٹائی، سر سے چترالی ٹوپی اتار کر بال انگلیوں سے سدھارے اور مسکراتے ہوئے وکیل کی باتیں سننے لگا۔

پیسے کے لیے یہ شخص واقعی کسی کو بھی ہاں بول دیتا تھا۔ امجد کو بس اسی بات کا سب سے پہلے یقین کرنا تھا۔ ایک تو جبار سے روبرو ملاقات کر کے اس کی شخصیت کو ذرا قریب سے جانچنا تھا۔ باتیں اس نے احتیاطاً ہی ریکارڈ کی تھیں اور اب اسے آگے کا لائحہ عمل بھی ترتیب دینا تھا۔ آج تو اس نے کسی طور اپنی صورت پہچان میں نہ آنے دی تھی۔ اگلی بار اسے جبار احمد کا تعاقب کچھ یوں کرنا تھا کہ وہ اس تعاقب سے واقف بھی نہ ہونے پائے۔ امجد کو اس کا لگاتار تعاقب کر کے بہت سے نتائج نکالنے تھے، اس کے بعد ہی نہ صرف ایک جامع رپورٹ تیار کرنا تھی بلکہ جبار پر ہاتھ بھی ڈالنا تھا۔ اسپتال کی فائل بھی اس کے شکنجے سے نکالنا تھی جس کے متعلق امجد کو پہلے ہی یقین تھا کہ جبار اسے ضائع کر چکا ہوگا۔ پھر بھی اقرارِ جرم بھی کم تو نہیں تھا...... اور اب اس کا رخ اپنے ہوٹل کی طرف تھا۔ فی الحال اس نے دو دن کے لیے ایک ہوٹل کا روم بک کروایا تھا۔ اب اسے کچھ دیر آرام کے بعد دوبارہ نکلنا تھا۔ جبار کے متعلق ابھی بہت کچھ جاننا باقی تھا۔

☆☆☆

"اب یہ کیا نیا شوشا ہے؟" جبار نے مصنوعی خفگی سے نورینہ کو دیکھا۔

"بس اب آپ بالکل منع نہیں کریں گے۔" اس نے لاڈ سے باپ کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

"ہاں بھئی، اب میری بیٹی نے سب سوچ لیا ہے تو میں کون ہوں کچھ کہنے والا۔" اس نے مسکرا کر ہامی بھر ہی لی۔

نورینہ بے حد خوش تھی۔ اس نے نجیب کاکا سے پوچھا تھا کہ یہاں آس پاس کوئی ایسا مقام بتائے جہاں گھنا جنگل ہو۔ اس نے سوچا کہ کینوس پر جب وہ جنگل پینٹنگ بنائے گی تو وہ کسی گھنے جنگل کی ہوگی۔ اسے طویل قامت درختوں کی قطاریں دکھانا تھیں۔ کاکا نے کچھ مشورے دیے مگر کچھ جگہیں ذرا دور تھیں اور نورینہ کا مسئلہ یہ تھا کہ اسے جگہ بھی قدرے نزدیک کی چاہیے تھی تاکہ پینٹنگ اگر مکمل نہ ہوپائے تو اگلے روز بھی جایا جاسکے۔ تبھی اس نے دریائے چترال کے کنارے کنارے کار میں سفر کرنے کا سوچا۔ جہاں بھی اسے اپنی پسندیدہ لوکیشن ملتی، وہ وہیں رک جاتی۔ اس روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ گرمیوں کا سواگت تو یہاں یا نہیں کھول کر کیا جاتا تھا۔ ہر طرف ایک رونق، ایک بہاری دکھائی دیتی تھی۔ اس نے کینوس بورڈ، اسٹینڈ، اپنا باقی کا سامان سنبھال کر پچھلی سیٹ پر رکھا اور خود بھی پیچھے بیٹھ گئی۔ سفر شروع ہوا اور اب آبادی سے نکل کر ان کی کار بالاکنڈ روڈ پر دریا کے کنارے کنارے چلتی جارہی تھی۔ صبح کے وقت روڈ پر ٹریفک بھی بہت کم تھا۔ کاکا نے اسپیڈ بھی کم رکھی ہوئی تھی۔ ایک دو جگہ دریا روڈ کے بالکل نزدیک آگیا تو اس نے کار رکوا کر نیچے اتر کر جائزہ لیا اور مزید آگے بڑھ گئے اور پھر قریب آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد اسے ایک ایسی لوکیشن مل ہی گئی جس میں دریا کا کنارہ بھی بالکل قریب تھا اور درخت کی قطار بھی اسی پار مل گئی۔ دریا کے دوسرے کنارے کے پیچھے پہاڑ بھی تھا۔ جگہ بہت آئیڈیل تھی، رش بھی بالکل نہ تھا۔ وہ سڑک سے اتر کر اس درختوں بھری جگہ کے نیچے اپنا کینوس سیٹ کرنے لگی۔

"کاکا! آپ وہ پیچھے چائے کا ہوٹل اور کچھ دکانیں بنی ہیں نا وہاں آرام کریں۔"

"کوئی بات نہیں بچے! ام ادھر سائڈ پہ بیٹھ جاتا ہے۔" وہ سر سے پگڑی اتار کر ایک طرف کو جانے لگے۔

"ارے نہیں کاکا! یہاں اکیلے بور ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔" وہ فوراً پیچھے لپکی۔ اسے یہ سوچ کر شرمندگی ہورہی تھی کہ کاکا سامنے بیٹھ کر اس کی آڑھی ترچھی پینٹنگ دیکھیں گے۔ اسے تو اکیلے ہی مکمل ذہنی سکون کے ساتھ اپنا کام شروع کرنا تھا۔ اس نے زبردستی کاکا کو وہاں سے روانہ کیا، سامان کھول کر نیچے شیٹ پر پھیلا دیا۔ اس نے ٹی پنک

اسٹار نکال کر جواب کے انداز میں سر پہ لیا اور سفید کو حائل والی چادر جو گھر سے پہن کر نکلی تھی، اسے کندھوں پہ لپیٹ لیا۔ سامنے دکھائی دیتے منظر کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لیا۔ فرنٹ پر بائیں ہاتھ درخت کا تنا، جھکی ہوئی واضح شاخیں۔ دوسرے اسٹیپ پہ دریا اور تیسرے بیک گراؤنڈ والے درجے پر نیلا آسمان اور دھندلا دور پرے کا ایک پہاڑ۔ یہ نظارہ ایک مکمل سینری کے سبھی لوازمات کو پورا کر رہا تھا۔

اب اس کے کینوس کا اسٹینڈ بھی عین اس جگہ پر تھا جہاں سے تصویر والا نظارہ اس کے کینوس کی زد میں تھا۔ اس نے مزید وقت ضائع نہ کرتے کام کا آغاز کر دیا۔

☆☆☆

''خان جی! وہ وکیل کا بیٹی ابھی مالا کنڈ روڈ پر گیا ہے۔ ساتھ بس وہی ڈرائیور ہے۔'' دلبر خان پھر ہانپتا دوڑتا ہوا سر پر آ کر رکا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ جبار اور اس کی بیٹی کا پیچھا کرتے ان کی روٹین چیک کر رہا تھا۔ ضمیر جان اب اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ وکیل کی کمزوری اس کی اکلوتی بیٹی کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی، اس لیے لامحالہ اسی کے ذریعے وکیل کو دبایا جا سکتا تھا۔ لڑکی کے اغوا کا فیصلہ پچھلے روز ہی دلبر خان اور شیر دل کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد ڈن کیا گیا تھا۔

''اس روڈ پر کدھر جا رہی ہے؟'' انہوں نے تعجب سے دہرایا پھر شیر دل کو دیکھا۔

''پچھلے کچھ دنوں کا حال احوال تو کچھ الگ نہیں تھا؟''

''جی خان! پچھلے دنوں تو وکیل کے جاتے ہی ایک دن اس کا بیٹی بازار گیا۔ ایک دن پوسٹ آفس گیا، پھر ایک دو دن گھر پر ہی تھا۔ پر آج ہمارا آدمی جو اس کے پیچھے لگا تھا، بتا رہا ہے کہ کار پر ان کا پیچھا کرتے کرتے ادھر دریا کے کنارے گیا ہے۔''

''تو پوچھو اکیلی کیا کرنے گئی ہے؟'' ضمیر جان کو شک گزرا کہ شاید کسی سے ملنے ملانے کا کوئی چکر ہو گا لیکن ڈرائیور کے ساتھ...... وہ خود الجھنے میں تھے۔

''خان جی! وہ ادھر وہ...... بورڈ ہوتا ہے سپید (سفید)، جس پر تصویر بناتے ہیں اور برش سے رنگ کرتے ہیں...... وہ بنا رہی ہے۔''

''آں...... ہاں۔'' ضمیر جان نے مونچھوں پر انگلی اور انگوٹھے کو درمیان سے کونے تک نرمی سے پھیرا۔ ''ڈرینگ بناتی ہے۔''

''جی خان! وہی۔''

''موقع تو اچھا ہے۔'' انہوں نے چمکتی آنکھیں شیر دل پہ جیسے مشورہ طلب کرنے کے انداز میں جما دیں۔ ''پوچھو، کب سے کام کر رہی ہے؟ جلدی تو نہیں نکل جائے گی؟''

''جی خان!'' اس نے مؤدبانہ جھک کر دوبارہ کال ملائی۔ اگلے بندے کی بات سنی اور سرگوشی میں بتایا، کال آن ہی رہنے دی۔

''نہیں صاب! ابھی ابھی پہنچی ہیں۔''

''ہوں...... ٹھیک ہے۔ پوچھو، اگر اٹھانا پڑ جائے تو تیاری ہے؟ بلکہ لاؤ مجھے دو۔'' انہوں نے موبائل مانگا اور خود ہی بات کرنے لگے۔ کچھ دیر تک ضروری معاملات طے کیے پھر موبائل آف کر کے شیر دل کو دیکھا۔

''اس کیم لڑکی جدھر ہے، وہاں سے اغوا کر کے کہیں آس پاس ہی رکھنا پڑے گا۔ لیکن......'' ضمیر جان کسی سوچ میں پڑ گئے اور پھر سرگوشی میں بتایا۔

''اپنے فارم ہاؤس پر رکھنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ اگر دریا کنارے سے لڑکی اغوا ہو تو...... آگے اپر دیر کیوں نہ بھیج دیں۔ راستے میں اپنا سرائے ہے، ادھر کسی کو پتا چلا بھی تو ہم پر نام نہیں آئے گا۔ ادھر تو رنگ رنگ کا مسافر آتا ہے نا۔''

وہ اب اپنے آپ میں بڑبڑاتے پلاننگ ترتیب دے رہے تھے۔ پھر ایک نتیجے پر پہنچتے ہوئے سر ہلانے لگے۔

''بس ٹھیک ہو گیا دلبر! تم ان آدمیوں سے کہو، جس کار میں لڑکی اغوا ہو اسے اپر دیر روانگی کے آدھے ہی گھنٹے کے اندر کسی ذیلی سڑک پر تبدیل کر دیں اور دوسری کار میں لڑکی کو سرائے پہنچا دیں۔''

''جی خان جی!'' دلبر نے ہدایات غور سے سنیں اور ادب سے سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ دو دنوں سے اسی ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ وکیل کو اس کے چیمبر میں حلیہ تبدیل کر کے مل چکا تھا۔ اسی شام وہ ایک دوسرے وکیل انور علی سے بھی ملا تھا۔ یہ وکیل اس کے ساتھی ورکر نبیل کا واقف کار تھا، اس لیے ملاقات ذاتی نوعیت کی رہی۔ اس کے ساتھ جبار کا اسپتال والا کیس مکمل کر ڈسکس ہوا۔ انور علی سے یہاں لوئر دیر میں جبار کی ریپوٹیشن وغیرہ پر بات ہوتی رہی۔ آج بھی وہ اپنے دن کا ایک ایک لمحہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔

اس نے کار کا فیول چیک کیا اور اسٹارٹ کر کے موبائل میں لوکیشن نکالی۔ روڈ کا تعین ہوتے ہی کار کی رفتار بھی بڑھا دی۔ اس کا رخ شہر کے دوسرے اینڈ کی طرف تھا۔ درمیان میں شہری آبادی گزری اور وہ دوسرے اینڈ کی

urdunovels.com

اب کم آبادی والے علاقے میں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے موجود تھا۔ کار اس نے بنگلے سے چند فرلانگ پیچھے کھڑی کردی۔ نیچے اتر کر واک کے انداز میں سامنے سے گزرتے بنگلے کا جائزہ لیا۔ بنگلا بہت ہی شاندار اور کشادہ تھا۔ فان کلر کی عمارت میں کہیں کہیں لکڑی کے کام سے آرائش کی گئی تھی۔ بنگلا نہایت ہی دیدہ زیب اور نفیس طرز کا تھا۔ ایسا کام وہی کرسکتا ہے جس کے پاس روپے کی ریل پیل ہو۔

اسجد ہلکا سا مسکراتے ہوئے واپس کار کی طرف آیا اور ابھی کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ بنگلے کا گیٹ کھلا اور ایک کار نکل کر سامنے جاتی دکھائی دی۔ اسجد حیران ہوا۔ اس کے نزدیک تو بنگلے کا مالک اس وقت کہیں اور موجود تھا۔ اس نے زیادہ نہ سوچتے ہوئے اپنی کار اسٹارٹ کرکے آگے جاتی کار کے پیچھے لگادی۔

کار کا رخ مالاکنڈ روڈ کی جانب تھا۔ وہ کہیں پر ہلکی ہوجاتی، کہیں تیز...... اور کھسک کھسک کر چلتے بالآخر ایک جگہ رک گئی۔ اسجد کو کون سا کہیں پہنچنے کی جلدی تھی، وہ تسلی سے پیچھا کرتے ہوئے خود بھی تھوڑا فاصلہ رکھتے وہیں رک گیا، البتہ کار سے باہر نہیں نکلا۔ وہ بغور سامنے والی کار کو دیکھ رہا تھا۔ جب ڈرائیونگ سیٹ سے ایک آدمی باہر نکلا اور اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا تو ایک لڑکی باہر نکلی۔ سفید چادر لپیٹے وہ لڑکی پیچھے ڈکی کی طرف آئی۔ آدمی نے ایک وائٹ بورڈ باہر نکالا اور لڑکی مصروف انداز میں کچھ اور سامان سنبھالتی اس آدمی سے کوئی بات چیت کرتے ہوئے روڈ سے نیچے اتر گئی۔

اسجد نے موبائل جیب میں ڈالا، سر پر کالی کیپ جما کر دھوپ کا ڈارک براؤن چشمہ لگا کر کار کو لاک کیا اور عام انداز میں سڑک کے کنارے چلنے لگا۔ دوسرے کنارے پر کچھ پرانے ڈھابے تھے، جھاڑیاں اور درخت بھی تھے۔ یہ کنارہ اگر کھلے کھیتوں جیسا تھا تو دوسرے کنارے پر دریا بہتا تھا جس کی سائڈ پر کہیں کہیں پکنک اسپاٹ اور ہوٹلز وغیرہ آجاتے تھے۔

لڑکی ایک ٹوٹے ڈھابے کی سائڈ سے گزرتے ہوئے مزید نیچے اتر گئی تھی۔ اسجد ان کی کار کے نزدیک سے ہٹا ہوا مزید آگے بڑھ گیا۔ لڑکی سڑک سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔ آدمی نے بورڈ کو اسٹینڈ پر فٹ کیا اور لڑکی کی چند ایک ہدایات سننے کے بعد وہ پیچھے چائے کے ڈھابے پر جا بیٹھا۔ لڑکی اب ایک ٹوٹے ڈھابے کی دوسری جانب اکیلی کھڑی پینٹنگ بنانا شروع کرچکی تھی۔ اسجد نے تھوڑا آگے جاکر خود بھی سڑک کراس کی اور دریا والی سائڈ پر آگیا اور سڑک سے نیچے اتر کر دریا کے کنارے بیٹھ گیا۔ لڑکی وہاں سے اب کافی دور تھی، جہاں اسجد بیٹھا تھا۔

وہاں بھی ایک ڈھابا تھا لیکن اس وقت وہ بند تھا اور وہاں کوئی موجود نہ تھا، البتہ لڑکی کے پیچھے رکھے ہوئے تھے۔ بائیں جانب کیاریوں میں پھول اور اونچے پودے تھے، جن کی وجہ سے اسجد وہاں موجود ہوتا اس لڑکی کو دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا لیکن اسجد کی چونکہ مکمل توجہ اسی کی جانب تھی، تو اس کے لیے اونچی کیاریوں کے پیچھے سے لڑکی کو دیکھنا مشکل نہ تھا۔

کچھ دیر بعد لڑکی نے قدرے دور جاکر اپنی تصویر کو دیکھا، جانچا اور پھر تھک کر بازو سیدھے کیے اور اپنا گلابی اسکارف جو چہرے کے گرد لپٹا ہوا تھا، اسے کھول کر دوبارہ ٹھیک کرنے لگی اور انہی لمحوں میں اسجد کو بہت کچھ یاد آنے لگا۔ وہ اس لڑکی سے بخوبی واقف تھا۔ پشاور میں اس کا حلیہ سفید چادر والی لڑکی سے یکسر تبدیل رہتا تھا...... اور ابھی وہ حیرت سے منہ کھولے سرمئی آنکھوں والی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس سے وہ بیگ چھین کر بھاگا تھا۔ وہ وہی تھی...... بالکل وہی...... بلاشک وشبہ۔

اسجد جتنا دیکھتا جارہا تھا، حیرت میں اضافہ بڑھتا جارہا تھا۔ ذہن میں نہ جانے کیا کچھ چلنا شروع ہوچکا تھا۔ کیا وہ لڑکی وکیل کی بیٹی تھی، مگر آئی کوئی مہمان یا بالکل کوئی اور......؟ سمجھنا بہت مشکل تھا لیکن جاننا بہت ضروری۔

☆☆☆

دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ وہ کام کرکے تھک گئی تو کاکا نزدیکی ڈھابے سے چائے اور پکوڑے لے آئے۔ حالانکہ وہ گھر سے ٹفن بھی لائی تھی، اماں نے پراٹھے بنادیے تھے۔ نورینہ نے ایک پراٹھا نکال کر باقی کاکا کو دے دیے۔ چائے کے ساتھ دوپہر کا یہ کھانا بڑا ہی اشتہا انگیز لگا۔ کھانا کھا کر اس نے اپنی پینٹنگ پر دوبارہ توجہ کی۔ کچھ دیر بعد دور سے دیکھنا ایک نئے پن سے دوچار کررہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنی تصویر کا خاکہ دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو صرف پنسل اسکیچ بنایا تھا۔ کاکا ایک مرتبہ پھر پیچھے ہوٹل میں جابیٹھے تھے۔ جہاں وہ کھڑی تھی، وہاں سے ہوٹل دکھائی بھی نہ دیتا تھا کیونکہ بائیں ہاتھ پہلے درختوں کے گھنے جھنڈ تھے، ان کے پیچھے کچھ ٹوٹے پھوٹے کھوکے تھے اور ان کی بیک پر ہوٹل تھا۔ وہ اپنی تصویر کے خاکے سے مطمئن ہوتے

ہوئے اب پہلی بار رنگوں کے ڈھکن کھول رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں ایسا لگا کوئی دیکھ رہا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر اردگرد دیکھا۔ وہی کچھ دیر پہلے والا ماحول ہی تھا۔ کا کا بھی دکھائی نہ دیے تھے۔ اوپر روڈ پر معمول کی ٹریفک آ جا رہی تھی، پھر نہ جانے کیوں عجیب سا احساس ہوا تھا۔

اس نے سر جھٹک کر رنگوں کی ٹیوبز کھولیں۔ سوچا پہلے آسمان اور دریا کے آسمانی رنگ کھول لے۔ باریک کام آخر میں کرنے کے تھے۔ وہ اپنے کام میں مگن تھی جب پیچھے کے پیچھے پتھروں پر کچھ چاپ محسوس ہوئی۔ وہاں کنارے کنارے چھوٹے پتھر رکھے تھے جو چلنے پر لڑھکنے لگتے تھے۔ نورینہ نے پلٹ کر دیکھا تو ایک درمیانی عمر کا آدمی کندھے پر صافہ رکھے چلتا ہوا آ رہا تھا۔

"سلام۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر مؤدبانہ سلام کیا تو نورینہ نے ہلکا سا سر جھکا کر "وعلیکم السلام" کہا۔ وہ تعجب سے آنے والے کی آمد کی وجہ سوچ رہی تھی۔

"مس! وہ ام ڈرائیور ہے۔ امارے ساتھ امارا بیگم صاب ہے، اس کا طبیعت بگڑ گیا ہے۔ آپ کو دیکھ کر گاڑی روکا۔ آپ ذرا اس کا طبیعت پوچھ لیں۔ ام آدمی ہے نا، پاس نہیں جا سکتا۔"

"اوہ......!" نورینہ نے اوپر سڑک کی جانب دیکھا تو ایک سفید کار بالکل سائڈ پر رکی ہوئی تھی۔ یہاں سے دیکھنا ممکن نہیں تھا کہ اس کے اندر کون ہے۔ وہ برش رکھ کر فوراً اس آدمی کے پیچھے چل پڑی۔ سڑک پر آئی تو ٹریفک اب بھی بہت کم تھی۔ ایک بیوی ٹرک تیز ہارن بجاتا شہر کی طرف نکل گیا۔ وہ اس کی تیزی کی وجہ سے آنکھیں میچے، ہوا سے بچتے کار کے عین نزدیک پہنچی۔ آدمی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا...... اور اس سے پہلے کہ نورینہ کچھ سمجھتی، اندر سے ایک مضبوط بازو باہر آیا اور نورینہ کو اندر کھینچ کر دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبا دیا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر پہلے ہی کوئی شخص موجود تھا جس نے اس کارروائی کے ہوتے ہی پوری اسپیڈ سے کار آگے بڑھا دی۔ نورینہ بری طرح تڑپ رہی تھی، خود کو چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس منہ دبانے والے آدمی کو آگے بیٹھے اس شخص نے ایک رومال تھمایا جسے فوراً ہی نورینہ کی ناک سے چپکا دیا۔ کلوروفارم نے اس کے اعصاب ڈھیلے کرنا شروع کیے اور مزاحمت کا عمل سست پڑتے ہوئے ایک دم ہی بے جان پڑ گیا۔ نورینہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ایک آدمی نے کال پر ایک نمبر ملایا۔

"خان جی! کام ہو گیا ہے۔ ہم آگے صاحب آباد پر کار تبدیل کر لیں گے۔ اس کار کا کیا کرنا ہے؟"

"یہ کار موٹن کے کسی آدمی کو دے کر کسی دوسرے روڈ سے واپس لوئر دیر بھجوا دو۔" ضمیر جان نے فوراً اصلاح دی اور ایک دوسرا نمبر ملا کر سرائے کے پچھلے حصے میں ایک کمرا خالی کروانے کا حکم دیا۔

اب تو بس آگے کی پلاننگ کرنا تھی۔ اگرچہ سب کچھ بڑی ہی جلدی میں انجام پایا تھا لیکن بہت کچھ ذہن میں موجود بھی تھا۔ ضمیر جان کا مقصد چونکہ جبار کو دھمکانا تھا اور یہ بیٹی کے اغوا کے ذریعے ہی ممکن تھا، تو وہ کام تو پورا ہو چکا تھا۔ آگے کے لیے جس بات کا خصوصی دھیان رکھنا تھا، وہ یہ تھی کہ لڑکی کی عزت پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔ ضمیر جان کو بامر مجبوری عورت کا استعمال کرنا پڑ گیا تھا لیکن اتنا تو اس کا ضمیر بیدار تھا کہ لڑکی بے قصور تھی اور بے قصور کسی عورت کی عزت ہرگز مجروح نہیں ہونی چاہیے۔ تبھی اگلی کال ملا کر سرائے میں موجود اپنے خاص نوکر عجب خان کے ذمے لگایا کہ اس کی بیوی سارا وقت لڑکی کے پاس رہے گی۔ اسے کھانا، پانی، ضرورت کی سب چیزیں صرف ایک عورت کے ذریعے ملیں گی۔ عجب خان نے بیوی کو سب سمجھا دیا۔

☆☆☆

اسجد دوڑ کر سڑک پر آیا۔ جو کچھ ابھی ابھی اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا تھا، اس سے معاملے کی سنگینی صاف ظاہر تھی۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور سامنے جاتی کار کے پیچھے لگا دی۔ درمیانی فاصلہ تب تک اگرچہ کافی زیادہ ہو چکا تھا لیکن اسجد کو باقی ماندہ ٹریفک کے بیچوں بیچ دور جاتی وہ کار بھی دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد کار اسے ایک ذیلی روڈ پر مڑتی دکھائی دی۔ وہ ذیلی راستہ بھی دور تک جاتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسجد نے اپنی کار کی اسپیڈ کم کی۔ اگلی کار موڑ کاٹ کر رک چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی کار کو کراس کر کے ایک دوسری کار بھی اس جانب مڑ گئی اور پہلی کار کے عین پاس جا کر رک گئی۔ دونوں کاروں کے دروازے کھلنا شروع ہوئے۔ اسجد نے آنکھوں سے دوربین لگائی۔ پنک اسکارف والی کو اٹھا کر دوسری کار میں شفٹ کیا جا رہا تھا۔ دوربین کی وجہ سے اسجد نے یہ عمل واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ کار کو تبدیل کیا جا رہا ہے۔

کچھ دیر بعد دونوں کاریں اس موڑ سے واپس باہر

تھیں۔ ایک اس کی جانب بڑھی اور قریب سے گزرتی چلی گئی اور دوسری ایک مرتبہ پھر مین روڈ پر آگے بڑھ چکی تھی۔ اس وقت مین روڈ پر ٹریفک کا رش بھی تھا اور دوسرے عام ٹریفک کی موجودگی اس وقت اسجد کے لیے ڈھال ثابت ہوئی، کیونکہ جب وہ رفتار بڑھا کر درمیانی فاصلہ طے کرتے ہوئے پیچھا کرنا شروع کر چکا تھا تو اگلی کار کو تعاقب کا شبہ نہیں ہو پایا۔ اسجد کو حیرت تھی کہ وہ تو محض جبار کی رہائش، اس کا رہن سہن جانچنے وہاں پہنچا تھا۔ گھر سے نکلتی کار کا پیچھا بھی اس لیے کیا کہ دیکھنا چاہتا تھا اندر سے کون نکل کر گیا ہے، مگر یہاں تو صورت حال پل پل ڈرامائی ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے اس سرمئی آنکھوں والی لڑکی سے سامنا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا اغوا۔ پیچھا کیے بنا تو چارہ ہی نہیں تھا، اور ابھی تو یہ سمجھنا باقی تھا کہ کیا واقعی یہ کوئی اغوا ہے؟

وہ اب عام انداز میں سامنے جاتی کار کے پیچھے لگا ہوا تھا اور قریب ایک گھنٹے بعد جبکہ آگے ایک چیک پوسٹ آنے کے بعد موڑ کاٹنے پر اپرو یر شروع ہو جاتا تھا، اس سے پہلے ہی سڑک کے کنارے ایک سرائے پر کار رک گئی۔ اسجد کی کار سرائے سے کافی پیچھے تھی۔ اس نے سوچ بچار کے لیے کار وہیں روک دی۔ اسے اب سرائے پہنچنا تھا لیکن کچھ دیر بعد تاکہ وہاں رکنے والے پیچھے آنے والوں پر جتنا دھیان لگاتا ہے، لگا کر خوب تسلی کر لیں۔ اور وہی ہوا۔ وہ دوربین سے سرائے کے آس پاس گھومنے والوں کی کارروائی بہ آسانی دیکھ پا رہا تھا۔ اس کی کار ابھی سرائے سے بہت پیچھے درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد سرائے کے باہر ہلچل تقریباً ختم ہو گئی۔ کچھ لوگ باہر رکھی کھاٹوں پر بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ اسجد نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور کچھ دیر بعد خود بھی ایک عام سیاح کی طرح جا کر ایک علیحدہ کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ موبائل کھول کر اس نے سگریٹ سلگایا اور تکیے سے ریلیکس انداز میں ٹیک لگا لی۔ جگہ اس نے ایسی چنی تھی کہ سامنے کھڑی کار عین اس کی نظر کے سامنے تھی۔ لڑکی کو کار میں دھکا دینے والے آدمی کا شلوار قمیص شوخ فیروزی رنگ کا تھا، اس لیے اسے نظر میں رکھنا اسجد کے لیے آسان ہو گیا تھا، ورنہ اتنی دور سے چہرہ تو پہچان میں نہ آ سکتا تھا۔

کار اب خالی لگ رہی تھی۔ فیروزی سوٹ والا کبھی کار کے پاس آتا، کبھی اندر چلا جاتا۔ اس کے ساتھی کون تھے؟ یہ بات سمجھنا اسجد کے لیے ذرا مشکل تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اگر لڑکی اغوا ہوئی تھی تو وہ سرائے جیسی بارونق جگہ پر کیوں رکے ہوئے تھے۔ جس طرح سہولت سے وہ آدمی کار میں سامان رکھ اور نکال رہا تھا، صاف لگ رہا تھا کہ کار اب خالی ہے اور لڑکی اس میں نہیں ہے۔ اسجد احتیاط کے پیش نظر کار کے نزدیک نہیں جا رہا تھا۔ ابھی تک کے وقت میں اگر اسے ایک عام سیاح سمجھا جا رہا تھا تو اسے اپنی کسی حرکت سے خود کو مشکوک ظاہر نہیں کرنا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے تین آدمیوں کو کار کی طرف بڑھتے دیکھا تو ایک دم چوکنا ہو گیا۔ بیرے نے چائے اس کے سامنے لا کر رکھی تو اس نے بیرے کو روک کر واش روم کا پوچھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق لڑکے نے سامنے دکھائی دیتی مسجد کی طرف اشارہ کیا۔ اسجد اپنی جگہ چھوڑ کر نارمل رفتار سے چلتا ہوا کار کے قریب سے گزرا، کن انکھیوں سے کار میں بیٹھے آدمیوں کو دیکھا۔ پنک ڈریس کی جھلک تک کہیں نہیں تھی۔ دو آدمی آگے بیٹھے تھے اور فیروزی کپڑوں والا پیچھے اکیلا بیٹھا تھا۔ جب تک وہ مسجد کے دروازے پر پہنچا، کار اسٹارٹ ہو کر گولائی رخ گھومتے ہوئے واپسی کی راہ پر روانہ ہو چکی تھی۔ مسجد کی چھوٹی دیوار کے پار سے بھی اسجد دور جاتی کار کو دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی اور اب صاف ظاہر تھا کہ لڑکی اسی سرائے میں کہیں چھپائی گئی تھی یا اپنی مرضی سے یہاں تھی۔ کچھ بھی کہنا اگرچہ مشکل تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ اس وقت اس لڑکی کے بہت قریب تھا۔

☆☆☆

”صص...... صاحب! بی بی نہیں ہے...... صاحب ابھی تو اور تھا۔“ نجیب نے کال ملا کر بھی بھاگ دوڑ ترک نہیں کی۔ حالانکہ وہ پچھلے دس پندرہ منٹ سے یہی تو کر رہا تھا۔ بی بی سے چائے کا پوچھنے آیا تو اسٹینڈ بھی لگا تھا، تصویر بھی لگی تھی۔ نیچے گھاس پر بچھی شیٹ پر رنگ، برش، پلیٹ حتیٰ کہ بی بی کا پرس بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے سمجھا شاید رفع حاجت کے لیے کہیں گھنے درختوں کی جھاڑیوں کی طرف گئی ہوں۔ وہ مؤدب سا روڈ کی جانب منہ کیے دیر تک اسی بات کا منتظر رہا، لیکن بڑی دیر گزر گئی، نورینہ بی بی لوٹی نہیں تو اس نے پریشان ہو کر آواز لگانا شروع کر دی۔ بائیں ہاتھ کے ٹوٹے کھوکھوں کو لکڑی سے پیٹ کر متوجہ کیا لیکن اندر کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ کچھ دیر بعد البتہ وہ بری طرح بوکھلا چکا تھا کیونکہ نورینہ آس پاس واقعی کہیں نہیں تھی۔ اب تو چلا چلا کر پکار بیٹھا تھا۔ سڑک پر آ کر کار میں چیک کر کے سڑک پار کا علاقہ بھی دیکھ آیا لیکن سڑک کا دوسرا کنارہ تو ویسے بھی کھلے

سرسبز میدان جیسا تھا۔ وہاں تو دور دور تک کھلے کھیت تھے۔ نورینہ کا اس جانب ہونا نظر سے چھپ ہی نہیں سکتا تھا۔ تنگ آ کر اس نے جبار صاحب کو کال کی۔ جبار نے تفصیل سے سب پوچھا اور نجیب نے اب تک کا سارا حال کہہ سنایا۔ جبار کا سن کر بری طرح دل دھڑکا۔ جلدی سے پولیس کو کال ملا کر لوکیشن پر پہنچنے کا کہا اور خود بھی اپنے چیمبر سے نکل آیا۔ دوسری کار میں وہاں تک پہنچا، جہاں نجیب کا کا اب بھی ہلدی چھوڑ لیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پولیس بھی کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ گئی۔ وہ ساری جگہ جوں کی توں تھی۔

پولیس نے ان کی زبانی اب تک کی روداد سن کر جگہ کا جائزہ لیا۔ ساتھ ساتھ کچھ نوٹ کر رہے تھے۔ تصاویر بھی لیں اور ایک جیپ میں چند اہلکاروں کو آگے مالاکنڈ روڈ کی اگلی چوکی کی طرف روانہ کیا۔

"یوں تو دریا کا کنارہ ہے اور دریا بھی گہرا اور خطرناک ہے لیکن ڈوبنے وغیرہ کا چانس بہت کم لگ رہا ہے کیونکہ بہاؤ اس جانب ہے جہاں آگے یہ ڈھابا ہے۔ اتنی جلدی کوئی ڈوب نہیں سکتا۔ ڈوبنے کی صورت میں بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مارنا، چیخنا چلانا نارمل ری ایکشن ہیں۔ ایسی صورت میں ان لوگوں کا متوجہ ہونا لازمی تھا۔ اب یا تو معاملہ اغوا کا ہو سکتا ہے، یعنی یا تو کوئی پیچھا کر رہا تھا اور نظر رکھے ہوئے تھا یا پھر یہیں کہیں آوارہ پھرتے کسی کی اچانک نیت خراب ہوئی۔" وہ اے ایس پی فیصل زمان تھا جو کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے اب جبار سے مخاطب تھا۔

"آپ کو شک ہے کسی پر...... کوئی دشمن...... کوئی بھی کا ذاتی معاملہ، کسی لڑکے وغیرہ کا؟" وہ بڑے ہی پروفیشنل انداز میں ہر جانب کی بات سوچ رہا تھا۔ جبار خود بھی ایک وکیل تھا۔ اسے فیصل خان کا کوئی سوال بھی ناگوار نہیں لگا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ چلتے ہوئے فیصل کے ساتھ ایک سائڈ پر نکل آیا۔

"آپ کو سن کر صرف دو باتوں کی طرف دھیان جا رہا ہے۔ پہلا یہی کہ ہو سکتا ہے یہیں کسی نے اچانک ویرانے میں لڑکی دیکھ کر کچھ پلان کیا۔ دوسرے ایک دشمن ہے جس نے کچھ دن پہلے مجھے تھریٹ کیا تھا اور تیسری بات......!" جبار یہاں تک آ کر اٹک گیا کہ تیسری بات خود نورینہ سے متعلق ہی تھی۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے تو وہ منشیات کے ایک اسکینڈل میں ملوث پائی گئی تھی۔

"جی جی جبار صاحب! کھل کر بتایئے۔ آپ کے پیشے کے حوالے سے میں سمجھ سکتا ہوں اس بات کو۔"

"جی۔ ایک کیس لڑا تھا پچھلے دنوں۔ اپر دیر کے سردار ولید گل خان کی آبائی حویلی کا معاملہ تھا۔ اس کا چچا ضمیر جان مخالف پارٹی تھا۔ ولید نے مجھے ہائر کیا۔ باپ کی آبائی حویلی اب چھوٹے بھائی کے نام منتقل ہو یا بیٹے کے نام...... بس یہی کیس دائر ہوا تھا۔ مجھے ضمیر جان نے تھریٹ کیا کہ اگر حویلی ولید کے نام ہوئی تو وہ مجھے سبق سکھائے گا۔"

"تو...... کیس جیت چکا ولید؟" فیصل خان بڑے دھیان سے اسے سن رہا تھا۔

"ہاں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی کیس جیتے ہیں ہم۔"

"اوہ...... لیکن......!" فیصل خان رکا۔ "اگر باپ مرے گا تو حویلی بیٹے کو ہی منتقل ہوگی نا۔ چچا کیوں دعوے دار بنا؟" فیصل خان کو معاملہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

"آں...... وہ......!" جبار کچھ اٹک سا گیا۔ فیصل خان نے دھیان سے اس کی صورت دیکھی۔ چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آتے آتے رہ گئی۔ جبار کے متعلق کہیں سے سنا تھا کہ وہ بھاری رقم کے عوض ایسے کیس بھی لے لیا کرتا ہے جو صرف وہی جتوا سکتا ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ان کیسز میں اتنا دم ہوتا نہیں جتنا وہ اپنی ہوشیاری کے بل پر پیدا کر لیا کرتا ہے۔ فیصل خان کو آج وہ سنی سنائی کچھ درست معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ ذرا بیٹھ کر مجھے آرام سے بتائیں۔" فیصل اسے لیے اپنی جیپ تک آیا اور شانے پر ہلکا سا دباؤ دیتے ہوئے اسے جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔

"میرے اہلکار اگلے ٹول پلازا تک گئے ہیں۔ امید ہے کچھ نہ کچھ سراغ ابھی مل جائے گا لیکن اگر ہمیں ہر بات کا علم ہو تو زیادہ بہتر رہے گا۔ خصوصاً آپ کی بچی کے لیے...... ہوں؟" فیصل خان کا لہجہ معنی خیز تھا۔ جبار کا دل نورینہ کی یاد سے ایک مرتبہ پھر جیسے مٹھی میں آ گیا اور اس نے فیصل خان کو ضمیر جان کی دھمکی کی ساری تفصیل بتا دی۔

☆☆☆

نورینہ کی آنکھ ایک بند تاریک جگہ پر کھلی تو فوری طور پر کچھ بھی سمجھ نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہے۔ دھیرے دھیرے جیسے سوئے ہوئے دماغ نے کام کرنا شروع کیا اور کچھ دھندلی سی باتیں یکلخت یوں ذہن کے پردوں سے ٹکرائیں کہ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اٹھتے ساتھ ہی البتہ بڑے زور کا چکر آیا جس پر اس نے بے ساختہ اپنا سر تھاما لیکن اب وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس تاریک جگہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد آ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

وہ بنا سوچے سمجھے ایک انجان آدمی کے ساتھ چل پڑی تھی اور لمحوں کے اندر اسے اپنی اس غلطی کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑ گیا تھا۔ کم از کم روڈ پر آتے ہی اسے پہلے نجیب بابا کو آواز دینا چاہیے تھی، لیکن کار روڈ سے اتر کر مین اس کے سامنے کھڑی تھی۔ کہیں اِدھر اُدھر ہونے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ پر اب...... اب وہ نہ جانے کن ہاتھوں میں تھی۔ اس کا دل کسی بھیانک انجام کے خوف سے یکلخت دھڑکنے لگا۔ وجود میں پریشان کن سی جھرجھری دوڑ گئی اور خشک گلے سے اس نے بڑی دقت سے تھوک نگلا۔ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے اتنی تسلی تو ہوئی تھی کہ اس کی عزت محفوظ تھی لیکن نہ جانے کب تک۔ کار میں سوار تین آدمی۔ اف...... ''آدمی'' کے نام پر بھی وجود کپکپا اٹھا۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔

اس نے بھی نظروں سے ہر جانب دیکھا۔ کسی دیہاتی ماحول کے اس پتھر اور گارے سے بنے کمرے میں سامان بھی سادہ اور دیہاتی قسم کا رکھا ہوا تھا۔ وہاں گندم کی چند ایک بوریاں، گٹھڑ میں بندھا بھوسا، دیوار سے لگی دو چٹائیاں، کچھ لوہے کا پرانا سامان رکھا تھا۔ وہ خود ایک بان کی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ ایک دروازے کے علاوہ وہاں ایک روشن دان تھا اور وہ بھی دروازے کے قریب دو فٹ اوپر تھا۔ نورمینہ نے چارپائی کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ کیا وہ اس پر چڑھ کر اس روشن دان تک پہنچ سکے گی تاکہ باہر جھانک سکے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ ہمت کر کے چارپائی کو پہلے آرام سے کھڑا کیا اور پھر اٹھا کر دروازے کے سامنے لے آئی اور دیوار سے لگا دیا۔ ایک گہرا سانس لے کر خود کو ہمت دلائی، جوتا اتار کر سائڈ پر کھسکایا اور سنبھل کر ہاتھ رکھتے بان میں پاؤں پھنساتی اوپر چڑھ آئی۔ خود کو سنبھال کر روشن دان میں سے جھانکا۔ وہ واقعی ایک دیہات تھا۔ نظر کے سامنے گندم کی فصل دکھائی دے رہی تھی۔ آبادی سامنے تو کہیں نہیں تھی مگر آوازیں بھی کہیں سے آرہی تھیں اور عجیب بات تھی کہ ٹریک کا شور بھی تھا۔

روشن دان چھوٹا سا تھا۔ یہاں سے وہ نکل نہ سکتی تھی۔

اس نے ایک آہ بھری اور تبھی نیچے دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک اتنی اچانک ہوئی تھی کہ نورمینہ بری طرح گھبرا کر لڑکھڑائی۔ منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور وہ گرتے گرتے بچی۔ وہ تیزی سے نیچے اتری۔ دستک پھر زور سے ہوئی۔

''کک...... کون......؟'' دروازہ اس نے ہی اندر سے بند کیا تھا جس کی باہر والے بندے نے شاید بالکل توقع نہیں کی تھی، اس لیے دروازہ پیٹنے میں شدت سی آگئی تھی۔

''کھولو جی!! دروازہ کھولو ورنہ میرا آدمی توڑ دے گا۔'' ایک عورت کی آواز سن کر نورمینہ کی گھبراہٹ بھی کچھ کم ہوئی اور اس نے کنڈی کھول دی۔

آنے والی ایک اونچی، لمبی پٹھان، فربہ عورت تھی۔

اس نے تیز نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا اور آڑھی ٹیڑھی چارپائی کو دیکھتے ہوئے سخت مشکوک نظروں نے نورمینہ کو گھورا اور پھر اسی تیزی سے اسے دبوچ کر چارپائی پر گرا دیا۔

''ایک دم پاگل ہے یہ سوئی۔ لڑکی کو کھلا چھوڑ دیا۔''

وہ اپنا کربند کھول کر اس کے بازو باندھ چکی تھی۔ نورمینہ اس اچانک افتاد پر زیادہ مزاحمت بھی نہ کر پائی اور چند ہی لمحوں میں اسے باندھ دیا گیا۔

''کس نے مجھے اغوا کیا ہے؟'' وہ لیٹے لیٹے اب مجھ سے دریافت کر رہی تھی۔ عورت چونکہ خالص پشتون لگتی تھی، اس لیے نورمینہ نے بھی پشتو میں سوال کیا۔

''ہمیں نہیں پتا۔'' اس نے تنی سے ہاتھ نفی میں لہرایا۔ ''ابھی بس اتنا بتاؤ کہ کیا کھاؤ گی؟ بھاگنے کی کوشش مت کرنا، باہر اتنے آدمی پہرا دے رہے ہیں کہ ایک قدم بھی آزادی کا اٹھانا محال ہے۔ سمجھی کچھ؟'' وہ پشتو میں اسے تنبیہ کر رہی تھی۔

''میرے سر میں بہت درد ہے۔ مجھے گولی اور پانی دے دو۔'' نورمینہ اپنے پریشان کن خیالات اور آگے پیش آنے والی کسی بھی خطرناک سچویشن کا تصور کر کے جس شدت کی خوفزدہ تھی، وہ ایک عورت کو سامنے پا کر یکلخت بہت حد تک کم ہو گئی تھی۔ اب وہ سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں تھی۔ خود کو بآسانی اس کے حوالے بھی اس لیے کر دیا تھا کہ دماغ ایک دم ہی بڑا ریلیکس ہوا تھا۔ اب وہ سکون سے سوچنا چاہتی تھی اور اس عورت کے ساتھ تو ہرگز بگاڑنا نہیں چاہتی تھی، ورنہ تو بہت ممکن تھا اگلی مرتبہ وہ اپنی جگہ کسی مرد کو اندر بھیج دیتی۔

''گولی مل جائے گی لیکن اگر تم بھوکی ہو تو گولی کیسے کھاؤ گی؟'' سر درد کا سن کر وہ فصیلی عورت بھی کچھ نرم پڑی۔

''مجھے کتنی دیر ہو گئی ہے اِدھر؟'' نورمینہ نے ہوشیاری سے سوال کیا، لہجہ بھی معصومانہ سا کر لیا۔ ''میرا مطلب ہے، اندازہ لگا رہی ہوں کہ کب سے بھوکی ہوں۔''

''تم ادھر تین گھنٹے سے بے ہوش ہو۔'' اس نے بھی عام انداز میں جواب دے دیا جس پر نورمینہ سوچ میں پڑ گئی کہ گھر والوں کو یقیناً خبر ہو چکی ہوگی اور اس کے بابا! اس کی

urdunovels.com

تلاش میں لگے ہوں گے۔

’’آں..... تو چائے لا دو بس، مجھے بھوک نہیں ہے۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ وہ فوراً پلٹ گئی اور دروازہ باہر سے بند ہونے کی آواز آئی۔ نورینہ نے ایک گہری سانس لی۔

عورت نے اس کے بازو آگے باندھے تھے جس کی وجہ سے اسے مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ وہ کہنی کی مدد سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور آلتی پالتی مار کر اپنے بندھے ہوئے بازو اپنی گود میں رکھ لیے۔ اب تو سوائے سوچنے کے کوئی کام نہ تھا لیکن سوچتی بھی کیا، جبکہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ کس کی حرکت تھی اور ان کا مقصد کیا تھا۔

☆☆☆

اسجد نے مسجد سے نکل کر عمارت کا جائزہ لیا۔ سامنے دکھائی دیتے ریسٹورنٹ کی اوپری منزل پر کمروں کی قطاریں بتاتی تھیں کہ وہ ایک ہوٹل بھی ہے اور یہ بات اسجد کے فیور میں جارہی تھی۔ اسے تو دیر تک یہاں رک کر جاننا تھا کہ لڑکی یہاں کیوں چھوڑی گئی اور وہ کس حال میں ہے۔ کچھ سوچ کر وہ ہوٹل کے ریسیپشن پر آیا۔

’’رہائش کے لیے کمرے دستیاب ہیں یہاں؟‘‘ لہجہ ایک دم معمول کا رکھا۔

’’جی جی، یہ سرائے اسی لیے ہے۔ حکم کریں۔‘‘

’’ایک کمرا چاہیے۔‘‘ اس نے بٹوا کھولا۔

’’کہیں آگے جارہے ہیں؟‘‘ آدمی نے بظاہر تو عام انداز میں پوچھا لیکن بٹوے پر جھکے اسجد کو لہجے میں تفتیش بڑی صاف محسوس ہوگئی۔

اس کا مطلب یہاں موجود ہر بندہ خوب چوکنا اور مشکوک تھا..... اور کیوں تھا؟ یہی تو اس نے جاننا تھا۔

’’ہاں، اوپر پہاڑوں پر ہے نا درگئی..... میری وہاں پوسٹنگ ہوئی ہے۔ بس پیچھے سے ایک دو اور استادوں نے پہنچنا ہے۔ کہہ رہے تھے یہاں کہیں ان کا انتظار کروں۔‘‘

’’آں..... اچھا، ٹھیک ہے صاب! خطرناک راستہ ہے، جیپ میں جانا چاہیے۔ کار کا روٹ نہیں ہے۔‘‘ وہ ایکدم مطمئن ہوکر رجسٹر میں اندراج کرنے لگا۔

اسجد نے اپنا شناختی کارڈ سامنے رکھا اور ایک دن کی ادائی کردی۔ کچھ ہی دیر میں اسے ایک آدمی کے ساتھ اوپر والے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اب وہ یہاں اعتماد سے گھوم پھر سکتا تھا۔ چھوٹے سے اس کمرے میں دو پلنگ رکھے تھے لیکن فی الحال وہ کمرا اس کے اکیلے تصرف میں تھا۔ اب وہ جائزہ لینے کے انداز میں کمرے کو دیکھ رہا تھا۔

کمرے میں ایک کھڑکی بھی تھی جس پر پردہ لگا تھا۔ وہ تیز قدموں سے کھڑکی تک پہنچا، پردہ ہٹا کر جھانکا تو پیچھے کئی کھیت تھے۔

اسجد کے لیے اب جگہ کا جغرافیہ سمجھنا آسان ہوگیا تھا۔ یہ کھڑکی عمارت کی پشت پر کھل رہی تھی۔ سامنے تو بڑا روڈ اور ریسٹورنٹ تھے اور یہ یقیناً پچھلا علاقہ تھا۔ اس نے اب تک کے وقت میں صرف پردہ ہٹایا تھا۔ شیشے کی کھڑکی کو کھولنے کے لیے ہاتھ رکھ کر دھکا دینا چاہا لیکن نظر نیچے پڑی تو ہاتھ وہیں رک گیا۔ دو آدمی رائفلیں کندھے پر لٹکائے تیز قدموں سے آس پاس دیکھ رہے تھے۔ وہ اس وقت بالکل ایک محفوظ مقام سے انہیں دیکھ سکتا تھا، کسی کو اس کے ہونے کا گمان تک نہیں تھا۔ ایسے میں کھڑکی کھول کر بلاوجہ اپنے آپ کو نظروں میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے دور تک دکھائی دیتے کھیتوں پر دھیان مرکوز کرلیا۔

کھیتوں کے پار ایک فارم ہاؤس، ایک نیلے ماربل کا سوئمنگ پول اور شاید ایک مچھلیوں کا تالاب تھا۔ دائیں ہاتھ پر اس فارم ہاؤس کو جاتی ایک چھوٹی سڑک بھی تھی۔ یعنی کھیتوں میں جانے کا جواز بھی نکل آیا تھا۔ اس نے چند منٹ کے اندر جلدی سے باتھ لے کر کپڑے تبدیل کیے۔ اگرچہ اس سب کی بالکل کوئی ضرورت نہ تھی لیکن اسے خود کو ایک عام سیاح ثابت کرنے کے لیے یہ سب جتن کرنا پڑ رہے تھے۔ کپڑے تبدیل کرکے باہر نکلا تو ظہر کی اذان ہورہی تھی۔ اس نے کھانے کا آرڈر دے کر مسجد کا رخ کیا، نماز ادا کی، واپس آکر کھانا کھایا۔ وہاں موجود ویٹروں وغیرہ سے نہایت اخلاق سے حال احوال دریافت کیے۔ بلاوجہ وہیں بیٹھے اپنی کچھ سیلفیاں لیں، جیسے وہ تصویروں کا بہت دلدادہ ہو، پھر اسی طرح موبائل کو پھولوں کی کیاریوں پر تو کبھی دور دکھائی دیتے پہاڑوں کی طرف سیٹ کرتے تصاویر بنانے لگا اور کچھ ہی دیر میں بالکل غیر محسوس طور پر دائیں ہاتھ کی طرف اس روڈ پر آگیا جو اسے کھڑکی سے دکھائی دیا تھا۔ اس روڈ پر چلتے چلتے بھی وہ اپنی تصویریں بنارہا تھا تاکہ کوئی اس پر نظر رکھے ہوئے ہو تو یہی سمجھے کہ وہ بس علاقے کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہورہا ہے۔

چلتے چلتے جب آدھا راستہ گزر گیا تو اس نے رک کر اس پوری لوکیشن پر دھیان دیا۔ اس وقت جہاں وہ رکا تھا، کھیتوں کی پگڈنڈی کے کنارے کنارے درختوں کی گھنی قطار تھی۔ وہ اگر اس پگڈنڈی پر مڑ جاتا تو نہ فارم ہاؤس والوں کی نظر میں آسکتا تھا، نہ ہی سرائے والے اسے آسانی

سے دیکھ پاتے۔ وہ درختوں کے آگے اور جھاڑیوں کے پیچھے سبزے کے بیچوں بیچ مکمل چھپا ہوا کھڑا تھا۔ اس کے پاس ایک جدید چھوٹے سائز کی بہ آسانی جیب میں سمانے والی دوربین تھی۔ اسجد نے دوربین نکال کر اسے کھولا اور آنکھوں سے لگا کر سرائے کے پچھلے حصے کو دھیان لگا کر دیکھنا شروع کیا۔ اس کے اپنے کمرے کی کھڑکی بھی اب صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بائیں ہاتھ جس طرف رائفل والے آدمی گم ہوئے تھے، اب وہ جگہ اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ یہاں بھی کچھ کمرے تھے۔ وہ بغور اس پوری جگہ کا جائزہ لے رہا تھا تب ہی پچھلے برآمدے کے دو اسٹیپ اتر کر ایک پٹھان عورت اس جانب جاتی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے بھی تھی۔ وہ ان پختہ کمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک الگ تھلگ بنے کچے کمرے کے سامنے رکی۔ اسی وقت ایک آدمی بندوق اٹھائے بھاگ کر نزدیک آیا۔ اس نے جیب سے کچھ نکالا، دروازے کے قریب ہوا۔ اس کے ہاتھ حرکت کر رہے تھے اور پھر دروازہ کھول کر اس نے عورت کو راستہ دیا اور وہ اندر داخل ہوگئی۔ اسجد کی مکمل توجہ اسی جانب ہوگئی۔

عورت کچھ دیر بعد باہر نکلی تو اس کے ہاتھ خالی تھے۔ آدمی نے دروازہ بند کر کے پھر کچھ جیب میں ڈالا تو اسجد سمجھ گیا کہ ضرور وہ چابی ہوگی۔ اسجد نے دوربین فولڈ کر کے جیب میں ڈالی اور اس مرتبہ چھوٹی سڑک سے واپسی کے بجائے مزید کچھ آگے جاتے کچی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا سرائے کی طرف آنے لگا۔ اس بار اسجد نے بجائے تصویریں بنانے کے، موبائل کان سے لگا کر ہونٹ ہلانا شروع کر دیے، جیسے وہ کسی سے باتوں میں مگن ہو جبکہ اس کی پوری توجہ اس جگہ کو سمجھنے پر تھی۔

وہ کچے کمرے اور پچھلے برآمدے کے سامنے سے ہوتا ہوا گھوم کر سرائے کے سامنے والے حصے کی طرف آگیا۔ کچے کمرے کے آگے واقعی تالا لگا ہوا تھا اور برآمدے تک چار مشٹنڈے ٹائپ آدمی گنیں لیے پہرا دینے کے انداز میں گھوم پھر رہے تھے۔ عمارت چونکہ ایک پبلک ہوٹل کی تھی، اس لیے اس جیسے لوگوں کا یہاں گھومنا پھرنا زیادہ مشکوک نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ اسجد کو اب یقین ہوگیا کہ کچے کمرے میں لامحالہ وہی لڑکی ہے۔ لیکن اسجد کو اسے یہاں سے نکالنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ کمرے میں واپس آ کر بھی وہ دیر تک بے چین رہا۔ ایک خیال یہ آ رہا تھا کہ براہ راست ہی پولیس طلب کر کے چھاپا پڑوا دے لیکن مقامی پولیس اسٹیشن سے رابطہ کیسے ممکن ہو؟ وہ سر کھجاتے ہوئے سوچ میں گم تھا۔ خرم سے بات کر کے مشورہ طلب کیا جا سکتا تھا لیکن اسے تو اپنے کمرے میں بھی کسی کیمرے یا ریکارڈر کی موجودگی کا شبہ ہونے لگا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے بیگ سے کتاب نکال کر پلنگ پر لیٹنے کو ترجیح دی۔

دماغ لگاتار سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ نظریں الفاظ پر خالی خالی سی گھوم رہی تھیں۔ یہ سرائے اگر ایسی خطرناک سرگرمیوں میں ملوث تھی تو کیمرے وغیرہ کی موجودگی خارج از امکان نہ تھی اور اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ وہ جو آدھی رات کو دوبارہ نکل کر پیچھے کا چکر لگانے کا سوچ رہا تھا، اس پر عمل درآمد بھی ذرا مشکل تھا۔ تو آخر کیا، کیا جائے؟ اس کے پُرشکن ماتھے کی سلوٹیں کچھ اور گہری ہوگئیں۔ دن بھر کی تھکاوٹ کا اثر بھی تھا کہ آنکھیں اب بوجھل سی ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

”خان جی! وہ وکیل جبار کی کال ہے۔“ ولید کے ملازم نے اس کے کان میں آ کر بتایا۔ وہ اس وقت اپنے ڈیرے پر دوستوں کی دعوت میں مشغول تھا۔ اس نے نہایت بے دلی سے موبائل لے کر کان سے لگایا۔

”ہیلو!“ ولید خان کی آواز میں ایک کھردرا پن سا تھا جسے جبار نے یکسر نظرانداز کیا۔

”السلام علیکم خان! خان، ایک بہت بڑی مشکل آن پڑی ہے۔ آپ پلیز ذرا ایک طرف ہو کر میری بات سن لیں۔“ ولید کے پیچھے آدمیوں کی آوازیں اور قہقہے جبار کو بہت کوفت دے رہے تھے۔ ولید خان نے وکیل کے لہجے کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑی اور باہر برآمدے میں نکل آیا۔

”کیا ہوا جبار! سب خیر تو ہے؟“ ولید کو اپنے کیس کے بگاڑ کا اندیشہ ہونے لگا۔

”خان! میری بچی اغوا ہوگئی ہے۔“ جبار نے لمحہ ضائع نہیں کیا۔ ولید خان البتہ اتنا غیر متوقع جملہ سن کر بری طرح چونکا۔

”بچی...... کیا مطلب...... کیسے؟ اور......“

”خان! مجھے آپ کے کیس کے دوران آپ کے چچا کے دھمکی بھرے میسج ملے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے ولید خان کو کیس جتوایا تو نتائج کا ذمے دار خود ہوں گا اور اب آج صبح میری بیٹی اغوا ہوگئی ہے۔“ جبار نے تمہید باندھنے کے فوراً بعد بنا ولید کو کچھ بولنے کا موقع دیے فوزیہ کے اغوا کا واقعہ بھی سنا دیا۔

"خان! اگر یہ آپ کے چچا کا کام ہے تو اللہ کا واسطہ، آپ مجھے پتا کروا دیں۔ میری بیٹی پتا نہیں کس حال میں ہوگی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ......"

"ارے...... تھوڑا دم تو لو۔" ولید خان کو اسے خود ہی چپ کروانا پڑا۔ "اگر تمہیں لگتا ہے کہ چچا کی دھمکی صرف دھمکی نہیں تھی تو میں معلوم کرتا ہوں، لیکن......" ولید خان کو اچانک کچھ خیال آیا۔ ذہن اب بیک وقت کئی اطراف میں کام کرنے لگا تھا۔

"پولیس کو تم نے بیچ میں ڈال دیا، کہیں وہ کام بگاڑ نہ دیں۔"

"آں...... اچھا خان! میں پولیس سے دوبارہ کچھ نہیں کہتا، آپ بس کسی طرح معلوم کروا دیں۔"

"ہوں۔ پتا کرتا ہوں۔" ولید نے فون بند کر دیا۔

ضمیر چچا نے وکیل کی بیٹی اغوا کروالی تھی۔ وہ ماتھے پر شکن ڈالے دیر تک وہیں کھڑا بس یہی سوچتا رہا کہ اگر واقعی یہ چچا کی حرکت ہے تو وہ اس معاملے کا پتا کیسے کروائے؟ ایک وقت تھا جب چچا کی فیملی کے ساتھ ان سب کے تعلقات بڑے آئیڈیل ہوا کرتے تھے اور یہ وہ وقت تھا جب اس کے بابا زندہ تھے۔ چچا کے بچوں سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ویسے بھی چچا لوئر دیر میں رہتے تھے اور دو بیٹے چترال اور اپر دیر میں۔ لوئر دیر میں چچا کی حویلی میں اس وقت گلباز ایک ایسا بندہ تھا جس سے ولید کو کوئی انفارمیشن مل سکتی تھی۔ گلباز بہت سال پہلے اس کے بابا کے گھوڑوں کی رکھوالی کرتا تھا۔ بعد میں ضمیر چچا نے اسے اپنے اصطبل بلا لیا۔ اب اسے گلباز سے کسی طریقے سے پتا کرنا تھا اور گلباز کی ایک کمزوری سے وہ بہت پرانا واقف تھا۔ اگر گلباز ابھی تک اس مسئلے سے دوچار تھا تو اس سے کام نکلوایا جا سکتا تھا۔

"سلام خان جی! کیسے ہیں آپ؟" گلباز نے بہت سال امیر جان کو دیے تھے۔ ولید خان ہر وقت باپ کے ساتھ رہتا تھا تو دونوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا تھا۔

"وعلیکم السلام، کیسے ہو گلباز؟ تم تو لوئر کے ہی ہو کر رہ گئے۔"

"نہیں نہیں خان جی! آتا رہتا ہوں۔"

"اچھا، واہ...... آتے بھی ہو اور اپنے خان جی سے ملنے کا دل تک نہیں کرتا۔"

"نہیں خان جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ بس آپ مصروف ہوتا ہے تو اس لیے۔" وہ جھینپ کر چپ ہو گیا۔ بڑے لوگوں سے بھلا کہاں ملنے جا سکتے تھے وہ۔

"تمہارا تو وہ زمین کا مسئلہ بھی تھا نا جو تمہارے سالوں نے زبردستی تمہاری بیوی کے نام کروالی تھی، پھر طلاق دلوا کر زمین پر قابض ہو گئے تھے؟" ولید کو سارا معاملہ ازبر تھا۔

"کہاں حل ہوا خان جی! سالے کہاں تھے، غنڈے تھے غنڈے۔ میری محنت کا رقبہ تھا خان جی! پورے دس ایکڑ زمین ہے، اتنی اچھی فصل دیتی تھی۔ آج بھی خون کے آنسو روتا ہوں۔" گلباز کو اپنا درد کیا یاد آیا، آواز بھی روہانسی ہو گئی۔ ولید خان نے مسکراہٹ روکی۔

"میں آج کل ذرا فارغ ہوں۔ تم کسی وقت ادھر آنا تو آرام سے اپنا مسئلہ مجھے بتانا، تیرے پچھلے سالوں کی کھنچائی تو بس ایک دفعہ کی مار ہے۔ زمین کے کاغذ تیرے ہاتھ پر لا کے رکھیں گے۔"

"سچ کہتے ہیں خان جی؟" وہ رونے والا ہو گیا۔

"لو، خان جھوٹ بولتا ہے کیا؟"

"نہیں نہیں خان جی! توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ بھی لگا رہا تھا۔

"اچھا گلباز! ایک پریشانی آ پڑی ہے۔ تمہاری تھوڑی مدد چاہیے لیکن دیکھو مجھ پر بھروسا ہے تو جو میں کام ذمے لگا رہا ہوں، اسے ویسے ہی کرنا ہوگا۔ ایک دوست کی مصیبت کا سوال ہے۔"

"جی جی خان! حکم کریں۔" اب وہ ہاتھ سینے پر رکھے کھڑا تھا۔

"وہ...... اپنے ضمیر چاچا کے ساتھ تو تمہیں معلوم ہے کچھ عدالت کی وجہ سے حالات گڑبڑ چل رہے ہیں، تو انہوں نے اپنا غصہ نکالا ہے بیچارے ایک غریب بندے پر۔ میں تو خدا ترسی میں اس کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی جوان بچی اغوا ہو گئی ہے۔ اسے شک ہے کہ ضمیر جان نے غصے میں ایسا کیا ہے۔ اب دیکھو، میرا تو چاچا کے ساتھ بہت عزت احترام کا رشتہ ہے۔ ان سے ڈائریکٹ پوچھنا تو گستاخی ہوگی اور کیا پتا چاچا نے ایسا کچھ کیا ہی نہ ہو...... سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی خان جی!" وہ موبائل کان سے لگائے پوری طرح متوجہ تھا۔

"میں تو خود چاہتا ہوں، ضمیر چاچا کسی لڑکی وغیرہ کے اغوا میں ملوث نہ نکلیں۔ کسی کی بہو بیٹی کا معاملہ تمہیں پتا ہے کتنا خطرناک ہو جاتا ہے۔ تم بس اپنے طور پر معلوم کر دو کہ کیا واقعی آج صبح کوئی لڑکی کہیں سے اغوا کی گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو بس چپکے سے مجھے بتا دینا۔ میں چاچا کے نام پر بھی آنچ

urdunovels.com

نہیں آنے دوں گا اور اس غریب کا مسئلہ بھی شاید حل ہو جائے۔ میں دونوں کی بھلائی چاہ رہا ہوں۔ سمجھ گئے نا تم؟"

"جی جی خان! میں سمجھ گیا۔ بس میں اپنے طریقے سے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" اس نے ولید خان کو تسلی دی اور کال بند ہو گئی۔ ولید نے اگلی کال دوبارہ وکیل کو ملا دی۔

"جبار احمد! حوصلہ رکھو۔ امید ہے کچھ گھنٹوں میں معلوم ہو جائے گا۔ بس بات کہیں باہر مت نکالنا۔ اگر معاملہ ہمارے خاندان کا ہے تو خاندان میں ہی رہے۔"

"جی خان! بس مجھے تو میری بیٹی صحیح سلامت واپس مل جائے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ تم چاچا سے کوئی رابطہ مت کرو اور محسوس بھی مت ہونے دو کہ تمہیں اس پر شک ہے۔ ہاں، اگر ان کی طرف سے کال وغیرہ آئے تو فوری طور پر بس منت سماجت کا رویہ اپنانا۔ باقی اس کی شرائط کیا ہیں، اس کو بعد میں دیکھتے ہیں۔" ولید خان نے کال کاٹی تو ماتھا شکنوں سے پُر تھا۔

وکیل کی بیٹی کا اغوا صرف وکیل کی مصیبت نہ تھی۔ یہ تو صاف صاف ولید کے لیے بھی خطرے کی گھنٹی تھی۔ معلوم نہیں اس کا چاچا لڑکی اغوا کر کے وکیل سے اپنا کون سا مقصد نکلوانا چاہتا تھا۔ اس میں تو نرا ولید کا بھی نقصان تھا۔ تو یعنی اب کچھ بھی کر کے لڑکی چاچا کے چنگل سے نکلوانا تھی۔

☆☆☆

جبار نے ولید خان کو کال ملانے کے بعد کے بعد دیگرے صباحت، ماریہ اور گل افشاں سے بھی رابطہ کیا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اگر وہ سب اپنے اپنے گھروں میں خیر و عافیت سے تھیں تو منشیات فروشی والے معاملے سے شکوک کچھ اور بھی کم ہو جائیں گے۔ ان تینوں لڑکیوں پر نورینہ کے اغوا کا معاملہ ظاہر کیے بغیر ان سے یہی پوچھا کہ انہیں اس منشیات ڈانے کیس کے بعد کسی قسم کے تھریٹ وغیرہ کا سامنا تو نہیں ہے؟ انداز بالکل معمول کی معلومات لینے جیسا تھا۔ ان سب نے بھی عام انداز میں لیا اور آگے سے تسلی دی۔ وہ سب اپنے گھروں میں خیر و عافیت سے تھیں اور اس سے جبار کا ضمیر جان پر شک کچھ اور مضبوط ہوا۔

اب اسے ولید خان کی کال کا انتظار تھا۔ جبار نے شام کے بڑھتے سایوں کو دیکھا تو بے اختیار ایک درد بھری آہ فضاؤں کے سپرد کی۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے فی الحال صرف دعا ہی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

مغرب کی اذان کہیں دور سے سنائی دے رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور وہی عورت ایک ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔ اس سے پہلے وہ سر درد کی گولی، چائے اور بسکٹ لے کر آئی تھی۔ نورینہ نے اس وقت بھی سوال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ گونگی بہری بن کر باہر نکل گئی تھی۔

"یہ لو، کھانا کھالو۔" اس نے ڈھکی ہوئی چنگیر نورینہ کے سامنے رکھ دی۔

"مجھے باتھ روم جانا ہے۔" نورینہ نے یہ بات پہلے سے سوچ رکھی تھی مگر اب اذان کی آواز سنی تو نماز کا خیال بھی آ گیا۔

"ہوں۔ آ جاؤ۔" وہ نارمل سا تاثر دیتی آگے بڑھ گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا بندوبست پہلے سے کر رکھا تھا۔

نورینہ باہر نکلی تو نقشے کی پہلی بار ٹھیک طرح سے سمجھ آئی۔ جس بلڈنگ میں وہ بند تھی، اس کا رخ تو سڑک کی طرف تھا لیکن اس کا کمرا اور روشن دان پیچھے والے کھیتوں میں کھل رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے وہ ایک برآمدے میں داخل ہوئے۔ یہاں لائن میں بہت سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ کوئی ہوٹل تھا، ریسٹورنٹ یا دکانیں تھیں۔ بہرحال جو بھی تھا، یہ اس کی پشت تھی۔ وہ عورت اسے اسی برآمدے کے کونے والے واش روم تک لے آئی۔ یہاں ہر چوتھی پانچویں کرسی پر ایک بندوق لیے بیٹھا تھا۔ وہ عورت کو غچا دے کر بھاگ بھی نہ سکتی تھی۔ کالی کالی خوفناک آنکھوں والے مرد لگا تار اسے گھورے جا رہے تھے۔ وہ واش روم میں گھس گئی۔

واپسی پر تیز نگاہوں سے ایک مرتبہ پھر دور دور تک جگہ کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا۔ اتنے سارے آدمیوں کی موجودگی میں تو وہ مکمل بے بس تھی۔ نماز کے بعد بس اللہ سے دعا ہی مانگتی رہی کہ وہی کوئی غیبی مدد بھیج دے۔ کھانا کھا کر اس نے کنڈی بھی اندر سے بند کر دی۔ چارپائی پر لیٹے آنکھیں پھاڑ کر چھت کو دیکھتے ہوئے بھی وہ اپنے کسی سوال کا جواب نہ ڈھونڈ پائی کہ اس کے ساتھ دراصل ہوا کیا تھا؟ اور ایسا تو شاید پچھلے کچھ عرصے سے اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں کہ آگے کیا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

ولید کی آنکھ صبح کی اذانوں کے وقت موبائل کی گھنٹی پر کھلی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کال گلباز کی جانب سے تھی۔

"ہاں گلباز! کہو، سب خیریت؟"

"جی جی خان! بس وہ کل سے آپ کے کام پر لگا ہوا

ہوں۔ خان جی کے خادموں میں میری شوکت سے اچھی سلام دعا ہے لیکن وہ سارا دن کہیں دکھائی نہیں دیا۔ لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا، خان جی کے کسی ضروری کام سے گیا ہے۔ میں نے شام تک انتظار کیا لیکن پھر مجھے شک ہونے لگا۔ گھر پر اس کی بیوی اکیلی ہوتی ہے۔ وہ تو کہیں اسے چھوڑ کر نہیں جاتا۔ تبھی اسے کال ملا لی۔ وہ سفر میں تھا۔ میں نے تو رقم ادھار مانگنے کا بہانہ بنایا۔ بس کہہ دیا دو ہزار چاہئیں۔ کہتا ہے گھر پہنچے تو آدھی رات ہو جائے گی، صبح لے لینا۔ خان جی ابھی نماز کے لیے گھر سے نکلا تو پہلے اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے پوچھا بھی کہ کہاں گئے تھے لیکن گول مول کر گیا، لیکن اسی وقت اسے ایک کال آگئی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا...... شعبان کے پاس اپنے چھ بندے تھے، انہی کو لگا دیا ہے۔ ابھی دن نکل آئے تو دوبارہ خبر لے گا وہاں کی۔ بس صاحب! ساری بات پلے پڑ گئی۔"

"ہیں...... اچھا...... اتنی سی بات سے کیا پلے پڑ گیا؟" ولید جان خود بھی متعجب تھا۔

"خان جی! یہ شعبان بڑے خان جی کی سرائے کا مالک ہے اور یہ سرائے یہیں دریا کے کنارے ہے۔ اسی دریا کے کنارے تو لڑکی کا اغوا ہوا ہے۔ یہ روڈ سیدھا اُدھر کو جاتا ہے اور یہ جو کہہ رہا تھا کہ چھ بندے لگا دیے ہیں تو ضرور لڑکی کی پہرے داری پر لگے ہوں گے...... اور یہ کہہ رہا ہے کہ کچھ دیر تک دوبارہ جائے گا اُدھر کی خبر لینے۔"

"ہوں۔" بات ولید کے پلے بھی پڑ گئی۔ اس نے کچھ سوچ کر خود کو سنبھالا۔ مقابل وہ تھا جو اسے ضمیر جان کا خیر خواہ سمجھ رہا تھا۔

"بہت مہربانی گلباز! بس تم اس معاملے پر سمجھو کہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں چاچا کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔ چلو تم بھی نماز پڑھو، میں بھی نماز کی تیاری کرتا ہوں۔" اس نے نہایت شیریں لہجے میں کہتے ہوئے گلباز سے جان چھڑوائی اور فوراً ہی ایک لائحہ عمل ترتیب دیتے ہوئے اگلی کال اپنے ایک آدمی کو ملا دی۔

☆☆☆

"خان جی! وہ لڑکی کا کیا کرنا ہے؟" شیر دل ڈیرا خالی ہونے پر ضمیر جان کے نزدیک آیا۔ ضمیر جان نے پچھلا تمام دن ڈیرے کے مہمانوں کے ساتھ ایک دم معمول کے مطابق ہی گزارا تھا تاکہ کسی کو بھی ان پر شبہ نہ ہو سکے۔ شیر دل کو البتہ بڑی دیر سے کھد بد لگی تھی کہ آخر خان جی چاہتے کیا ہیں۔ پورا ایک دن گزر گیا تھا۔ پچھلی صبح لڑکی کو اغوا کر کے سرائے پہنچایا گیا تھا۔

"خان جی! آپ نے اس وکیل کو دھمکی بھیجی؟" وہ مونچھیں سیدھی کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ضمیر جان نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"ابھی نہیں۔ ابھی ذرا اس وکیل کو تڑپنے دو۔ بیٹی کی جدائی میں اس کی حالت کچھ اور خراب ہوگی، تبھی تو ہماری بات مانے گا۔"

"خان پھر...... لڑکی کی جگہ؟"

"ہوں۔" اس مدعے پر تو ضمیر جان خود بھی رات سے سوچ رہا تھا۔ "دریا کے کنارے والی اس سرائے میں تو ہر وقت کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اغوا کا فیصلہ چونکہ بہت ہی اچانک کیا تھا تو فوری طور پر وہی جگہ مناسب تھی۔ اس وقت لڑکی کو لے سفر کے رسک سے بچانا تھا تاکہ کوئی تعاقب کرتا ہوا نہ پہنچ جائے۔

"تم ذرا شفیق سے میری بات کرواؤ۔ زمین پر جو ہمارا فارم ہاؤس ہے، ادھر تو نہیں، اس کے عین پیچھے شفیق کا رقبہ بھی ہے اور چھوٹا سا مکان بھی۔ وہ جگہ ٹھیک رہے گی۔ گھر والوں میں سے کسی کو پتا نہ چلے۔ بس شفیق سے کہو، خود ہی لینے کے لیے نکلے۔"

"خان جی! اس طرح تو وقت ضائع ہو جائے گا۔ اگر میں وہاں تک چھوڑ آؤں؟"

"نہیں۔ تم تو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہو۔ تمہارا تعاقب ہو سکتا ہے۔ شفیق کو یہاں کوئی نہیں جانتا، وہ سیدھے سرائے سے نکال لے جائے گا۔"

"تو خان جی...... ! کر دوں فون؟"

"ہاں، تم ہی سمجھا دو اسے ہر بات۔ اسے کہو وہاں جگہ تیار کر کے آئے۔ ادھر بھی ایک عورت ضروری ہے، پھر یہاں سے لڑکی لے جائے اور ایک دو گھنٹے میں نکل پڑے۔"

"صحیح ہے خان جی!" وہ کال ملاتا ہوا اسی وقت سامنے سے چلا گیا۔

☆☆☆

"اے لڑکی!" عورت نے کندھے پر زور سے ہاتھ کا دھکا دیا تو نورینہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ صبح نماز کے وقت اس عورت نے دروازہ بجا کر نورینہ کو جگایا تھا، جب وہ واش روم بھی گئی اور وضو کر کے واپس آئی لیکن نماز کے بعد لیٹی تو اسے دوبارہ گہری نیند آگئی۔ اس مرتبہ دروازہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ وہ عورت کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ناشتا لے کر آئی تو نورینہ بے سدھ پڑی تھی۔

urdunovels.com

"۔۔۔ ناشتا کر لو...... پھر چلنا ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟" اس کی آنکھوں میں حیرت پھیلی تھی۔

"وہ ہم کو نہیں معلوم۔ تم جلدی کرو۔" وہ اسی بیزاری سے کہہ کر واپس لوٹ گئی۔

نورینہ کا دل بڑے زور سے دھڑکا، ایک ڈر سا اندر پیدا ہوا کہ شاید یہ وہ منزل نہیں تھی۔ لیکن اگر کہیں اور بھی جا رہی تھی تو اگلی جگہ پر اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ نہ جانے اس کے بابا اس کے لیے کیا کوششیں کر رہے تھے۔ آخر کوئی اس تک پہنچ کیوں نہیں رہا تھا؟ اس نے انجی اَجھی سوچوں میں نہایت بے دلی سے ناشتا کیا اور بالوں کو انگلیوں سے اکٹھا کر کے ہیئر بینڈ لگایا اور سر پر اچھی طرح چادر اوڑھ لی۔ اسکارف اب اس نے گلے میں فولڈ کر کے ڈال لیا تھا۔ سامان تو اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ ہر چیز تو وہیں دریا کنارے پڑی رہ گئی تھی۔

وہ چارپائی پر بیٹھی بے چینی سے انگلیاں چٹخا رہی تھی جب دروازہ کھلا اور بندوقیں لیے دو مرد دروازے پر آئے۔ نورینہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو۔" اس نے اشارہ کیا۔ نورینہ کو کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ڈرتے ڈرتے ساتھ چل پڑی۔ دروازے کے باہر والے کچے راستے پر ہی ایک بڑی سی کالی گاڑی کھڑی تھی۔ انہوں نے بندوق کے بٹ سے اس کی پیٹھ پر دھکا دیتے اسے پچھلی سیٹ پر بٹھایا۔ ایک آدمی کی طرف کالی سی ایک چیز اچھالی، وہ پچھلی سیٹ پر دوسری کھڑکی کے پاس پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ نورینہ جھجک کر فاصلہ رکھ کر بیٹھی تھی۔ کن انکھیوں سے اُدھر دیکھا تو آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس آدمی نے نورینہ کے دیکھتے ہی دیکھتے کالا برقع پہن لیا۔ ہاتھوں پر باریک کالے دستانے چڑھائے اور پیروں میں اس نے پہلے ہی ایک زنانہ چپل پہن رکھی تھی۔ اسی آدمی نے ایک تھیلا نورینہ کی گود میں پھینکا۔

"تم بھی جلدی سے یہ پہن لو۔" نورینہ نے تھیلے کو کھول کر دیکھا تو اس میں بھی ایک کالا برقع تھا۔ نورینہ نے حیرت سے آدمی کی طرف دیکھا۔

"جلدی کرو...... اور اپنی یہ سفید چادر نکالو۔" اس نے گھور کر دیکھا تو نورینہ نے جلدی سے برقع اپنے اوپر اوڑھ لیا۔ پہن لینے کے بعد اندر سے چادر کھینچ کر لپیٹنے لگی لیکن اس آدمی نے چادر چھین کر باہر کھڑی اس پٹھان عورت کی طرف اچھال دی۔

"اسے اپنے گھر میں کہیں چھپا دو۔ لڑکی کی تلاش کے لیے بھی نشانی دی ہوئی ہوگی...... جاؤ۔" اس نے عورت کو اندر جانے کا اشارہ کیا تو اس نے گھبرا کر سر ہلایا اور چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دوسرا آدمی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔

یہ بہت شاطر لوگ تھے۔ اگر روڈ پر اس کی تلاش ہو رہی تھی تو اس طریقے سے آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ آدمی نے ... شیشوں پر کالی جالیاں بھی لگا لی تھیں۔ نورینہ حیران تھی کہ اسے اتنے آرام سے بٹھا رکھا تھا۔ اسے تو ڈر تھا کہ دوبارہ بے ہوش کر دی جائے گی۔ کھڑکی سے جب کہیں دریا دکھائی دے جاتا تو اسے بھی سمت کی سمجھ آجاتی۔ اسے دریا سے مزید دور لے جایا جا رہا

ابن شمشیر

نادر شاہ نے دلی فتح کر لی تھی۔ مفتوح مغل بادشاہ محمد شاہ شکست تسلیم کر چکا تھا۔ نادر شاہ نے اس سے عزت و احترام کا سلوک کیا۔ دونوں میں دوستی ہوگئی۔ دوستی کو تقویت دینے کے لیے محمد شاہ نے اپنی بیٹی کی شادی نادر شاہ کے لڑکے نصر اللہ سے طے کر دی۔ نکاح کے موقع پر دلہن والوں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ دولہا کا شجرہ نسب ساتویں پشت تک سنایا جائے۔ فاتح نادر شاہ یہ سن کر جلال سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے دولہا کا شجرہ شروع کیا۔ "نصر اللہ ابن نادر شاہ ابن شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر ابن......"

(عقیل عباس جعفری کے خزینے سے)

(مرسلہ: عمار علی، ملتان)

ادائیگی

نیویارک کے ایک ہوٹل میں رات کے دو بجے آخری گاہک اپنی میز پر سر رکھ کے سو رہا تھا۔ صفائی کرنے والی عورت نے مالک سے پوچھا۔ "میں نے آپ کو پانچ مرتبہ اس آدمی کو اٹھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ اسے نکال کیوں نہیں دیتے؟"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" مالک نے جواب دیا۔ "میں جب بھی اسے اٹھاتا ہوں، یہ بل مانگتا ہے اور ادا کر کے پھر سو جاتا ہے۔"

(مرسلہ: خالد بٹ، لاہور)

تھا۔ دریا کے رخ سے اس بات کو سمجھنا آسان تھا۔

کچھ دیر بعد ایک ٹول پلازا آیا۔ وہاں کچھ پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک پولیس والے نے اندر آ کر جھانکا اور اسی بے پروائی سے واپس بھی پلٹ گیا۔ نورمینہ بے بسی سے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔ اب وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ اسے بے ہوش کیوں نہیں کیا گیا۔ اس روڈ پر یقیناً چیکنگ جاری تھی۔ وہ اگر بے سدھ پڑی ہوتی تو مشکوک لگ سکتی تھی۔ نورمینہ کا دماغ اب سنجیدگی سے ان خطوط پر سوچ بچار کرنے لگا تھا۔ اسے بے ہوش نہ کرنا اگر ان لوگوں کی مجبوری تھی تو وہ ان کی اس کمزوری سے فائدہ کیوں نہ اٹھائے۔

اس نے سامنے دیکھا۔ گاڑی اب لمبی سڑک پر تیزی سے دوڑتی جارہی تھی۔ دور دور تک فی الحال تو صرف روڈ ہی نظر آرہا تھا۔ اس نے دماغ میں پلان کرنا شروع کیا کہ اگر اگلی مرتبہ کوئی پولیس والا اندر جھانکے گا تو وہ نہایت پھرتی سے کیسے اپنا مدعا بیان کرے کہ دشمن اپنی چال نہ چل سکے۔ اگر پولیس والا اس کی ونڈو سے اندر جھانکے تو وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر تیزی سے اسی کی پشت پر جا کھڑی ہو۔

''اے اللہ! کاش...... کاش ایسا ہی ہو۔'' وہ برقع کے اندر بھی دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں کھولے بیٹھی تھی۔ نظریں پوری توجہ سے سامنے سڑک پر جمار کھی تھیں۔

''پیچھا ہو رہا ہے۔'' ڈرائیونگ سیٹ والے نے اچانک ہی کہا تو ساتھ والے مرد اور نورمینہ دونوں نے بیک وقت پیچھے دیکھا۔

''کیا کرنا ہے؟'' برقع پوش مرد نے سخت گھبرائی ہوئی آواز میں ڈرائیور سے دریافت کیا لیکن وہ ایک دم چپ بیٹھا تھا۔

نورمینہ کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ ضرور اس کے بابا کی مدد آگئی ہے۔ ضرور یہ پولیس والے ہوں گے۔ اس کا وجود اب یہ سوچ کر کانپ رہا تھا کہ وہ اسے جان سے مارنے کی کوشش نہ کریں۔ اس نے ڈرائیور کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔ دونوں مرد بڑے ہی پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

''کال ملاؤ، خان جی کو کال ملاؤ۔ جلدی ان کو بتاؤ۔'' ڈرائیور نے مشورہ دیا تو ساتھ والے آدمی نے موبائل نکال کر کال ملادی۔

''یس...... سلام خان جی! خان، ہمارا پیچھا شروع ہو گیا ہے۔ ایک فور بائی فور مین پیچھے چل رہی ہے۔ کبھی کبھی بالکل سر پر پہنچ جاتی ہے۔'' وہ اب تیز سا ہو کر ایسے بیٹھا تھا کہ ساتھ ساتھ پیچھے بھی دیکھ رہا تھا۔

''خان جی! ابھی تو لگتا ہے گاڑی ٹکرانا چاہتے ہیں ہماری گاڑی سے۔'' ساتھ والے بندے کی آواز بھی گھگیا سی گئی تھی۔

''جی جی خان! او کے خان۔'' اس نے آگے ہو کر موبائل ڈرائیور کے حوالے کیا۔

''جی خان! اسپیڈ تیز ہے۔ سمجھ گیا خان! آگے نہیں نکلنے دوں گا۔ ہاں خان۔'' اس نے موبائل سائڈ پر پھینکا اور اسپیڈ کچھ اور تیز کردی۔ نورمینہ نے پلٹ کر دیکھا۔ دوسری گاڑی قدرے پیچھے رہ گئی تھی۔ اس کا دل بھی مایوسی سے بھر گیا۔

سڑک پر اس وقت ٹریفک معمول سے بہت کم تھا۔ یہ دن کے قریب دس بجے کا وقت تھا۔ پردے کے اندر سے نورمینہ برابر سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس وقت دور تک روڈ پر سامنے سے کوئی ٹریفک آتا دکھائی نہ دے رہا تھا۔ پیچھے والی گاڑی بھی شاید ایسے کسی موقع کی تلاش میں تھی، تبھی اس کی اسپیڈ ایک دم تیز ہوئی اور اس نے اچانک ہی ان کی کار کو آگے آ کر ایسے روکا کہ ڈرائیور اگر پوری طاقت سے بریک نہ لگاتا تو زور سے جا کر اگلی سے ٹکرا جاتے، لیکن بریک اس شدت کا تھا کہ نورمینہ نے بے ساختہ اگلی سیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ کچھ دیر تو اپنے حواس یکجا کرنے میں لگی رہی۔ سر بھی چکرا گیا تھا۔ ان کی کار بریک لگنے سے اب مکمل رک گئی تھی۔

نورمینہ نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو منہ حیرت سے کھل گیا۔ بیچ سڑک پر پانچ اونچے لمبے مرد بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ پھر دو پھرتی سے دائیں بائیں سے ہو کر آگے آئے۔ پچھلا دروازہ کھول کر ایک نے نورمینہ کو دوسرے نے دوسرے برقع پوش کو باہر نکالا۔ ڈرائیور نے شاید ہتھیار نکالنے کی کوشش کی تھی کیونکہ سامنے کھڑے تین آدمیوں میں سے ایک کی رائفل سے گولی نکلی اور کار کا شیشہ توڑتے ہوئے اس آدمی کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ فضا ایک دلدوز چیخ سے گونج اٹھی۔ دائیں ہاتھ کے مرد نے اس دوسرے برقع پوش کی اونچی لمبی عجیب سی ہیئت دیکھ کر اس کی نقاب الٹ دی تھی۔

''یہ تو مرد ہے۔'' اس نے پیچھے مڑ کر کسی کو بتایا اور تبھی دوسرے کو بھی کچھ خیال آیا۔ اس نے فوراً نورمینہ کی نقاب اوپر کی۔

''لڑکی مل گئی باس!'' اس نے بنا کوئی نام لیے اگلے کو

UrduNovels.com

مطلع کیا اور ماحول میں پھر ایک فائر کی آواز گونجی۔ نورینہ نے بے ساختہ ہاتھ کانوں پر لگا کر دائیں جانب دیکھا۔ دوسرے برقع پوش کو بھی مار دیا گیا تھا۔ وہ بری طرح دہل بھی گئی۔ اس کے ساتھ چلتا آدمی مضبوطی سے اس کی کلائی تھامے اسے کھینچتا ہوا دوسری کار تک لے گیا۔ بھی مرد آناً فاناً کار کے اندر بیٹھ گئے اور اسی پھرتی سے اسے اسٹارٹ کر کے مزید آگے بڑھ گئے۔

"اس روڈ پر آگے بڑھنے میں اب خطرہ ہے۔ میں آگے سے ایک گاؤں کو مڑتے ہوئے چھوٹا روڈ لوں گا۔ کال پر اطلاع دے دو۔" ڈرائیور نے مبہم انداز میں کہا تو اس آدمی نے فوراً کال ملائی۔

"پہلے اسے بے ہوش کرو۔" فرنٹ سیٹ پر بیٹھے آدمی نے پیچھے مڑ کر آرڈر دیا تو نورینہ مزاحمت کے انداز میں ہاتھ چلاتی رہ گئی لیکن ساتھ والے آدمی نے رومال سے اس کا منہ بری طرح دبا کر چند لمحوں کے اندر اسے بے سدھ کر دیا تھا۔

☆☆☆

اسجد کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ وہ کھڑکی سے پردہ ہٹا کر سویا تھا، اس لیے دن کی روشنی اندر تک آرہی تھی۔ اس نے ہڑبڑا کر موبائل میں وقت دیکھا۔ رات اسے نیند آتے قریب تین بج گئے تھے، تبھی صبح آنکھ بھی وقت پر نہ کھل سکی تھی۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بجے تھے۔ اس نے چپلیں پہن کر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ کسی قسم کی کوئی کارروائی، کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ اسجد کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے سوچنے کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں لیا اور وہ چھپٹے مار کر فی الفور نیچے اتر آیا۔ حتیٰ کہ بنا کسی مصلحت کو مدنظر رکھے سیدھا ہی پچھلے حصے کی طرف آگیا، لیکن اس جانب واقعی پر ہول خاموشی سے واسطہ پڑا جو کہ اسجد کو مزید ڈرا رہی تھی۔

وہ تیز قدموں سے تھوڑا اور آگے آیا تو یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ کل تک جس کچے کمرے کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا وہ مکمل کھلا پڑا تھا۔ وہ پٹھان عورت اس کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اسجد کی تیز نگاہوں نے سامنے رکھی چارپائی اور ایک رسی فوراً دیکھ لی۔ رسی نے نہ صرف چونکایا بلکہ ادھوری کہانی کو مکمل کرنے میں پورا کردار ادا کیا اور عورت کی بغل میں دبی سفید چادر بھی بلاشبہ اسی لڑکی کی تھی۔ اب کسی کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا کہ وہ لڑکی ہی اس کمرے میں قید تھی پر اب نہیں تھی۔ اس نے ذہن میں کچھ ترتیب دیا اور

اس عورت کی پشت پر آیا۔

"اے ترور (خالہ)! لڑکی کو بھیج دیا؟ بڑا صاب پوچھ رہا ہے۔" اس نے ہتھیلی پر دھرے موبائل کی طرف ابرو سے اشارہ کیا جیسے ابھی ابھی صاب کی کال آئی ہو۔

"آں......؟" عورت نے ہونقوں کی طرح آنکھیں اور منہ کھول کر اسجد کو دیکھا۔ وہ کسی اناڑی کی طرح اچانک اس کی پشت پر آیا تھا۔ عورت نے رک کر سوچا پھر سر ہلا دیا۔ اسجد کے اعتماد نے اسے کسی شک میں پڑنے ہی نہیں دیا۔

"ہوں...... کب نکلے؟ جلدی بتاؤ، صاب کی کال آنے والی ہے۔"

"بس ابی ابی نکلا ہے خان!" اس نے ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کیا۔ اسجد نے اشارے پر غور کیا۔

"پیچھے کی طرف کر گئے؟" اس نے پھر ابرو تان کر روکھے لہجے میں دریافت کیا۔

"زیادہ نہیں معلوم، خان بس اس طرف گیا ہے۔" اس نے پھر روڈ پر آگے کی جانب اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ مالاکنڈ روڈ پر مزید آگے یعنی اپر دیر کی جانب...... اور اسجد کے پاس اتنا وقت بھی کہاں تھا۔ وہ بھاگنے کے انداز میں کمرے میں آیا، جلدی جلدی سامان سمیٹ کر ایک نظر خالی کمرے کو دیکھا اور دوڑتے ہوئے اپنی کار تک پہنچا۔ ریسیپشن پر ایک نیا آدمی کھڑا تھا۔ ادائیگی وہ چند ہی گھنٹوں کی پہلے ہی کر چکا تھا۔ بیگ لیے کار تک پہنچا اور کار اسٹارٹ کر کے اپر دیر کی طرف تیزی سے دوڑا دی۔ پیچھے والے بھاڑ میں جائیں، ابھی دھیان ان باتوں کی طرف نہیں تھا۔

وہ کار دوڑاتا کسی طرح اس کار تک پہنچنا چاہتا تھا جو ابھی ابھی اس لڑکی کو لے یہاں سے نکلی تھی۔ اسپیڈ بھی اتنی زیادہ تھی تاکہ وہ درمیانی فاصلے کو کسی طرح پاٹ سکے، لیکن قریب آدھے گھنٹے بعد ہی اسے اپنی کار بریک لگا کر روکنا پڑ گئی۔ سامنے حادثہ ہوا تھا۔ تارکول کی سڑک لہولہان تھی، دو آدمی خون میں لت پت پڑے ہوئے تھے۔ کچھ ٹریفک قریب سے گزرتی جا رہی تھی۔ ایک آدمی زنانہ برقع میں پڑا تھا۔ جسے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ اس نے قریب کھڑے ایک گھبرائے ہوئے شخص سے دریافت کیا۔

"کیا ہوا؟" وہ اس آدمی تک پہنچا۔

"بس، ابھی ابھی کچھ آدمیوں کو دیکھا۔ سڑک کو گھیر کر کھڑے تھے۔ گولیاں چلیں اور ایک لڑکی کو لے دوڑ گئے۔"

وہ آدمی اس صورت حال سے بری طرح متاثر لگ رہا تھا۔

"آپ کو یہاں نہیں رکنا چاہیے، بلاوجہ تفتیش میں

پھنس سکتے ہیں۔'' اسجد نے واپسی کے لیے کار تک دوڑتے اسے مشورہ دیا اور کار چلا کر تیزی سے آگے بھاگا۔ حادثے کی نوعیت دیکھ کر صاف سمجھ آرہی تھی کہ وقوعہ ابھی ابھی ہوا ہے۔ کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ وہ آدمی بھی اس کی بات سمجھ کر فوراً اپنی کار تک پہنچا تھا اور اب اسٹارٹ کر رہا تھا۔

''وہ کار کیسی تھی جو لڑکی کو لے گئی؟'' اسجد نے سر باہر نکال کر اس آدمی سے اونچی آواز میں سوال کیا۔

''فور بائی فور تھی۔'' اس نے جلدی سے بتایا تو اسجد نے ماتھے تک سیلیوٹ لے جاتے کار آگے بڑھا دی۔ غنیمت رہی کہ وہ دوسرا بندہ مخالف سمت کو جا رہا تھا۔ اسجد نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اب سڑک پر دو لاشیں، ایک کار کھڑی تھی۔ دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

''خان جی! لڑکی ہمارے قبضے میں آچکی ہے۔ پیچھا ورز نے تھوڑا آگے قابو کیا ان کو۔ اب ہم باب کرات سے ایک پرانی بروڈ کو مڑ گئے ہیں۔ مین روڈ پر پکڑ میں آنے کا خطرہ ہے۔ پیچھے ضمیر خانا کی جیپ اور دو آدمی مارے گئے۔ وہیں روڈ پر چھوڑنا پڑا سب۔''

''ٹھیک ہے، اس روڈ پر جو پہلا گاؤں ہے، وہاں ایک جگہ چھپنے کی ہے۔ فوری طور پر وہاں پہنچو پھر بتاتا ہوں۔'' ولید نے جلدی سے کال منقطع کر کے دوسرا نمبر ملایا۔

''نوازش! ڈیرے پر جلدی سے جگہ خالی کرواؤ۔ ابھی دس پندرہ منٹ میں ایک گاڑی پہنچ رہی ہے۔ ادھر کار تبدیل کرنی ہے۔ بس کچھ گھنٹے کا مسئلہ ہے۔ فوری طور پر اس فور بائی فور کو چھپانا ہے۔ میں ایک سامان والا ٹرک بھجواتا ہوں۔ اس میں پیچھے بے ہوش لڑکی کو آسانی سے چھپا کر یہاں لایا جاسکتا ہے۔ فور بائی فور کو فی الحال دو تین دن اپنے ڈیرے میں چھپا رہنے دینا۔''

''جی خان! جو حکم۔'' نوازش نے ہدایات غور سے سنیں اور کال منقطع ہو گئی۔

☆☆☆

اسجد کار کو بھگاتا ابھی دس پندرہ منٹ ہی آگے آیا تھا کہ ایک بڑا موڑ آگیا۔ یہاں سے ایک روڈ تو مڑ کر اپر دیر کو جا رہا تھا مگر دوسری ایک ذیلی سڑک تھی جو چھوٹی بستیوں کو جا رہی تھی۔ اسجد نے پیچھے حادثے والی جگہ کو دماغ میں رکھتے ہوئے سوچا کہ جب لڑکی کو لے کر کار یہاں پہنچی ہوگی تو صرف یہی وہ راستہ ہے جسے مین روڈ سے بچنے کے لیے منتخب کیا جاسکتا ہے۔ بڑے روڈ پر تو جگہ جگہ چیک پوسٹیں بنی تھیں۔ حادثے کی اطلاع ملتے ہی فور بائی فور کو روک لیا جانا بہت آسان تھا۔ اس نے زیادہ نہ سوچتے ہوئے کار کو ادھر موڑ دیا لیکن پہلا گاؤں آنے پر ہی اس نے کار روک دی۔ یہ جاننا اب بہت ہی مشکل تھا کہ وہ ان آبادیوں میں سے کس آبادی کو گئے ہوں گے یا پھر آگے کہیں نکل گئے ہوں گے۔

تھوڑا پیچھے ہی ایک پرانا سا ڈھابا گزرا تھا۔ اسجد کار ٹرن کر کے وہاں واپس آیا۔ ڈھابے والوں سے فور بائی کا پوچھا تو ایک لڑکے نے ''ہاں'' میں سر ہلاتے ہوئے سامنے والی پہلی آبادی کی طرف اشارہ کیا کہ ادھر ایک بڑی گاڑی ابھی کچھ دیر پہلے ہی مڑی ہے۔ اسجد کو یقین ہو گیا کہ وہ بالکل صحیح جا رہا ہے۔ وجہ بھی یہ تھی کہ وہ حادثے کے چند منٹ بعد ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ زیادہ دیر ہو جاتی تو کامیابی سے پیچھے جانا قطعی ممکن نہ رہتا۔ وہ کار دوڑا کر تیزی سے دوبارہ اس گاؤں کے موڑ تک آیا۔ یہاں نکڑ پر صرف ایک پرانی ورکشاپ تھی جو بند پڑی تھی۔ البتہ وہاں ایک پرانی کار، ایک ٹرک کا بوسیدہ انجن، کچھ لٹکے ہوئے ٹائر وغیرہ کی وجہ سے اس نے بھی اپنی کار وہیں روک دی اور خود باہر نکل آیا۔ کار سمیت گاؤں میں داخل ہونے کے بجائے وہ سر پر چترالی ٹوپی اور کندھے پر شال ڈالے پیدل ہی اس راستے پر چل پڑا۔

کچی سڑک پر موٹے ٹائروں کے نشان بہت واضح تھے۔ نشانات کا پیچھا کرتے ہوئے وہ کافی آگے تک آگیا اور اب اس نے دیکھ لیا تھا کہ ٹائروں کے نشان ایک بڑے مکان میں غائب ہو رہے تھے۔ گیٹ بند تھا اور آس پاس کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ عام انداز میں چلتا ہوا واپس آیا اور کار میں بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تو نہیں تھا کہ لڑکی کو یہاں لانے کا مقصد کیا ہے لیکن یہ پورا یقین تھا کہ وہ پہنچا بالکل ٹھیک جگہ پر ہے۔

☆☆☆

''اوپر بڑے روڈ پر آپ کی ایک گاڑی کو حادثہ پیش آیا ہے۔ آپ کے دو خادم مارے گئے۔ کیا آدمیوں کے پاس کوئی بھاری رقم وغیرہ تھی؟'' اے ایس آئی نور زمان بغور ضمیر جان کو دیکھ رہا تھا۔ ضمیر جان نے خود کو بااعتماد ظاہر کرتے ہوئے کندھے اچکائے۔

''ایسا تو کچھ نہیں تھا۔ بس روٹین کے کام سے اپر دیر جا رہے تھے۔ وہاں ہماری دوسری حویلی ہے۔ یہ تو روز کا آنا جانا ہے۔''

"آپ کا یہ ملازم...... کیا نام ہے...... ہاں، شفیق...... یہ تو اوپر چترال سے آیا تھا۔ شاید ادھر ہی رہتا ہے، دوسرا بندہ بھی وہیں سے ہے؟"

"ہاں، وہ ہمارا زرعی رقبہ ہے نا ادھر، تو کچھ حساب کتاب کے معاملات تھے۔ مجھے لگتا ہے شاید شفیق کی کوئی ذاتی دشمنی ہوگی جس کا اس نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔" ضمیر جان کو یہ پولیس والا تو اب زہر لگ رہا تھا۔ واقعے کی رپورٹ چونکہ ٹریفک پولیس والوں کی طرف سے تھانے میں لکھوائی گئی تھی، اس لیے وہ تحقیقات کرنے آئے تھے۔

"آپ کو کسی پر شک تو نہیں ہے؟" نور زمان ابرو بھینچے ان کی کم گوئی پر غور کر رہا تھا۔ یہاں کے سرداروں کے غصے سے تو پولیس والے بھی گھبراتے تھے۔ یہ ضمیر جان کنی کترانے جیسا رویہ کیوں اپنا رہا تھا؟

"آں...... نہیں، مجھے تو کوئی تازہ ترین ایسی بات یاد نہیں آ رہی۔"

"ہوں...... لیکن واقعہ چھوٹا موٹا تو نہیں ہے۔ آپ نے پولیس میں رپورٹ درج کیوں نہیں کروائی؟" نور زمان بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا۔

"دیکھیں، ابھی ابھی تو بات میرے علم میں آئی ہے۔ میں خود سوچ بچار میں ہوں۔ میرے دو بہت کام کے بندے مار دیے گئے ہیں۔ ذہن کچھ بھی سوچ نہیں پا رہا۔"

"ہوں...... اپنے آنے جانے کا بھی خوب خیال رکھیے۔ حالات آپ کی توقع سے زیادہ کشیدہ ہیں۔" نور زمان نے آخری جملہ جان بوجھ کر کہا تھا۔ اگرچہ اس کے علم میں ابھی تک کوئی مشکوک بات نہ آئی تھی لیکن وہ تو بس ضمیر جان کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا، اور وہی ہوا۔ ضمیر جان اس کی بات پر بری طرح چونکا تو تھا ہی، فوری طور پر کوئی سوال بھی نہیں کر پایا اور سوال نہ پوچھنا ہی اس کے ملوث ہونے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ نور زمان کا تو مقصد ہی یہی تھا۔ وہ ایک ہنکارا بھرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ولید نے ڈیرے میں مقامی پولیس آفیسر سلیم وزیر کو داخل ہوتے دیکھا تو لگا جیسے خشک ہو گیا۔ یہ اپر دیر کی پہاڑی پر موجود ولید کی ذاتی رہائش گاہ تھی۔ شفیق کی کار کا حادثہ لوئر دیر اور اپر دیر کی درمیانی سڑک پر ہوا تھا۔ وہ اس وقت ڈیرے پر کچھ مہمانوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ولید نے اٹھ کر سلیم سے مصافحہ کیا اور مسکرا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ولید کو مصروف ہوتے دیکھ کر اس کے مہمان جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آئیے سلیم صاحب! آج کیسے یاد فرمایا، کہیں آس پاس آئے ہیں کیا؟" ولید نے حتی الامکان اپنا لہجہ معتدل رکھا، ساتھ ہی ایک ملازم کو آواز دے کر تازہ چائے بنوانے کا آرڈر دے دیا۔

"ہاں خانا! ابھی بھیجیں۔ آپ کو بھی معلوم تو ہو گیا ہوگا، آپ کے چچا ضمیر جان کے بندوں کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا ہے؟"

"نہیں تو۔ کب کی بات ہے؟" ولید نے چونک کر آگے ہوتے ہوئے بھرپور ایکٹنگ کا مظاہرہ کیا۔ "اصل میں کچھ خاندانی رنجشیں ایسی بڑھ گئی تھیں، اب تو بالکل ہی کم رابطہ ہو پاتا ہے۔ پھر وہ لوئر دیر میں ہوتے ہیں۔ خیر تو ہے...... کیا ہوا؟"

"ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے ضمیر جان کے دو بندے فور بائی فور میں اسی روڈ پر آ رہے تھے۔ پیاوڑ کے پاس مین روڈ پر انہیں گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ سڑک سے لاشیں ملیں، آس پاس سے کوئی عینی شاہد بھی نہیں ملا۔ مارنے والے کون تھے، کہاں نکل گئے؟ پتا لگانا بہت مشکل ہو رہا ہے۔"

"چچا کیا کہتے ہیں؟" ولید نے چہرے پر تشویش کا تاثر اوڑھا...... جیسے یہ سب سن کر دلی رنج اور صدمہ پہنچا ہو۔

"ابھی تو اصل پرابلم یہی ہوئی ہے۔ وہ اپنے نور زمان صاحب ہوتے ہیں نا ادھر، ان کی ان سے بات ہوئی۔ بتا رہے تھے ضمیر جان جیسے کچھ چھپا رہا ہے۔ آپ سے بھی جاننے آیا ہوں کہ کیا وہ اپنے ہی بندوں کے مارنے میں ملوث ہو سکتا ہے؟"

"آں......!" ولید نے ڈاڑھی کھجائی۔ "ہونے کو تو کیا نہیں ہو سکتا سلیم صاحب! ہے نا؟"

"ہاں بھئی، وقت ہی بڑا ظالم آ گیا ہے۔" وہ ہنس دیا۔ "بندوں کے نام بتا سکتے ہیں، شاید کچھ مدد کر سکوں۔" ولید اب جیسے سرکار کے تعاون پر مکمل آمادہ تھا۔ سلیم سر کو دیکھنے کے بعد جو گھبراہٹ اندر پیدا ہوئی تھی، ابتدائی باتوں کے بعد زائل سی ہوئی تو اعتماد بھی خود بخود بحال ہونے لگا۔

"ہاں۔ یہ دو آدمی تھے، شفیق اور مراد...... اوپر چترال سائڈ سے آئے تھے۔ ضمیر جان کے اپنے ہی ملازم ہیں۔ اسی سے مل کر واپس جا رہے تھے لیکن مین سڑک پر آخر کیوں انہیں قتل کر دیا گیا؟"

"ہوں...... بات تو عجیب ہے۔ تو ادھر چترال پولیس سے بھی رابطہ ہوگا، وہاں مقتولین کے گھر والوں نے بھی

urdunovels.com

رپورٹ تو کروائی ہو گی؟"
"ہاں، ادھر بھی رابطے میں ہیں ہم۔ وہ بھی کسی ذاتی دشمنی کی بات پر زیادہ کچھ نہیں بتا پا رہے۔ کنیز کے بیٹے نے بتایا کہ ضمیر جان نے اچانک ہی اس کے باپ کو بلا بھیجا تھا اور وہ بڑی ایمرجنسی میں گھر سے نکلا تھا، لیکن اب ضمیر جان کہتا ہے کہ ملازمین کا آنا تو روز کا معمول ہے۔ شک تو کسی نہ کسی طور ضمیر جان پر ہی جا رہا ہے۔"
"ہوں...... لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔" ولید نے بھی سر ہلایا اور سلیم وزیر اٹھ کھڑا ہوا۔
"ارے سر! چائے آ گئی ہے، پلیز۔" ولید نے زبردستی واپس بٹھا کر اسے چائے پلائی۔ سر سے بہت بڑا بوجھ ہٹا تھا۔ سلیم صاحب اس سے ضمیر چاچا کی بابت کچھ جاننے آیا تھا اور اچھا ہی ہوا کہ آ گیا۔ ولید کو آگے کا لائحہ عمل ترتیب دینا آسان ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"جی سر! السلام علیکم۔" جبار نے سب انسپکٹر فیصل کی طرف سے کال آتی دیکھی تو بس چند سیکنڈز ہی سوچنے میں لیے اور کال اٹھالی۔
"جی جبار صاحب! کیسے مزاج ہیں؟"
"الحمد للہ! سب خیریت۔" اس نے اپنے لہجے کو کسی حد تک بشاش بنانے کی کوشش کی۔
"کیا بنا آپ کی بیٹی کے معاملے کا؟ دوبارہ تو آپ نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔"
"آں...... جی وہ بیٹی گھر واپس آ گئی ہے۔" جبار کی پیشانی یہ جھوٹ بولتے عرق آلود ہوئی۔ دل کسی اتھاہ گہرائی میں جا ڈوبا تھا۔ وہی جانتا تھا کہ وہ کس مشکل سے یہ جھوٹ بولنے پر تیار ہوا تھا۔ ولید جان نے منع کر دیا تھا تو جبار کو بھی کہنا پڑا۔
"اوہ...... اچھا۔ بتایا نہیں آپ نے۔ کہاں تھی آپ کی بچی؟" فیصل کے دماغ میں وہ سارا منظر گھوم گیا جب دریا کنارے پینٹنگ کا سامان یونہی دھرا تھا اور لڑکی غائب تھی۔
"جی بس وہ بے پروائی ہے۔ چند دوست وہاں کار میں آئے، ان کے ساتھ پینٹنگ کی لوکیشن دیکھنے ذرا آگے تک نکل گئی تھی۔"
"اچھا، حیرت ہے، بنا ڈرائیور کو بتائے۔" فیصل استہزائیہ ہنسا تو جبار کی تو باقاعدہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ نورینہ ابھی تک لاپتا تھی اور وہ یہ کیا کہے جا رہا تھا۔ اس نے چند ہی باتوں میں فیصل صاحب سے اجازت لی اور اگلی کال ولید جان کو ملا دی۔
"خان جی! کچھ بنا میرے کام کا؟" جبار کی ڈھیلی سست آواز جیسے کسی کھائی سے نکل رہی تھی۔
ولید نے لب بھینچ کر کچھ دیر سوچا۔ انسپکٹر سلیم کے جاتے ہی اس نے نوازش سے رابطہ کیا تھا۔ لڑکی اس کے ڈیرے پر پہنچ چکی تھی اور ایک سامان سے بھرا ٹرک اسے وہاں سے نکالنے کے لیے روانہ بھی ہو گیا تھا۔ اب اگر وہ جبار سے یہ کہتا کہ اس کی بیٹی اس کے پاس آ گئی ہے تو وہ حواس باختہ ہو جاتا اور ولید اپنی ہی بنائی گیم کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وکیل تو سڑک پر ہونے والے اس حادثے سے بھی بے خبر لگ رہا تھا۔ اگر اسے وہ سب معلوم ہو جاتا تو اس کے مزید چیک ہونے کا اندیشہ بھی تھا۔
"ہاں ہاں۔ بالکل، اسی کام میں لگا ہوں وکیل صاحب! لڑکی چاچا کے پاس ہی ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔"
"اچھا...... کیسے...... کب پتا چلا۔ آ...... آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہ توقع کے عین مطابق پرجوش ہو گیا تھا۔
"بس آپ کو ہی کال کرنے والا تھا۔ آپ بالکل حوصلہ رکھو۔ بہت جلد آپ کی بیٹی آپ کے پاس ہو گی۔ بس پولیس کو بھنک نہ پڑے۔ ویسے پولیس سے ہے کوئی رابطہ؟"
"ہاں خان جی! ابھی کچھ دیر پہلے ہی کال آئی تھی۔ اسی بارے میں پوچھ رہے تھے۔"
"اوہ...... پھر کیا کہا آپ نے؟"
"میں نے تو کہہ دیا کہ لڑکی واپس گھر آ گئی ہے۔ اب پتا نہیں صحیح کیا یا غلط۔"
"کچھ نہیں ہوگا۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو ایسا کہہ دیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، آپ کی لڑکی چوبیس گھنٹوں میں آپ کے سامنے ہو گی، صحیح سلامت۔"
"جی خان! میں تو اللہ کے بعد بس آپ ہی کے بھروسے بیٹھا ہوا ہوں۔ بچی کی جان اور خیر وعافیت کا معاملہ ہے کہ ہاتھ پاؤں مکمل بندھ گئے ہیں۔"
"نہ فکر کرو وکیل صاحب! سب خیریت ہو گی۔ بس مجھے اپنی کوششیں تیز کرنے دیں۔ اگلی کال میں خود کرتا ہوں آپ کو۔"
"جی خان جی! بڑی مہربانی۔" جبار نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کال منقطع کر دی۔

☆☆☆

"خان جی! قہوہ۔" شیر دل نے گہری نظر سے ضمیر

urdunovels.com

جان کا چہرہ دیکھتے ہوئے ان کے موڈ کا پتا لگانا چاہا۔ گھنٹا بھر پہلے یہاں پولیس والے آئے تھے اور کچھ مبہم معنی خیز قسم کے جملوں کا تبادلہ کرتے واپس چلے گئے تھے۔ خان جی تب سے کسی گہری سوچ میں غلطاں تھے۔

"خان جی! کیا سوچ رہے ہیں؟"

"لڑکی کو ہمارے چنگل سے پولیس نے نہیں نکلوایا تو پھر یہ کس کا کام ہے؟"

"خان جی! اسی وکیل نے کسی سے مدد لی ہوگی۔"

"کس کی مدد لے سکتا ہے وہ حرام خور! کوئی کرائے کے غنڈے وغیرہ؟"

"خان جی! آپ نے اس کو بتایا تھا کہ لڑکی آپ کے پاس ہے؟" شیر دل کو خیال آیا۔

"نہیں۔ میں نے سوچا پہلے کچھ دن اسے بیٹی کے لیے تڑپنے دوں۔"

"تو خان جی! کیسے پتا لگائیں کہ لڑکی کہاں ہے؟ اگر ہم وکیل کو فون کریں تو تھوڑا معلوم نہیں ہو جائے گا؟"

"اوئے خر مغز!! اگلے کو صرف سننا ہی نہیں ہوتا، منہ سے کچھ نہ کچھ بولنا بھی پڑتا ہے۔"

"تو خان جی! دونوں باتیں دماغ میں رکھ کر کال ملا لیں۔ مطلب کہ یہ بھی سوچ رکھیں کہ شاید لڑکی اس تک پہنچ گئی ہے اور یہ بھی کہ شاید اسے کچھ پتا نہ ہو۔"

"ہوں...... یعنی وکیل کو کال ملانا ضروری ہے؟" ضمیر جان بھی جیسے سوچ میں پڑ گئے۔ ذہن میں بہت کچھ آ رہا تھا لیکن شیر دل کی بات بھی سوچ میں مبتلا کر رہی تھی۔ وکیل سے جاننا ضروری تھا کہ ادھر کیا حالات ہیں۔ اپنے آدمی تو سب کھلے تھے۔ دو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، باقیوں کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ لڑکی گئی تو گئی کہاں؟

"ہوں...... لاؤ فون۔" انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا اور گلا کھنکھار کر بھاری دل سے کال ملائی۔ ایک طرح سے اندھیرے میں تیر چلانا تھا۔ اللہ جانے کہاں جا لگنا تھا۔

"سلام خان جی!" جباری آواز کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی اور اس کی گھبراہٹ دیکھ کر ضمیر جان لمحے کو رکا۔

"پریشان لگ رہے ہو وکیل...... ہوں؟" ضمیر جان کا لہجہ پوچھنے کے بجائے کچھ طنزیہ ہو گیا۔ وکیل کچھ اور بھی گھبرا گیا۔

"خان جی! میری بچی کو کچھ مت کرنا۔ میں معافی چاہتا ہوں خان جی! میں نے آپ کی بات پر کان نہیں دھرے۔ خان! میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ بس میری بیٹی کو کچھ نہ ہو۔" وکیل تو جو منہ میں آیا، بولتا چلا گیا۔ ضمیر جان کے ذہن میں کچھ بے چینی نے کروٹ لی کہ نہ جانے لڑکی اس وقت کیسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ وکیل کی حد تک ایک اطمینان سا پیدا ہوتا بھی محسوس کیا تھا۔

"کہا تھا وکیل...... غلط راہ مت چنو۔ تمہارا اپنا انتخاب ہے یہ۔"

"خان! اللہ کی قسم، زندگی بھر کا سبق مل گیا۔ خان! میری بچی مجھے واپس کر دیں۔"

"تو...... بدلے میں کیا کر سکتے ہو؟" ضمیر جان نے سوچا، وکیل کی سائیڈ کو پوری طرح چھان پھٹک لیں۔ اگلے مرحلے کی بعد میں دیکھی جائے گی۔

"خان جی! اگر آپ قتلوں کی واپسی کا کیس دوبارہ دائر کریں تو میں بیچ میں کہیں مداخلت نہیں کروں گا۔ آپ کے آڑے نہیں آؤں گا۔"

"ہوں...... وعدے پر قائم رہنا، بچی واپس مل جائے گی۔" انہوں نے آدمی ادھوری تسلی کرواتے ہوئے کال بند کر دی اور شیر دل کو سارا معاملہ کہہ سنایا۔

"خان جی! وکیل کو تو کچھ پتا ہی نہیں ہے۔"

"اب اٹھو اور آج کے آج پتا کر کے دو، لڑکی کون لے گیا۔ بندے زیادہ کرو، لڑکی ابھی تک اپنے باپ کے پاس نہیں پہنچی تو مطلب یہیں کہیں ہے۔"

"جی خان جی!" شیر دل خان کا موڈ دیکھ کر جلدی سے ٹوپی سیدھی کرتا بھاگ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

نورمینہ کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ کوئی نشہ تھا جو دھیرے دھیرے ٹوٹ رہا تھا لیکن نہ جانے پوری دنیا اس بری طرح ہل کیوں رہی تھی۔ وہ جاگتی سوتی کیفیت سے مزید کچھ باہر نکلی تو ادراک ہوا کہ وہ کسی سواری میں ہے۔ حالانکہ آنکھیں کھولنے پر تو بس اندھیرا ہی دکھائی دیا تھا۔ کچھ آٹھ دس منٹ مزید یہ حالت رہی اور وہ سواری یکلخت رک گئی۔ باہر آدمیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پہلے ہلکی سی روشنی ہوئی اور پھر آسمان دکھائی دیا۔ وہ ایک ٹرک میں لیٹی تھی۔ اوپر سے ایک بڑی ترپال ہٹائی گئی تھی۔ دو آدمی اوپر چڑھے اور اسے بازوؤں سے کھینچ کر اٹھایا۔ وہ جلدی سے اپنا برقع سنبھال کر اٹھی۔ سر بری طرح چکرایا جسے بمشکل سنبھالتے وہ نیچے اتری۔

اسے حیرت ہوئی کہ وہ ایک خوبصورت شاہانہ بلڈنگ میں تھی۔ مزید حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ شام ہونے والی تھی۔

urdunovels.com

اس کا مطلب وہ کئی گھنٹوں سے بے ہوش تھی۔ نورینہ نے باوجود اندھیرے کے، سمجھنے کی پوری کوشش کی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ گھر سے بہت دور کسی اور شہر میں ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر ایک کمرے میں بند کردی گئی۔ وہ بے یقینی سے دروازہ بند ہونے کی آواز سن رہی تھی۔ کسی نے اس کے ہاتھوں کو باندھا نہیں تھا۔ وہ اس خوبصورت کمرے میں بالکل آزاد تھی۔ اس نے حیرت سے کمرے کو دیکھا۔ ایک دم فرنشڈ، صاف ستھرا۔ پلنگ بھی رکھا تھا، کرسیاں، میز، قالین، تصاویر وغیرہ سے مزین دیواریں۔ وہ تھک کر نرم بستر پر بیٹھی تو کمرے کے اکڑاؤ میں پہلی مرتبہ ایک سکون آور نرمی اترتی محسوس کی۔

قریب پندرہ بیس منٹ بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ایک آدمی نے کھانے کی ٹرے سامنے رکھی اور اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ ایسا صاف ستھرا گھر کا ماحول، سلیقے سے سجی، مزیدار خوشبو میں بسی کھانے کی ٹرے۔ نورینہ کا ہاتھ رک نہ سکا۔ تازہ پکا قورما، گرم روٹی، حتیٰ کہ سلاد اور رائتہ بھی تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ بھول گئی کہ وہ اغوا شدہ ہے۔ اس نے رغبت سے کھانا کھایا اور پانی پی کر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔

بھرے پیٹ سوچیں بھی بڑی ریلیکس سی آنے لگتی ہیں۔ کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل اور کئی ایک استعمال کی اشیا بھی رکھی تھیں۔ انہی میں ایک ہیئر برش دیکھ کر نورینہ نے بے ساختہ اپنے بالوں کو چھوا۔ الجھے ہوئے بال جو اس نے کئی بار بنا کنگھی کیے بس ہاتھوں سے سمیٹ لیے تھے، اس وقت بہت کوفت کا باعث تھے۔ اس نے ایک نظر دروازے کی طرف دیکھا، اٹھ کر نزدیک آئی اور اندر سے کنڈی لگا کر اپنا پنک اسکارف گلے سے نکال کر پلنگ پر رکھا۔ برقع وہ پہلے ہی خود سے الگ کر چکی تھی۔ وہ اس وقت پنک رنگ کے ہی کپڑوں میں تھی۔ دامن کی شکنیں ہاتھ سے سیدھی کرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آئی اور اپنے لمبے بالوں کو پورا کھول دیا۔ برش اٹھا کر نرمی سے بال سلجھائے۔ ایک لمبی چٹیا گوندھ کر پیچھے کمر پر چھوڑی اور کچھ خیال آنے پر کمرے کی دیواروں کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ داہنے ہاتھ والے پردے کے پیچھے واش روم تھا۔ یہ خیال بھی بڑا خوش کن تھا۔ وہاں سے وہ صابن سے منہ دھو کر نکلی تو اپنا آپ بڑی دیر بعد فریش محسوس ہوا۔ اسے تو ایک عدد کپڑوں کی جوڑی اور نہانے کی بھی شدید طلب ہو رہی تھی لیکن یہ خواہش اندر دبا لینا پڑی اور اب وہ پرسکون انداز میں لیٹ گئی۔ کنڈی چونکہ اندر سے لگا چکی تھی، اس لیے بنا اسکارف وغیرہ کے ہی بیڈ پر لیٹ کر باہیں پھیلا دیں۔ گدے کی نرمی کو وہ اپنے پورے وجود پر محسوس کر کے سکون لینا چاہتی تھی...... لیکن اس لمحے نورینہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی باہیں پھیلانے کی بچگانہ حرکت پر کوئی بے ساختہ ہنس دیا تھا۔ کمرے کی خوبصورتی اور صفائی ستھرائی سے خوش دکھائی دیتی وہ لڑکی قطعی طور پر بے خبر تھی کہ کمرے میں کوئی کیمرا بھی لگا تھا جس کی آنکھ سے اس کی تمام حرکتوں کو بغور دیکھا جا رہا تھا۔

ولید اس وقت اپنے بیڈ روم میں موجود تھا۔ گیسٹ روم کی ویڈیو سامنے بڑی اسکرین پر چل رہی تھی۔ کمرے میں چلتی پھرتی نورینہ پر پچھلے پندرہ بیس منٹ سے لگاتار نظر رکھے اب وہ اس منظر سے اکتانے کے بجائے اس کا عادی سا ہونے لگا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اپنی نگاہ کہیں اور مبذول نہ کر پا رہا تھا۔ پنک کپڑوں والی وہ حسین و معصوم سی لڑکی اس خرانٹ اور واہیات وکیل کی بیٹی تھی، یقین کرنا مشکل تھا۔

ولید نے جس وقت لڑکی کو کمرے میں داخل ہوتے ہی برقع اتارنے پر دھیان سے دیکھا، سوچیں کسی اور نہج پر سفر کرنے لگی تھیں۔ پہلا خوش کن خیال یہ تھا کہ جبار اور ضمیر چچا میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ نورینہ اس وقت اس کے پاس ہے۔ حتیٰ کہ پولیس کو بھی اس پر کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ اگرچہ دیکھ لینے سے قبل اسے یہاں تک لانے کا مقصد اس وکیل سے معاملات کو اپنے حق میں کروانا تھا۔ اس سے گارنٹی لینا تھی کہ وہ قلعے اس کے ہاتھ سے جانے نہیں دے گا، لیکن سامنے گھومتی پھرتی یہ لڑکی سب سوچا سمجھا بھلانے کے درپے ہو رہی تھی۔

یہ سوچ اس سے سوا تھی کہ اس وقت وہ لڑکی مکمل اس کے اختیار میں تھی۔ فارم ہاؤس کے کوریڈور کا آخری دروازہ جو اس کی حویلی کے اس بیڈ روم سے بمشکل پانچ منٹ کی دوری پر تھا، وہ اگر کار پر حویلی سے نکلتا تو پانچ ہی منٹ میں اپنے فارم ہاؤس پہنچ سکتا تھا۔ اس نے اپنے باغی ہوتے خیالات کو بڑی دقت سے دھکیلتے اسکرین آف کی اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ یہ سب سوچنا جتنا آسان تھا، کرنا شاید بہت ہی مشکل۔

اس نے تکیہ سر کے پیچھے دبایا اور زبردستی سونے کی کوشش کی۔ باغی دل اس وقت جس راستے پر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا، مصلحت کا تقاضا تھا کہ ان سوچوں کو خود سے پرے دھکیل دیا جائے...... لیکن نہ جانے کب تک؟

معاشرتی برائیوں کے خلاف برسرپیکار نوجوان کی داستان آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے